تخریب و تعمیر

نعیم صدیقی

تخریب و تعمیر

نعیم صدیقی

مکتبہ چراغ راہ کراچی ۱

NPC. Permit No. 126—Text
dated 24/7/53—1500 Copies

قیمت:- تین روپے

مکتبہ چراغ راہ کراچی ۱

غلام محمد چوہدری نے مشہور آفسٹ پریس سے چھپوا کر مکتبہ چراغ راہ کراچی ۱ سے شائع کی

نظم و ترتیب

فسادِ ماحول

شیطان کی بڑی کامیابی یہ نہیں ہوتی کہ دو چار افراد کے افکار و اعمال میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔ اس کی بڑی کامیابی یہ ہوتی ہے کہ کسی معاشرہ کے اجتماعی ماحول کو فاسد بنا دے۔ اس کام پر شیاطین کو بڑی لمبی اور صبر آزما محنت کرنی پڑتی ہے، لیکن جب یہ کام ہو جاتا ہے تو پھر ابلیس کے سپاہی چین سے بیٹھ کر اپنے کارناموں کو برگ و بار لاتے دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ کسی ریاست اور قوم میں جب ایک مرتبہ معصیت کی نخل بندی اچھی طرح ہو جاتی ہے تو پھر پودے خود ہی بیج بکھیرتے رہتے ہیں، بیج خود ہی زمین میں جگہ پکڑتے ہیں، بیجوں سے خود ہی نئے پودے پھوٹتے ہیں اور نئے پودے پھر خود ہی گل کھلاتے رہتے ہیں۔ یہ کھیتی جب اس طرح سدا بہار ہو جاتی ہے تو اسے کسی مالی کی ضرورت نہیں رہتی۔ پھر اگر اس طرح کا فاسد ماحول قوم گیر اور ملک گیر ہونے سے بھی آگے بڑھ کر عالمگیر

بن جائے اور ایک دور تہذیب کی وسعت اپنے اندر پیدا کرلے تو اس کے بنی نوع قرنوں تک کے لئے شیاطین کو چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ پاؤں ... کر سوئیں۔ آج ہمیں بھی بالکل اسی درجے کے فاسد ماحول سے سابقہ درپیش ہے۔

اس ماحول میں رہتے ہوئے آپ رزقِ حرام سے کتنی ہی گہری نفرت رکھتے ہوں لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ معیشت کی رگ رگ میں "سود کی لعنت"، "رشوت کی پیپ اور خیانت آمیز نفع اندوزیوں کا زہر" خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔ ہر وہ سکہ جو یہاں دست گرداں ہے معاشی ظلم کی بھٹیوں میں کتنی ہی بار تپ کر اور گندے اخلاق میں کتنے بجھاؤ کھا کر آپ تک پہنچتا ہے۔ یہاں بازار میں جاکر آپ اگر ایک پنسل بھی خریدتے ہیں تو اس مظلوم کی قیمت پر نجانے اخلاقی مفاسد کے کتنے غیر محسوس بوجھ لدے ہوتے ہیں۔ اس ماحول میں جو لوگ فی الواقع "حلالِ طیب" کی جستجو کرتے ہیں ان کو فاقہ کے سوا کچھ نہیں ملتا لیکن جو لوگ اپنے معدے کے دروازے "ھذا من فضلِ ربی" کہہ کر حرام کے لئے کھول دیں اُن پر رزق کی وہ بارش ہوتی ہے کہ وہ جی کھول کر اسراف کر سکیں۔

آپ اپنا جائز سے جائز حق حاصل کرنے کے لئے کسی طرف رُخ کریں تو یہ ماحول آپ سے ہر قدم پر اپنی روحِ فسق کے لئے نذرانہ طلب کرے گا۔ آپ کسی ضرورت کو پورا کرنا چاہیں اس تک پہنچنے کے لئے آپ کو عین ان طاقتوں کا دامن تھامنا پڑے گا کہ جن پر اپنے خطبوں اور اپنے فتووں میں نہ جانے کن کن سخت الفاظ سے آپ اظہارِ رائے کرتے ہیں۔ آپ کتنے ہی پاکیزہ مقصد کے لئے گھر سے نکلیں لیکن یہ ماحول اس تک پہنچنے کے لئے آپ کو ایسے لیٹے کوچہ ہائے رقیباں سے سر کے بل گذرنے پر مجبور کرے گا کہ آپ اپنی بے بسی کا ماتم

کرتے رہ جائیں۔

فاسد ماحول میں کسی مرد کی حیاداری اور کسی خاتون کی عصمت پسندی کو ساری عمر جو لمبی لڑائی لڑنی پڑتی ہے بے حیائی ہر سمت سے نئے نئے اسلحہ کے ساتھ حملہ آور ہوتی ہے اور بار بار حملہ آور ہوتی ہے، وہ بناؤ سنگار کرکے نکلتی ہے، وہ نمائش اور مظاہرے کی اسپرٹ کے ساتھ آگے بڑھتی ہے، وہ شعر کا لباس پہنتی ہے، وہ افسانے کا بہروپ بھرتی ہے، وہ صحافت اور ادب کے ایوان میں مسند آرا ہوتی ہے، وہ اشتہاروں میں نمایاں ہوتی ہے، وہ تصویر کا کاغذی پیرہن زیب بدن کرتی ہے، وہ رقص گاہوں میں ناچتی ہے، وہ مینا بازار لگاتی ہے، وہ کیمروں کے سامنے پریڈیں کرتی ہے، وہ ضیافتوں اور دعوتوں اور تقریبوں میں پیش پیش رہتی ہے، وہ سینماؤں میں ہنگامے مچاتی ہے اور وہ ریڈیو سے طوفانِ صوت بن کر بہتی ہے۔

اس کے مقابلے میں آپ اپنی فطرت کی پاکیزگی کے زور پر "غضِ بصر" کرتے ہیں لیکن بے حیائی خود آگے بڑھ کر آپ کی آنکھوں میں گھستی ہے، آپ اس کے لئے گوش بر آواز نہیں ہوتے لیکن وہ خود اپنا پیغام آپ کے کانوں میں ڈالتی ہے، آپ کو اس کی بو سے نفرت ہے لیکن وہ عطر کی لپٹوں میں تحلیل ہوکر آپ کے مشام پر حملہ کرتی ہے۔

یہ فاسد ماحول کا جادو ہے کہ حیا والوں اور عصمت پسندوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ان کو کور ذوق شمار کیا جاتا ہے، لیکن بے حیائی اور بے عصمتی ترقی پسندی اور تہذیب اور کلچر کی علامت قرار دی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ماحول عصمت وحیا کو پیچھے

دھکیلتا ہے اور بے عصمتی و بے حیائی کو اگلی صفوں میں جگہ دیتا ہے۔ ایسے حالات میں کون حساب لگا سکتا ہے کہ کتنی ہی سعید روحیں ہیں کہ جو بے حیائی کے اس طوفان کے ریلوں سے لڑتے لڑتے آخرکار دم توڑ دیتی ہیں۔ اور کون اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ کتنے افراد کی عصمت پسندی کے مظاہرے کے پس پردہ ان کے تحت شعور میں ماحول کے فاسد اثرات گھس کر ڈیرے ڈال چکے ہیں اور وہ برابر ان کی سیرتوں کو دیمک بن کر چاٹ رہے ہیں۔

پھر آپ کچھ اور پہلوؤں سے ماحول کا جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ یہاں ایمانوں ضمیروں، سیرتوں اور اصولوں کی ایک منڈی لگی ہوئی ہے اور دنیا و دین کی ہر متاع عزیز نیلام کا مال بنی اس میں دھری ہے۔ اس منڈی میں گھوم کر چاہے آپ سیاست کے بازار کو دیکھیں، چاہے ادب و صحافت کے بازار کو اور چاہے مذہب و تصوف کے بازار کو، ہر جگہ ایک ہی سماں ہے۔ انسانیت کے پاس جو کچھ ہے وہ بکاؤ مال بن چکا ہے۔ بکنے کو سب کچھ بک رہا ہے، لیکن چھوٹے ظرف کے تاجر ارزاں فروش ہیں اور ذرا بڑے سرمائے کے تاجر بھاری قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ انسانیت کے اچھے سے اچھے پیکروں کا آپ سودا چکتا دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی چند سکوں میں، کوئی ایک تنخواہ کے عوض، کوئی کسی عہدہ و منصب کے بدلے میں، کوئی یوروپ کی سیاحت کی قیمت پر، کوئی لیڈری کے مول، کوئی کسی انجمن کی صدارت پر اور کوئی محض زندہ باد کے نعروں کے داموں اٹھ رہا ہے۔ آپ اگر صاحبِ احساس ہوں تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے چاروں طرف سے آپ کو سکے کھنکھناتے ہوئے کچھ تاجر گھیرے ہوئے ہیں اور وہ برابر اس کوشش میں ہیں

کہ کب آپ مالِ تجارت بننے پر راضی ہوں اور کب وہ اس سودے سے نفع کمانے کے قابل ہوں۔ انسانیت کے اس زوال کی فضا میں با اصول مسلمان بن کر زندگی گزارنا کھیل نہیں ہے۔ یہاں ایک صاحب ایمان ہمہ وقت جیب کتروں کے درمیان گھرا ہوا ہے، ذرا غفلت ہوئی نہیں کہ جیب کٹی نہیں!

فاسد ماحول کا ایک لازمہ یہ ہے کہ اس میں نظامِ حیات کی باگ "ڈور فسق" کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ سوسائٹی اپنے اندر سے انتہائی پست کردار اور اخلاق باختہ مگر ذہین اور چیار لوگوں کو ابھار کے اوپر لاتی ہے اور اپنے اندر کے شرفا کو زیادہ سے زیادہ پست اور بے بس کر کے رکھتی ہے۔ اس صورتِ حالات کو نبی صلعم نے اپنے بعض فرمودات معلمہ میں پوری طرح واضح فرما دیا ہے۔

یہ لوگ فاسد ماحول کے بہترین نگہبان اور اسے ہر خطرے سے بچانے کے لئے بہترین محافظ ہوتے ہیں۔ یہ اوپر بیٹھ کر ملک کی معاشی پالیسی بناتے ہیں، یہ عوام کی ذہنیت کو ایک خاص شکل دینے کے لئے تربیت کے مختلف وسائل اختیار کرتے ہیں، یہ نئی نسل کو ایک خاص نقشے پر اٹھانے کے لئے نظامِ تعلیم بناتے ہیں، یہاں تک کہ فاسد ماحول کے بنیادی اصول و نظریات کا ایک قفس قوم کی قوم کے گرد تیار ہو جاتا ہے جس پر قانون کے کڑے پہرے قائم ہوتے ہیں اور اس کی حدود سے نہ کوئی مسجد باہر رہ جاتی ہے، نہ مدرسہ و خانقاہ!

ایسی حالت میں ایک صحت مند معاشرے کے بالکل برعکس "معروف" سے روکنے اور "منکر" کو فروغ دینے کا پورا پورا اہتمام ہوتا ہے۔ قوم کا روپیہ، اس کے وسائل، اس کے

دماغ اور اس کی صلاحیتیں بہت بڑے پیمانے پر اس مہم میں لگ جاتی ہیں۔ اس طرح جب ایک ہمہ گیر فساد کام کر رہا ہو تو اس میں اچھے اچھے صالحین کا ذوق اصلاح پسندی بے بس ہو کے رہ جاتا ہے۔ منکر کے ایک ہنگامہ خیز نقار خانے میں "معروف" بچارا طوطی بن کر چہچہاتا ہے لیکن اس کی آواز منکر کے شور و شر میں ڈوب کر رہ جاتی ہے۔

فاسد ماحول میں ظلم، خیانت، بداخلاقی، بے شرمی، بے اصولی، نفع پرستی، بندگی اغراض، کرزور آزادی، لوٹ مار اور دوسری بد اخلاقیوں سے دن رات لوگ زخم کھاتے ہیں اور کراہتے ہیں، لیکن مظلومی کے نت نئے نمونوں کو کثرت سے دیکھتے دیکھتے اچھی فطرت کے لوگوں میں بھی ہمدردی کی حس سُن ہونے لگتی ہے۔ یہ چیزیں معمولات بن جانے کی وجہ سے اپنی اپیل کی طاقت کھو بیٹھتی ہیں۔

پھر مشکل یہ کہ ظلم ہوتا ہے لیکن ظلم کرنے والا ہاتھ نظر نہیں آتا جیبیں کاٹی جاتی ہیں مگر جیب کترے مشخص نہیں ہوتے، چوری عام ہوتی ہے لیکن چور کا کوئی سراغ نہیں ملتا، خون چوسا جاتا ہے مگر جونکیں ہاتھ نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ سارا کھیل کسی ایک یا چند افراد کا کھیل نہیں ہوتا، یہ اجتماعی نظام کی تاخت ہوتی ہے جس میں خطائیں ہوتی ہیں لیکن "خطاوار" کا پتہ نہیں چلتا!

ایسا ماحول ہمہ وقت کی ایک آزمائش ہوتا ہے اور ایسی آزمائش ہوتا ہے کہ جس میں کوئی ایک قدم چل کر اور کوئی چار قدم چل کر ہمت ہار دیتا ہے، شاذ ہی کوئی سعید روح ساری عمر اس کٹھالی میں پڑ کر صحیح سلامت نکلتی ہے۔ یہ ذہنیت اور سیرت کا ایک

ایسا آہنی سانچہ بن کر افراد کو گھیر لیتا ہے کہ جو اس کی شکل اختیار نہ کرے اس کو چاروں طرف سے چوٹیں کھانی پڑتی ہیں۔

فاسد ماحول کے ہوتے ہوئے تقدس و تقویٰ کے کمال کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فرد انسانی نظامِ تمدن میں رہتے ہوئے اتنی وابستگیاں رکھتا ہے کہ اجتماعی نظام کی تطہیر کے بغیر اور فاسد ماحول کو توڑے بغیر اس کے تزکیہ کی تکمیل محال ہے۔ ایک آدمی چاہے یا نہ چاہے، وہ بہرحال کسی خاندان کا رکن، کسی منڈی کا تاجر، کسی کارخانے کا مزدور یا کسی ادارے کا ملازم، کسی بستی کا باشندہ، کسی مذہب و ملت کا پیرو، کسی انجمن یا جماعت کا ممبر، کسی حکومت کی رعایا اور کسی ریاست کا شہری ہوتا ہے۔ یہ مختلف تنظیمیں اور ادارے جس نظامِ اجتماعی کے تابع ہوتے ہیں اگر وہ اپنی فطرت میں ناپاک ہو تو یہ بات ناقابلِ تصور ہے کہ پاکبازی کی ہزار مساعی کے باوجود ایک فرد اپنے آپ کو پوری طرح تو کیا، بڑی حد تک بھی پاک رکھ سکے۔ رات دن ان مختلف روابط کے ذریعے ناپاکی کے ریلے آ آ کر اس سے ٹکراتے ہیں، وہ جدھر جاتا ہے منکرات کی کیچڑ سے لت پت ہوتا ہے۔ وہ جس فضا میں سانس لیتا ہے گندی ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے، وہ جس سے ملتا ہے اس سے کسی نہ کسی طرح کی اخلاقی چھوت لگتی ہے، یہاں تک کہ وہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے اپنے گھر کی پناہ گاہ میں اس کی اپنی بیوی اور اس کے اپنے بچے اور اس کے اپنے باپ اور بھائی کہاں کہاں سے کن کن مفاسد کے جراثیم ساتھ لے آتے ہیں۔

جہاں چاروں طرف کوڑے اور گو براور ریید کے ڈھیر پھیلے ہوئے ہوں، جہاں ہر طرف لاشے سڑ رہے ہوں، جہاں گلیاں بیت الخلاء بنی ہوئی ہوں، جہاں سڑکوں پر اگندگی پھیلی

ہوئی ہو، جہاں گڑھوں میں پانی جمع ہو ہو کر سڑتا رہے اور جہاں راج پاٹ سارا غلاظت پسندوں کے ہاتھ میں ہو وہاں ایک نفاست پسند آدمی صابن مل مل کر نہائے، دن میں دس مرتبہ مسواک اور کلیاں کرے، روزانہ ناخن تراشے، صبح شام بال آراستہ کرے اور اپنے کپڑے ہر دوسرے روز بدلتا رہے تو بھی غلاظت کے ماحول میں رہ کر کبھی بھی اپنے پاکیزہ ذوق کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ وہ جو آٹا اور سبزی خرید کر لاتا ہے۔ اس میں گندگی مل کر آتی ہے، وہ جس کنوئیں سے پانی لیتا ہے اس میں گندگی شامل ہے، وہ جن سڑکوں پر چلتا ہے وہ اس پر کیچڑ اچھالا کرتی ہیں، وہ جس فضا میں ہوا خوری کرتا ہے اس سے بھی اسے گرد اور بدبو کے سوا کچھ نہیں ملتا، وہ جس قہوہ خانے میں بیٹھ کر چائے پیتا ہے وہاں بھی ناپاکی سے اس کی تواضع کی جاتی ہے اور وہ جس کسی سے مصافحہ کرتا ہے اس کے ہاتھ بھی اپنے میل میں سے اسے حصہ دیتے ہیں!

یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ قطعی طور پر ایک حالتِ اضطرار ہے۔ اور ایک فرد مومن اس طرح کے فاسد ماحول میں اللہ کے نزدیک اپنی استطاعت کی حد تک ذمہ دار ہے۔ اس نے اگر اپنی بساط بھر پاکیزگیٔ اخلاق پیدا کرنے کی سعی کر لی تو وہ اللہ کے سامنے ایک متقی ہی کی حیثیت سے پیش ہوگا۔ لیکن یہ چیز قابلِ غور ہے کہ اس کی استطاعت کے مطابق فی الواقع خدا کے دین کا مطالبہ اس سے کیا ہے؟

ایسے فاسد ماحول میں گھرے ہوئے مومن سے اس کا ایمان دو مطالبے کرتا ہے:

ایک یہ کہ وہ ماحول کے اثرات اور گندگیوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اور اپنے اندر زیادہ سے زیادہ پاکیزگیٔ اخلاق اور طہارتِ نفس پیدا کرنے کے

لیے عملاً جو کچھ کر سکتا ہے اس کو آخری حد تک کرے۔

دوسرے یہ کہ فاسد ماحول کا تسلط ختم کرنے اور اس کی جگہ ایک صالح ماحول کو برپا کرنے کے لئے جد و جہد اور سرگرمی کا حق جتنا وہ ادا کر سکتا ہو اسے پوری عزیمت سے ادا کرے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ کسی فاسد ماحول میں ایمان، تقویٰ اور احسان کی راہ صرف یہی ہے۔

انبیاء علیہم السلام نے سارا کام انہی دو خطوط پر کیا ہے۔ خود نبی صلعم کی آخری روشن مثال کو اگر سامنے رکھیے تو حقیقت کو سمجھنے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ آنحضور اگر "انفرادی تزکیہ" کا کوئی پروگرام لے کے آئے ہوتے تو قریش سے خواہ مخواہ کی ٹکر لینے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جس طرح آج بے شمار مصلحین اور دیندار اور معلمین اخلاق ایسے موجود ہیں کہ چپکے سے کنارے بیٹھ کر اپنا کام کر رہے ہیں اسی طرح آنحضور بھی تعلیم و اصلاح کا ٹھنڈا ٹھنڈا کام کر سکتے تھے۔ کوئی ان سے الجھتا بھی تو اس سے بہ حکمت اپنا دامن بچا لیتے۔ لیکن فی الواقع وہاں پروگرام کی یہ نوعیت تھی ہی نہیں۔ وہاں تو اسلامی تقویٰ کے اصولوں پر ایک سوسائٹی، ایک ریاست اور ایک ماحول بنا کر وہ سانچہ فراہم کیا گیا کہ جو اپنے مزاج کے مطابق تقویٰ کے نمونے تیار کرے اور ان سے کام لے۔ نبی صلعم کا اسوۂ حسنہ ایک فرد تک محدود رہنے والا نہیں تھا، بلکہ اس اسوۂ حسنہ نے ایک نظامِ جماعت کی صورت اختیار کی اور پھر وہ فاسد ماحول سے کشمکش کر کے ایک صالح ماحول کی ہمہ گیر وسعتوں کے ساتھ سارے عرب پر چھا گیا۔ جب کہیں جا کر یہ

اعلان ہوا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ!

مسلمانوں میں طہارت وتقویٰ اور تزکیہ کے لئے جو ادارہ کئی صدیوں سے پیش پیش ہے وہ تصوف کا ادارہ ہے۔ اس کا ایک مستقل علم کلام ہے اور فنِ تزکیہ کی ایک مستقل ٹیکنیک ہے۔ اس کی مختلف شاخیں ہر ملک میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس کا اپنا لٹریچر بھی بہت وسیع ہے۔ اس ادارے نے اپنے طرز پر افراد سازی کا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے لیکن افسوس کہ تصوف کا عجمی ادارہ ایسے ہاتھوں سے تاسیس پذیر ہوا ہے جو فاسد ماحول کے سامنے ہتھیار ڈال کے ایک مرتبہ پسپا ہوئے تھے اور پھر وہ جہاد بالنفس میں ایسے محو ہوئے کہ انہیں اجتماعی فساد کے خلاف معرکہ آرائی کی ذمہ واریاں بھولے سے بھی کبھی یاد نہ آئیں۔

اس تصوف کے تیار کردہ بہترین افراد کو اگر آپ قریب سے دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ انفرادی تزکیہ کے آگے کی کوئی منزل سرے سے سامنے نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کے روبرو اجتماعی مفاسد کے نت نئے طوفان اٹھتے رہتے ہیں لیکن ان کے خلاف ان میں کوئی سرگرمی پیدا نہیں ہوتی۔ سرگرمی کیسے پیدا ہو جب کہ یہ تصور ہی گم ہو چکا ہے کہ اجتماعی مفاسد سے ٹکرانے کی ذمہ داری بھی کوئی دینی تقاضا ہے اور اسی پر افراد کے تزکیہ کا دارومدار ہے۔

ہماری خانقاہیں اور ہمارے تزکیے کے ادارے ایک سال میں جتنے افراد کو تیار کرتے ہیں اگر وہ فاسد ماحول سے کشمکش کرنے کے فرض کا احساس رکھنے والے ہوتے اور منظم جدوجہد کرنے کے اسلامی اصول ان کے پیشِ نظر ہوتے تو ان کے ذریعے ایک

قیامت مچ گئی ہوتی مگر صحیح طرز فکر کے گم ہو جانے کی وجہ سے ہمارے اچھے اچھے متقی اٹھتے ہیں اور بڑے بھولے پن کے ساتھ اپنے فاسد ماحول کی بیش بہا خدمات انجام دے جاتے ہیں۔ فاسد ماحول تصوف کے ادارے سے اچھے سے اچھے اور سستے سے سستے کارکن حاصل کرلیتا ہے اور اس کی مشین میں جتنا اچھا کام شریف اور ایماندار پرزے کر جاتے ہیں اتنا معمولی قسم کے پرزے نہیں کرسکتے۔

سالہا سال سے تقویٰ اور تزکیہ کا انفرادی تصور لے کر کام کرتے کرتے اور فاسد ماحول سے مصالحانہ رویہ رکھتے رکھتے ان اداروں کا حال یہ ہوگیا ہے کہ فاسد ماحول کو صالح ماحول سے بدلنے کی سعی ان کی آنکھوں کے سامنے شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس سعی کو انہی کے ہاں سے سب سے کم سپاہی ملتے ہیں۔

اب اگر اکابرین تصوف اپنے فلسفہ کو خالص اسلامی ثابت کرنے بیٹھیں، وہ "تصور شیخ" کی بہتر سے بہتر تعبیر پیش کریں، وہ "مراقبہ و مکاشفہ" کا مفہوم پورے اطمینان بخش انداز میں بیان کریں، وہ "ہمہ اوست" اور "فنا فی الذات" کے اسرار کو زیادہ سے زیادہ عقلی رنگ دیں، وہ "فیض نظر" اور "توجہ" اور "ہمت" کی معقولیت پر کتنا ہی اچھا استدلال کریں، آخر اس خلا کو پُر کرنے کے لئے یہ چیزیں بیکار ہیں جو اجتماعی فساد کے خلاف جدوجہد ترک کر دینے سے پیدا ہو گیا ہے۔ تصوف نے اس خلا کو پر کرنے کے لئے انفرادی تزکیہ میں مسنون حد سے آگے بڑھ بڑھ کر مبالغے سے کام لیا ہے، لیکن افسوس کہ یہ مبالغہ اس خلاء کو کبھی پُر نہیں کر سکتا۔

تصوف کے کارنامے کو جب بھی کتاب و سنت کی کسوٹی پر رکھا جائے گا تو سب

سے اہم سوال یہی پیدا ہو گا کہ اس ادارے کے سند یافتہ متقی حضرات نے اجتماعی فساد کے مقابلے میں اب سے پہلے کیا کچھ کیا ہے اور اب وہ کیا کر رہے ہیں؟ اس کا اگر کوئی قابل اطمینان جواب نہ دیا جا سکے تو پھر یہ مسئلہ توجہ طلب ہے کہ تصوف کے بنیادی نظریے، اس کی فکر، اس کے علم کلام، اس کی تکنیک اور اس کے مزاج میں کہیں نہ کہیں کوئی بڑی بھاری غلطی موجود ہے۔ اس غلطی کی تلاش اور اس کا تعین کرنا ایک بڑی قابل قدر خدمت ہو گی۔

بخلاف اس کے اصلاح و تزکیہ کی سیدھی سادی راہ یہ ہے کہ ایک مومن و مسلم اگر فاسد ماحول میں گھرا ہوا ہو تو وہ ایک طرف امکانی حد تک اپنی ذات کو آلائشوں سے پاک کرے، فرائض و واجبات اور مستحبات کو اختیار کرے اور حرام اور مکروہ امور سے بچے، لیکن اپنی اس کوشش کی عملی تکمیل کے لئے دوسری طرف فاسد ماحول کے خلاف اپنے جان و مال اور اپنی ساری قوتوں اور صلاحیتوں سمیت اسلام کے سکھائے ہوئے اصولوں پر کشمکش کرے۔

یہ کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ہمارا قومی و ملکی ماحول بدل جائے، بلکہ ملکی و قومی ماحول کو آلودگیوں سے پاک رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے دور، تہذیب اور اپنے بین الاقوامی ماحول کو بدلنے کے لئے بہت بڑے پیمانے پر جدوجہد کی جائے۔
کمالِ تقویٰ و تزکیہ تک پہنچنے کی واحد راہ یہی ہے!

"معروفِ اعظم" یا "منکرِ اعظم"

اگر کوئی شخص کوئی ایسا درخت کسی بڑے چوراہے میں لگا دے جس کے کانٹے چاروں طرف بکھر بکھر کر مسافروں کے پاؤں کو چھلنی کریں، جس کا تلخ پھل انسان تو کیا حیوانات تک کے دانت کھٹے کر دے، اور جس کے پتوں کی بو ناگوار ہو، جس کے سائے سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے ——— تو ظاہر بات ہے کہ اس نے اس درخت کی کاشت کے لئے زمین تیار کرنے کے لئے کدال کی جتنی ضربیں لگائی ہوں گی اور اس کی آبیاری کے لئے پانی کے جتنے قطرے اس نے صرف کئے ہوں گے اور اس کی رکھوالی کے لئے باڑ لگانے میں اس نے وقت کا جو لمحہ بھی صرف کیا ہو گا، وہ اس کے لئے لعنت ملامت کا ایک خزانہ بھرنے کے سوا اور کوئی نتیجہ نہ دکھائے گا۔ اور اس درخت کے کسی کانٹے کی نوک سے جو انسانی یا حیوانی پاؤں زخمی ہو گا، اور اس کے پھل کو کھا کر جو ذی حیات بھی

تلخ کام ہوگا اور اس کی بُو سے جو دماغ بھی پریشان ہوگا: اس کا حساب اس درخت کے نصب کرنے والے کے نامۂ اعمال میں اس وقت تک جمع ہوتا رہے گا جب تک کہ اس درخت کا وجود قائم ہے۔ یہ ایک شرِ جاری ہے، یہ ایک چشمۂ ظلم ہے، یہ ایک منبع فتن ہے، یہ ایک مرکزِ معصیت ہے ——— یا یہ ایک ام الفساد ہے جس کے پیٹ سے بدی کے سانپ اور بچھو پیدا ہوتے رہیں گے، پھیلتے رہیں گے اور انسانیت کو عذاب دیتے رہیں گے۔

بعینہٖ اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی جو رامبے پر کوئی مفید اور صالح فطرت کا درخت نصب کیا ہو، مثلاً میٹھے آموں کا ایک درخت ہو ——— جس کے سائے میں انسان اور حیوان پناہ لیں، جس پر پرندے آشیانے بنائیں، جس کے پھل سے بھوکوں کے پیٹ بھر سکیں، اور جس کے بور کی خوشبو دماغوں کو فرحت دے اور جس کا حسین منظر نگاہوں کو لبھانے والا ہو، وہ ایک خیرِ جاری، ایک سرچشمۂ احسان، ایک منبعِ خدمت اور ایک مرکزِ نکوئی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس "ام الخیر" کے بطن سے فلاح جنم لے گی، تسکین وجود پائے گی، آرام و راحت کو نشو ونما ملے گی، اور جب تک اس درخت کا وجود قائم ہے انسانیت اس سے متمتع ہوگی اور اس کے نصب کرنے والے کے لئے احسان مندی اور دعائے خیر کا خزانہ جمع کرتی رہے گی، اس کے ایک ایک پتے کے سائے سے اور اس کے پھل کے ایک ایک دانے کے رس سے، کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی بھلائی پھیلے گی، اور اس بھلائی کی کتنی جزا اس کا بیج بونے والے کے نامۂ اعمال میں درج ہوگی۔ اس نے اس درخت کو نصب کرنے کے لئے زمین پر کدال کی جتنی ضربیں لگائی ہوں گی اور اس کی آبیاری کے لئے اس نے پانی کی جتنی مقدار صرف کی ہوگی اور اس کی حفاظت

کے لئے جتنی توجہ سے کام لیا ہو گا۔ اس کا یہ سارا سرمایۂ خدمت جب کاروبارِ خیر کے کئی چکر کھاتا ہوا لوٹ کر اسے آخرت میں ملے گا تو کوئی نہیں جانتا کہ اس پر کتنے سو یا کتنے ہزار گنا منافع لگ چکا ہو گا۔

بالکل اسی طرح اگر کسی شہر کے صالحین اپنی قوتیں باہم جمع کر کے، مال اکٹھا کر کے، محنت اور وقت سمیٹ کر ایک مسجد، مکتب یا دارالعلاج یا کاروان سرائے کا قیام عمل میں لاتے ہیں۔ تو اس قسم کے کسی ادارۂ خیر کا قیام بالکل ایک سایہ اور پھل دینے والے مفید درخت کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کا پیمانۂ اثر درخت سے وسیع تر ہے، چنانچہ اس ادارہ سے حال میں اور مستقبل میں نوعِ انسانی کے جتنے افراد کوئی استفادہ کریں گے اس کی جزا اس ادارۂ خیر کے معماروں کے کھاتے میں جمع ہوتی رہے گی، اور انہوں نے جو سرمایۂ ایثار صرف کیا ہو گا اس پر مدت ہائے مدید تک منافع جمع ہوتا رہے گا، اور پھر اس "اصل مع منافع" کی یکمشت ادائیگی انہیں عدالتِ آخرت میں کر دی جائے گی۔ ایسے کسی ادارے کی تعمیر میں جس ہاتھ نے ایک اینٹ بھی رکھی ہو گی اور جس جیب سے ایک دمڑی بھی سچے جذبے کے ساتھ نکلی ہو گی، اور جس شخص نے اس کے قیام کے لئے پسینے کے چند قطرے بھی بہائے ہوں گے، نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے حقیر سے سرمایۂ خدمت پر بھی مجموعی منافع کتنا جمع ہو جائے گا۔

برعکس اس کے اگر کسی بستی کے لوگ یا کسی شہر کی کوئی سوسائٹی مل جل کر ایک چانڈو خانہ، ایک ادارۂ موسیقی، ایک شراب خانہ، ایک رقص گھر، ایک جوئے کا اڈہ، یا ایک زنا کا مرکز قائم کرتے ہیں، تو اس کی مثال خاردار درخت کی سی ہے، اور اس کا وجود درخت سے بڑے پیمانے پر مفاسد پھیلائے گا، اور جس جس شخص کے مال، اخلاق

اور جسم اور دماغ پر ایسے کسی ادارہ شر کا اثر پڑے گا، اس کی ذمہ داری ان لوگوں کے بہی کھاتے کو ضرور متاثر کرے گی جنہوں نے اس کی تاسیس کی تھی ——— اور ان میں سے جس نے اپنے وقت میں سے ایک لمحہ، اپنے مال میں سے ایک حبہ، اور اپنی قوتوں میں سے ایک رمق بھی اسے قائم کرنے میں صرف کی ہوگی، اس کے حقیر سے سرمایۂ شر پر سالہا سال میں "منافع شر" کی جو مقدار شامل ہو جائے گی، وہ تو معلوم اصل سے کے لاکھ گنا زائد ہوگی، اور جب انہیں ان کا سرمایہ مع منافع لوٹ کر ملے گا، تو وہ حیران رہ جائیں گے کہ کیا یہ ساری کمائی ہماری ہی ہے!

اجتماعی خیر اور اجتماعی شر کا جو بڑے سے بڑا ادارہ نوع انسانی ایجاد کر سکی ہے، وہ ریاست و حکومت کا ادارہ ہے۔ اس ادارے کا دامن تمام دوسرے تمدنی ادارات پر پھیلا ہوا ہے، بلکہ یوں کہئے کہ یہ تنا ہے تو باقی ادارات اسی کی شاخیں، پتے اور شگوفے ہیں۔ یہ ادارہ غلط بنیادوں پر قائم ہو جائے تو یہ "مہا پاپ" یا "منکر اعظم" ہوتا ہے اور پھر اس کے سرچشمۂ شر سے جتنے سوتے نکلتے ہیں وہ ظلم و فساد ہی کے سوتے ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ ادارہ اگر صحیح بنیادوں پر صحیح مقاصد کے ساتھ اور صحیح اصولوں کے تحت وجود پائے تو یہ "مہا پُن" یا "معروف اعظم" ہوتا ہے، اور اس کے سرچشمۂ خیر سے نہریں جاری ہوتی ہیں، ان میں سے ایک ایک رحمت کی تسنیم اور برکت کی سلسبیل ہوتی ہے۔ باطل کی حکومت ایک خاردار اور کڑوے پھل دینے والے درخت کی طرح ہوتی ہے کہ نہ اس کے سائے میں پناہ لی جا سکتی ہے، نہ اس کے پھلوں سے بھوک مٹائی جا سکتی ہے، اور حق کی حکومت ایک میٹھا پھل دینے والے سایہ دار درخت کی طرح ہوتی ہے جس کے نیچے وادیٔ حیات کا ہر مسافر سستاتا ہے اور ہر بھوکا پیٹ بھرتا ہے! ———

۵۳۸۹

دنیا میں یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک وسیع مظاہرہ ہے اور وہ خدا کے قہر و غضب کا ایک وسیع الاثر تسلط ہے!

جیسے ایک فرد کا فکری، اخلاقی اور عملی بگاڑ خدا کی نافرمانی سے شروع ہوتا ہے اور اگر کوئی فرد خدا کے وجود سے، اس کے مالک اور آقا ہونے سے، اور اس کے مالک یوم الدین ہونے سے انکار کر دیتا ہے، تو پھر اس کی زندگی کی پوری کل بگڑ کے رہ جاتی ہے اور وہ ایک خطرناک مفسد اور نفع پرست اور خواہشاتی انسان کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، اسی طرح جب کوئی قوم یا جماعت اُس "الحق" سے انحراف کر کے حکومت کی بنیاد رکھتی ہے، جو کائنات کی رُوح رواں ہے —— یعنی اللہ کا سرچشمۂ اقتدار اور سرچشمۂ قانون ہونا اور مخلوق کا اس کی بندگی پر مامور ہونا —— تو ایسی حکومت میں پھر کسی پہلو سے کسی جزوی حق کے محفوظ رہ جانے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جا سکتی۔ الحق کا جب انکار کر دیا گیا اور اس کی جگہ کوئی باطل بنائے حکومت بن گیا تو پھر یہ ساری عمارت باطل ہی کی عمارت ہو گی۔ جب بیج غلط بو دیا گیا تو اس سے جو درخت پیدا ہو گا، اس کا تنا، اس کی ٹہنیاں، اس کی کونپلیں اور اس کے پتے کیسے صحیح ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ سب سے بڑا باطل جس حکومت کی اساس میں پیوست ہو جاتا ہے کہ خدا کی اس دنیا میں رہنے والے خدا کے پیدا کردہ انسانوں کو بھی فرماں روائی کے اختیارات ہیں، تو پھر اس "جہاں پاپ" سے شاخ در شاخ ہزار ہا پاپ پیدا ہوتے اور پرورش پاتے جاتے ہیں۔ خدا سے بغاوت سب سے بڑا ظلم ہے اور جس حکومت نے اپنے قیام کا آغاز اس ظلم ہی سے کیا، اس کے ہر ادارے کے اندر سے طرح طرح کے مظالم و مفاسد شاخ در شاخ پھوٹتے چلے جائیں گے۔

ایک حکومت جس کا بنیادی اصول غلط ہے، لازماً غلط مقاصد اپنے پیش نظر رکھے گی اور پھر تمدن کے ہر ادارے کو مجبور کرے گی کہ وہ انہیں غلط مقاصد کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے، وہ پروپیگنڈہ کے بے شمار وسائل کو استعمال کر کے ذہنوں کو ایک غلط طرزِ فکر سکھائے گی، وہ تعلیم کے ادارات پر قابو پا کر نئی نسلوں کو غلط اخلاقی تربیت دے گی، وہ ایک غلط قانونی نظام کھڑا کرے گی، وہ غلط پروگرام کے تحت فوجی قوت کی تعمیر کرے گی، وہ پبلک سے روپیہ لے گی تو غلط طریق سے، اور اسے صرف کرے گی تو غلط طریق سے ——— اور اپنے مزاج کے مطابق سوسائٹی کا اجتماعی ماحول ہی از سرتاپا بدل دے گی۔

غیر اسلامی حکومت کا خاصہ ہے کہ اس کے تحت انسان اور انسان میں تفریق ہوتی ہے، کچھ لوگ کسی حق کے بغیر اونچے قرار پاتے ہیں اور کچھ لوگ کسی قصور کے بغیر نیچے گرا دئے جاتے ہیں۔ کچھ کو یہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں سے ناجائز فائدے اٹھائیں، اور کچھ کو ایسا بے بس کر دیا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی غلامی کرتے ہوئے جئیں۔ ایک طبقہ زیادہ سے زیادہ حقوق لے اڑتا ہے اور دوسرے طبقے پر زیادہ سے زیادہ فرائض لاد دیئے جاتے ہیں۔ نقصانات کمزوروں کی جھولی میں ڈالے جاتے ہیں، اور فائدے طاقت وروں کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ بڑا اور بڑا بنتا چلا جاتا ہے اور چھوٹا اور چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے۔ کچھ کے لئے خدائی کی مسندیں مخصوص کر دی جاتی ہیں اور کچھ کو لدو جانوروں کا منصب دیا جاتا ہے!

ایک ہی سوسائٹی کے اندر ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ طبقے طبقات سے اور افراد افراد سے کش مکش کرتے ہیں، ایک دوسرے کی جیبیں کاٹی جاتی ہیں، ایک

دوسرے کو اڑنگے لگائے جاتے ہیں، ایک دوسرے کو دھکے دیئے جاتے ہیں، کمائیاں حرام کی کمائیاں ہو جاتی ہیں اور مصارف حرام مصارف ہو جاتے ہیں!

غیر اسلامی سوسائٹی میں دولت کے دریا کو بند لگا کر کچھ لوگ اپنے کھیتوں کی سیرابی کے لئے مخصوص کر لیتے ہیں اور بقیہ کی کھیتیاں بادو باراں کی کرم فرمائیوں کا منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ غریب لوگ شکم سیروں کے سامنے فاقہ کشی کرتے رہتے ہیں اور کسی کے اندر حمیت انسانیت جوش نہیں مارتی۔ بیوائیں تنگی کی زندگی گزارتی ہیں، اور ان کے پڑوس میں ہنگامہ ہائے عیش میں مست رہنے والے مترفین کو کبھی احساس تک نہیں ہوتا۔ یتیم دردر ٹھوکریں کھا کر اپنی عمریں برباد کر لیتے ہیں، لیکن بے حیا اکابر قوم پھٹے دیدوں سے ان مناظر کو دیکھتے رہتے ہیں، لیکن کبھی بھی تو ان کا ذہنی سکون درہم برہم نہیں ہوتا!

غیر اسلامی حکومت کے نیچے سود خوری پرورش پاتی ہے، بلیک مارکیٹ کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے، سٹہ بازی کو پروان چڑھنے کے لئے سہولتیں میسر آتی ہیں، فریب کاری اور جھوٹ اور لسانی کو فروغ پانے کے لئے مناسب فضا مل جاتی ہے۔ پھر بے حیائی بڑھتی ہے، نظر بازی اور تاک جھانک کا زور ہوتا ہے، زنا ایک مقبول دل بہلاوا بن جاتا ہے، بے پردگی و عریانی کا زور ہو جاتا ہے، رقص و سرود کے طوفان چاروں طرف ابلنے لگتے ہیں —— اور شیاطین کو اودھم مچانے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔

ایسی حکومت کی قانون سازی اشرار کی شرارتوں کے لئے اور زیادہ زمین ہموار کرتی ہے، ایسی حکومت کی عدالتوں اور تھانوں اور کوتوالیوں کے "سایہ دیوار" میں

گھناؤنے جرائم جاری رہتے ہیں، ایسی حکومت کی بین الاقوامی پالیسی نفع پرستی پر مبنی ہوتی ہے اور اس کے سارے معاملات اور سارے جہانی تعلقات کا مرکز "فائدہ" ہوتا ہے، اس کی جنگ و صلح کا مدار یکسر ظلم اور بے انصافی پر ہوتا ہے، اور وہ دنیا بھر کی قوموں کے سر اپنی اخلاقی غلاظت تھوپتی ہے، اس طرح باطل کی حکومت ایک جرم مجسم، ایک سرچشمۂ فساد، ایک بس کی گانٹھ، ایک فتنوں کی جڑ ہوتی ہے۔ جس سے کسی فرد کو، کسی پارٹی کو اور کسی طبقے کو پناہ نہیں مل سکتی، اس کا پھیلا ہوا زہر ہر شخص کی رگوں میں سرایت کرتا ہے، اور ملک کا ایک ایک باشندہ اس "منکرِ اعظم" کو چلانے والی فرم کا رکن اور اس کے سرمایۂ قوت کا شریک ہوتا ہے!

پس اس ادارۂ معصیت کے کاروبار پر جو سا لہا سال تک مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے، جتنا اضافۂ شر ہوتا ہے اس میں سے اس کے ہر شریک کار کو حصہ ملتا ہے۔ جس نے اس کے قیام و استحکام کے لئے اپنا ایک منٹ بھی دیا، اپنی ایک پائی بھی صرف کی، اپنی زبان اور اپنے قلم کی ایک جنبش بھی استعمال کی، اور اس کے سائے میں جس نے اطمینان کی ایک سانس بھی لی، وہ آپ سے آپ اس کا حصہ دار ہو گیا، ایسی حکومت کے تحت جس بیوہ کی ایک رات بھی فاقہ میں گزری، جس یتیم کو ایک دن بھی بھوک نے ستایا، جس مفلس و ضعیف کا ایک حق بھی مارا گیا، جس مزدور کی مزدوری میں سے ایک حبہ بھی روکا گیا، جس آدم زاد کے احترام میں ذرہ بھر بھی کمی کی گئی، جس محتاج کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا، جس ضرورت مند کے ساتھ بلیک مارکیٹ کی گئی، جس جیب میں سے رشوت کے چند سکے بھی نکالے گئے، جس عصمت کو ایک نگاہِ بد سے بھی خراش لگائی گئی، اس کی مظلومی کا وبال ایک

خزانۂ آتشیں کی شکل میں جمع ہو کر آخر کار منکرِ اعظمؑ کی قوم کے ہر حصہ دار کو ملے گا!

دوسری طرف اسلامی حکومت اتنے ہی وسیع پیمانے کا معروفِ اعظمؑ ہے! اس کی احساس چونکہ اس "الحق" پر قائم ہوتی ہے جو اس کائنات کی جان ہے، لہذا یہ بذاتِ خود ایک عظیم ترین حق بن جاتی ہے، جس سے شاخ در شاخ حق پھوٹتے ہیں اور پھلتے پھولتے ہیں، یہ دنیا میں خدا کا سب سے بڑا انعام ہے جو بندوں پر کیا جاتا ہے۔ یہ بارانِ رحمت جب قلوب و اذہان کی سرزمین پر برس جاتی ہے تو خیر و برکت کی اور افکارِ عالیہ اور اعمالِ صالحہ کی فصلیں ابل اٹھتی ہیں، اخلاق کا سبزہ لہلہانے لگتا ہے، جذبات کا چمن جنت نگاہ بن جاتا ہے، اور سیرتِ انسانی کا باغ معاً پھلنے لگتا ہے!

اسلامی حکومت کے نمودار ہونے سے از خود وہ ماحول بننے لگتا ہے، جس میں نیکیاں نشوونما پائیں اور جس میں برائیاں مرجھا کر رہ جائیں۔ اس کے اثر سے وہ فضا بنتی ہے جس میں انسانیت کے لئے طبعی ارتقا کے سارے راستے کھل جاتے ہیں، اور انحطاط اور پستی کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس کے اثر سے معاشرہ میں ذوقِ عبودیت ترقی کرتا ہے اور بغی و طغیان کے رجحانات ختم ہونے لگتے ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان حائل ہونے والی دیواریں ٹوٹتی ہیں، جعلی خدائی کی مسندیں الٹ جاتی ہیں اور "مخصوص حقوق" کی اجارہ داریاں ختم ہو جاتی ہیں، بڑے اور چھوٹے طبقات اور شریف اور رذیل افراد کی مصنوعی تقسیمیں برقرار نہیں رہتیں جو جتنا قوی ہے اس پر اتنا ہی زیادہ فرائض کا بوجھ ڈالا جاتا ہے اور جو جتنا ضعیف ہے اس پر اتنا ہی کم بار رکھا جاتا ہے۔ تمام انسانوں کے مختلف حقوق کا قطعی تعین ہو

جاتا ہے، ہر فرد کے لئے حدود کار متعین ہو جاتی ہیں، حلال و حرام کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا جاتا ہے!

ایسی حکومت کے نیچے حق ماری کی مہم کوئی جاری نہیں رکھ سکتا، کوئی کسی پر دست تعدی نہیں بڑھا سکتا اور کسی کو یہ جرات نہیں ہو سکتی کہ اپنی ذمہ داریوں کو دوسروں کی پیٹھ پر لاد کر خود مزے اڑائے۔ یہاں ہر بیوہ، ہر یتیم، ہر مفلس، ہر محتاج، ہر مزدور اور ہر کسان نہ صرف اپنی ضروریات زندگی حاصل کر سکتا ہے، بلکہ اپنی آبرو کو ملک کے بڑے سے بڑے آدمی کے برابر درجے پر قائم رکھ سکتا ہے۔ یہاں آگے بڑھنے کے راستے سب پر یکساں کھلے ہوتے ہیں اور نشو و نما پانے کے لئے سب کو ایک جیسی فضا میسر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں "قسط و عدل" اور "مساوات و توازن" کا ایک وسیع نظام قائم ہو جاتا ہے۔

یہ حکومت پروپیگنڈے کے وسائل کو استعمال کر کے نہایت درجہ کی پاکیزہ ذہنیتیں پیدا کرتی ہے، اس کا نظام تعلیم "صالحین" پیدا کرتا ہے، اس کی عدالتیں انصاف کی آبیاری کرتی ہیں، اس کی پولیس اخلاق کی رکھوالی کرتی ہے، اس کی فوج حق کے تحفظ کا فرض انجام دینے کے لئے تشکیل پاتی ہے ——— اور اس کے سارے ادارات تمدن خیر، فلاح، عدل، امن، سلامتی اور برکت کو فروغ دیتے ہیں، کوئی فرد اور کوئی پارٹی ایسی نہیں ہوتی جو رحمت کے اس سمندر سے سیراب نہ ہو۔ پھر بین الاقوامی حیثیت سے اقوام عالم کے لئے یہ ایک بین الاقوامی مدرسہ صالحیت یا عالمگیر شفاخانہ اخلاق کی حیثیت رکھتی ہے!

اس "معروف اعظم" کی سرگرمیوں سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ ملک کی

آبادی سے نکل کر پورے عالم انسانیت کو محیط ہو جاتا ہے، اور حال کی نسل سے آگے نکل کر مستقبل کی کئی نسلوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ چنانچہ اس وسیع درجہ کے انعام الٰہی سے جس فرد کو بھی نفع پہنچتا ہے اس کی جزا بر اس شخص کے حصے میں آتی ہے جو اس معروفِ اعظم کے قیام و استحکام میں کسی درجے میں شرکت کر چکا ہو۔ اس نظام کے پیدا کردہ ماحول نے جس انسان میں کوئی نیکی ابھاری ہو، اسکی بنائی ہوئی فضا نے جس شخص کو کسی وقت بدی سے رُکنے پر قادر کیا ہو، اس کے تحت جس حقدار کو اس کا جائز حق حاصل ہوا ہو، اس نظام کی وجہ سے جو ضعیف ہستی کسی دستِ تظلم کی رسائی سے بچائی گئی ہو، اس ادارے کے سائے میں جس محتاج کی کوئی حاجت پوری کی جائے، اس کا صلہ جمع ہو کر اس کے تمام حصہ داروں میں تقسیم ہو گا!

اس نظام کے اندر جب کوئی مدرس درس و تدریس کی مسند پر بیٹھتا ہے، جب کوئی جج عدالت کی کرسی پر جلوہ آرا ہوتا ہے، جب کوئی پولیس کنسٹیبل کسی چوراہے پر ڈیوٹی دینے کھڑا ہوتا ہے، جب کوئی فوجی سپاہی اپنی بندوق کاندھے پر رکھ کر پریڈ کرتا ہے، جب کوئی کلرک ٹائپ مشین پر اپنی انگلیوں کو حرکت دیتا ہے، جب کوئی ڈاکٹر آپریشن کے لئے نشتر ہاتھ میں لیتا ہے تو وہ ایک عبادت انجام دیتا ہے۔ اب جس نظام کے ایک ایک کارکن کا ہر فعل عبادت کی حیثیت رکھتا ہو، وہ خود کتنے بڑے درجے کی عبادت ہو گا، اس کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ اس اجتماعی عبادت اعظم میں حصہ داری جتنی بڑی سعادت ہو سکتی ہے، اس کی وسعت کا حال آخرت ہی میں معلوم ہو گا، جب کہ اس عبادت میں شامل ہونے والے افرادِ انسانی اپنے اعمال ناموں کو رحمتِ الٰہی سے لبریز پائیں گے۔ اسلامی حکومت کی عظیم الشان عبادت انجام دینے کے لئے

کسی ملک کے نظامِ اجتماعی کی مسجد تعمیر کرنے میں جس نے ایک اینٹ بھی رکھی، ایک حبہ بھی صرف کیا، ایک لمحہ بھی وقت کا دیا، اس نے یقیناً بہت بڑی کمائی کر لی!

اب اگر اس اصولی گفتگو سے ہم آگے نکلیں اور اپنی نگاہوں کو خاص طور پر پاکستان کے حالات پر مرتکز کر دیں تو یہ مسئلہ ہمارے سامنے آجائے گا کہ آیا اس خون سے خریدی ہوئی سرزمین پر ہم ایک مسجد تعمیر کریں جس میں اللہ کی عبادت ہو اور جس سے خیر کے سوتے پھوٹ بہیں، یا اس پر ہم ایک شراب خانہ یا رقص گھر یا بت کدہ بنائیں جس میں شیطان کی بندگی ہو اور جس میں ظلم اور فساد کے ہنگامے پرورش پائیں؟ —— دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہمیں یہاں غیر اسلامی حکومت کا "منکرِ اعظم" قائم کر دینا ہے یا اسلامی حکومت کا "معروفِ اعظم"! ہم اپنا سرمایۂ قوت نیکی کی ایک فرم میں لگا کر اللہ کی رحمت کا اکتساب کریں یا بدی کی ایک کوآپریٹو سوسائٹی کے حصہ دار بن کر دو جہان کی لعنت اپنے دامن میں سمیٹیں؟ یہ دونوں صورتیں ہم اختیار کر سکتے ہیں، کیونکہ ہم ایک آزاد قوم ہیں! —— اور چونکہ ہم نے اپنی طرف سے کچھ نمائندوں کو اس کا فیصلہ کرنے کے لئے منتخب کر دیا ہے کہ پاکستان میں کونسا نظام قائم ہونا چاہئے، لہٰذا اسی لمحے ہم اپنا ارادہ ان پر واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم باشندگانِ پاکستان کیا چاہتے ہیں؟

انگریز یہاں جو نظام قائم کر کے اپنے ترکے کے طور پر ہمارے حوالے کر گیا ہے، وہ بالکل "منکرِ اعظم" ہے اور اسے قائم رکھنا اور چلانا اور اس میں حصہ دار بننا اور اس کے سائے میں اطمینان سے زندگی بسر کرنا اس کے وبال میں سے ہر فرد کو حصہ دار بنا رہا ہے، ہمارے ہزاروں دماغ اس کی خدمت کے لئے خریدے ہوئے ہیں، ہمارے لاکھوں افراد کے جسم اس کی نوکری کے لئے کرایے پر چڑھے ہوئے ہیں، ہمارے اموال کا ایک حصہ از خود کھنچ کر

اس منکرِ اعظم کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس کے خزانے میں جمع ہو جاتا ہے اور پھر ہماری ہی طاقتوں کے مجموعی خزانے کے بل پر مظالم و مفاسد اور فسق و فجور کی وہ ساری اسکیمیں چلتی ہیں، جن سے ملک کے عوام کا ایک ایک فرد دُکھ پاتا ہے اور صرف چند افراد اپنے عیش و عشرت کے پروگرام کو پورا کرنے کے لئے وسائل حاصل کرتے ہیں۔ یہ "مہاپاپ" ہمارے اوپر مسلط ہے، اور ہم اس کا احساس نہیں کر رہے۔ ہم اس جرمِ اعظم کے مرتکب ہیں اور اس کا ہمیں شعور نہیں رہا، لیکن اگر اب ہمارا شعور و احساس بیدار نہ ہوا تو پھر یہ کبھی بیدار نہ ہوگا اور بیدار ہوگا تو بے کار ہوگا۔

ہم مسلمانوں کی فطرت "منکر" کے ساتھ ساز گار نہیں ہے۔ ہم چاہے کتنے ہی گر گئے ہوں، غیر اسلامی سیاست و تمدن سے، ہمارے مزاج موافقت پیدا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ انگریزی نظامِ فکر کے تحت مسلمان کبھی چین سے نہیں جئے ہیں۔ بلکہ ان کی ایک ایک گھڑی اضطراب اور بے چینی میں کٹی ہے ——— صرف غلامی کے احساس کی وجہ سے نہیں، بلکہ غیر اسلامی ماحول کے جابرانہ تسلط کی وجہ سے! ——— اور انہوں نے انگریزی غلامی کی دو صدیاں اسلامی نظام کے خواب دیکھتے ہوئے گزاری ہیں۔ اُن کی آزادی کی جدوجہد صرف انگریزی نظام کے خاتمہ کی منفی جدوجہد نہیں تھی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام قائم کرنے کی مثبت جدوجہد بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اکابر کو اپنی باگ ڈور اس وقت تک نہیں سونپی جب تک ان کی طرف سے اسلامی نظام کے قیام کے پختہ وعدے پیش نہیں کئے گئے۔ انہوں نے تعاون کا چندہ دل کھول کر اگر دیا ہے تو صرف اس بنا پر دیا ہے کہ یہ چندہ اسلامی نظام کی مسجد تعمیر کرنے کے لئے طلب کیا گیا تھا ——— اس لئے نہیں دیا

ہے کہ اس سے انگریز کے تعمیر کردہ "کلب گھر" کی تعمیر جدید کی جائے، جسے انگریزی اقتدار اپنے ورثہ میں چھوڑ کر گیا ہے۔ لیکن یہ امر افسوسناک ہے کہ مسجد بنانے کے وعدے پر چندہ جمع کرنے والے لوگ اب اس چندے کو فسق وفجور کا ایک اڈہ تعمیر کرنے پر صرف کرنا چاہتے ہیں اور چندہ دینے والوں کے استفسارات پر انہیں ٹالنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اب یہ چندہ دینے والوں کا کام ہے کہ وہ "مسجد کمیٹی" کے ایک ایک رکن سے باز پرس کریں کہ آخر اب تک مسجد کی بنیاد رکھنے میں کیوں تامل کیا جارہا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ پرانا کلب گھر بدستور آباد ہے بلکہ پبلک کا چندہ اس کی آرائش وزیبائش اور مرمت پر صرف کیا جارہا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ تم لوگ مساجد کے فن تعمیر کے متعلق نہ معلومات جمع کر رہے ہو، نہ اس فن کے ماہرین کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت سمجھتے ہو؟ پھر کیا وجہ ہے تم مسجد کے داعی آج تک کبھی نماز پڑھنے پر آمادہ نہیں ہوئے؟ ———

کیا ان باتوں سے ظاہر نہیں ہوتا کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے؟ پھر یہ تعاون کا چندہ دینے والوں ہی کا کام ہے کہ وہ اپنے دل کی آواز کو صاف صاف اپنے نمائندوں تک پہنچا دیں کہ ہم نے "معروف اعظم" قائم کرنے کے لئے تم لوگوں کو آگے کیا ہے، اور ہم نے "منکرِ اعظم" کے قائم کرنے کے لئے تمہیں کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔ پھر یہ اتنباہ صاف طور پر ہو جانا چاہئے کہ اگر تم لوگ ادارۂ حکومت کو معصیت کا ادارہ بنانا چاہتے ہو تو ہمارے چندے ہمیں واپس کر دو، تاکہ ہم دوسرے مناسب لوگوں کو تلاش کریں جو حکومت کو نیکی کا ادارہ بنانے والے ہوں اور جن پر پوری طرح بھروسہ کیا جاسکے کہ یہ قوم کے خزائن کو کسی غلط مصرف پر محض اس بنا پر صرف کرنے پر نہیں اتر آئیں گے کہ قوم کی پونجی پر قبضہ ان کا ہو گیا ہے!

اگر یہاں "منکرِ اعظم" قائم رہا تو یہ دنیا کی انتہائی بدقسمتی ہوگی اور آخرت میں اس کی ادنےٰ سے ادنےٰ حصہ داری ہم میں سے ہر فرد کے لئے انتہائی وبال لائے گی اور اگر یہاں "معروفِ اعظم" کا قیام عمل میں آگیا تو نہ صرف ہم اپنے اوپر ایک احسانِ عظیم کریں گے بلکہ دنیا کی پوری قوموں کی اور اپنی آنے والی کئی نسلوں کی خدمت سرانجام دیں گے اور اس کی ادنےٰ سے ادنےٰ حصہ داری بھی آخرت میں ہمارے لئے بڑے بڑے انعامات کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ یہاں نظامِ حکومت کی بنا رکھنے کے لئے کسی اصول کا انتخاب صرف پاکستان کی تاریخ کے لئے نہیں، بلکہ دنیا بھر کی تاریخ کے لئے ایک انتہائی مؤثر واقعہ ہوگا۔ اگر دنیا کے مروجہ غیر اسلامی اصولوں کو ہم نے اپنا لیا تو پوری دنیا صدیوں کے لئے نظامِ اسلامی سے محروم ہو جائے گی۔ اور اگر یہاں حکومت و سیاست کا اسلامی اصول قبول کر لیا گیا تو یقیناً پوری تہذیبِ انسانی کے دھارے کا رُخ بدل جائے گا اور وہ عجیب و غریب واقعات رونما ہوں گے جو بین الانسانی ماحول کو یکسر بدل دیں گے!

وہ لوگ جو حکومت کو منکرِ اعظم بنانا اور بنائے رکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے عزائم کو پورا کرنے کے لئے پوری قوتیں استعمال کر رہے ہیں لہٰذا وہ لوگ جو پاکستان کے نظام کو معروفِ اعظم کی شکل دینا چاہتے ہوں، اگر صرف دل میں خیال آرائیاں کرنے پر اکتفا کریں تو ان کی کامیابی کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔ نظامِ اسلامی کا قیام جن لوگوں کا فی الواقع مقصد بن چکا ہو، ان کے لئے لازم ہے کہ وہ اس مقصد کی ساری ذمہ داریوں کو پورا کریں، جس طرح کہ ہر مقصد کا تقاضا ہوتا ہے، وہ اس کے لئے اپنے فکر کو بدلیں، اپنے اخلاق کو سازگار بنائیں، اپنے دماغوں کو مصروف کریں، اپنی جیبوں کے منہ کھولیں، اپنے

آراموں کو قربان کریں، مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں، جائدادیں قرق کرانے کا حوصلہ پیدا کریں۔ ارباب اقتدار کی جفاؤں کا نشانہ بننے کے لئے مضبوط قلب وجگر مہیا کریں اور منظم ہوں اور منظم جدوجہد کرنے کے وہ ڈھنگ سیکھیں جو نظام اسلام کے قیام کے لئے انبیاء وصلحاء نے ہمیشہ اختیار کئے ہیں!

اس سلسلے میں سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کی آرزو رکھنے والے ایماندار اور صالح افراد تمام کے تمام الگ منظم ہو جائیں، یہاں تک کہ اس ملک میں صاف صاف دو کیمپ قائم ہو جائیں۔ ایک کیمپ مغرب پرستوں کا کیمپ ہو اور دوسرا خدا پرستوں کا۔ ایک طرف اسلام پسند عناصر جمع ہوں اور دوسری طرف کفر پسند عناصر سمٹ جائیں۔ نفسانیت سے آلودہ سیرت رکھنے والے لوگ الگ ہو جائیں اور خدا پرست فرض شناس الگ منظم ہو جائیں۔ پھر جس کو ادھر ہونا ہو، ادھر ہو جائے اور جس کو اُدھر جانا ہو اُدھر ہو جائے۔ پھر اسلام کے کیمپ سے کوئی شخص مغربیت کے کیمپ میں جا کر خدمات بجا لانے کے لئے باقی نہ رہے، اور ادھر سے دماغی، مالی اور جسمانی قوتوں کی کوئی رمق اُدھر کے پروگراموں میں صرف ہونے کے لئے نہ جا سکے۔ جس روز پاکستان کے صالحین نے یہ منزل مار لی، اس دن حالات بالکل بدل جائیں گے، اور آج جو مغرب پرست عنصر قوم پر پورے اقتدار کے ساتھ مسلط ہے کل بالکل ایک اچھوت گروہ بن کے رہ جائے گا جسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے والی کوئی آنکھ نہ ہوگی، اور جس کا مقام پاکستان میں صرف یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو ایک جداگانہ اقلیت کی حیثیت سے تسلیم کرا لے، اور اپنے حقوق معین کرا کے پُرامن زندگی گزارے۔

ملک کے خدا پرست صالح عناصر کی بہترین تنظیم جو تحریک اسلامی خطوط پر قائم ہے اور جو کام کا پورا پروگرام کتاب و سنت کی ہدایت کے تحت چلا رہی ہے اور جس کا مقصد وجود ہی روز اول سے اسلامی نظام کا قیام تھا، جماعت اسلامی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جماعتی عصبیتوں کو الگ رکھ کر، جزوی اختلافات سے خالی الذہن ہو کر، رقابتوں اور جاہ پسندیوں اور علیحدگی کے رجحانات اور گروہ بندیوں کے ذوق سے پاک ہو کر پاکستان کا ایک ایک مسلمان اس جماعت کے اصول و مقاصد کو، اس کے دستور اساسی کو اور اس کے طریق کار کو غور سے سمجھے، اور اس کے کارکنوں کی سیرت کا جائزہ لے۔ پھر جس جس کو اس تنظیم پر اطمینان ہو جائے، وہ اپنا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ آیا وہ اس کی شرائط رکنیت پوری کر سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو تو ہر شخص کے لئے ہر وقت اس تنظیم میں شامل ہونے کے دروازے کھلے ہیں۔ لیکن اگر رکنیت کی ذمہ داریاں بھاری معلوم ہوں تو اس کے حلقہ ہمدرداں اور حلقہ متفقین میں شرکت کی جا سکتی ہے اور اس شرکت کی شرائط بھی معلوم ہو سکتی ہیں۔ ہماری رائے میں پاکستان کے مسلم کیمپ کو منظم کرنے کے لئے یہ جماعت بہترین مرکزی تنظیم (Nucleus) ثابت ہو سکتی ہے۔ تاہم اگر کسی شخص کو اس جماعت کے اصول و نظام سے اتفاق نہ ہو یا اس کے کارکنوں کی سیرت پر اعتماد نہ ہو تو اس سے وابستگی کئے بغیر بھی اپنی سرگرمیوں کو اسلامی نظام کے قیام کے لئے مخصوص کر سکتا ہے اور حدود اتفاق کے اندر تعاون کر سکتا ہے۔

بہر حال اب سوچنے کا وقت کم ہے اور فرائض کی فوری انجام دہی کی ضرورت ہے، لہذا ہر فرد مسلم کو اپنے متعلق جلد از جلد یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اپنی قوتیں اور قابلیتیں کس طرف صرف کرے!

پاکستان اور اسلامی نظام

مسلمانوں کا مطالبۂ پاکستان پورا ہو گیا!

اس سیاسی مقصد کے حصول کے لئے بازار تقدیر میں جو بھاری قیمت ہماری قوم کو ادا کرنا پڑی ہے، اس کا اندازہ خود یہ قوم ہی کر سکتی ہے، باہر کے تماشائی نہیں کر سکتے۔

سب سے بڑا نقصان جو اس مقصد کے لئے برداشت کرنا پڑا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری قوم ہندوستان کے ذرائع و وسائل پر جو وسیع استحقاق رکھتی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا، اب سارے حقوق پاکستان کی حدود میں سکڑ گئے ہیں۔ دوسری بڑی قربانی یہ دی گئی ہے کہ دس کروڑ مسلمان جس قومی وحدت میں پروئے ہوئے تھے اسے تقسیم ملک نے ملیا میٹ کر دیا اور اب ہندوستان کے مسلمان پاکستان کے مسلمانوں کے لئے اور پاکستان کے مسلمان ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کسی معاملہ میں لفظی ہمدردی

کا اظہار کرنے سے زیادہ اورکسی قابل نہیں رہے ۔ پھر تیسرا نقصان یہ پیش آیا ہے کہ
پاکستان کے وجود میں آتے ہی ہندوستان کے ۴½ کروڑ مسلمان اس لیڈر شپ سے
منقطع ہوگئے ہیں جس کے پیچھے وہ گذشتہ چند سال سے سیاست کی وادیاں طے
کر رہے تھے، اور اب وہ ایک بے سری فوج کی طرح کسی نئی تنظیم اور قیادت کے
لئے مارے مارے پھر رہے ہیں، بلکہ ان کی حالت یہاں تک ناگفتہ بہ ہوگئی ہے کہ
کل تک وہ جن لیڈروں کا مضحکہ اڑاتے رہے ہیں اور جن کو گالیاں دیتے رہے ہیں،
ان کا سہارا حاصل کرتے ۔ اور ان سے تسلی کے دو حرف سننے کے لئے وہ مضطرب
نظر آتے ہیں۔ پھر ان کی بدقسمتی یہیں ختم نہیں ہوجاتی، بلکہ مزید براں یہ کہ جس قوم کے
سامنے وہ حریف بن کر ڈٹے ہوئے تھے اور جس کی نیازمندی تو کجا، ہمسری بھی گوارا
نہ تھی، اب اسی قوم کی اکثریت کے گھٹنوں تلے کچلے جا رہے ہیں ——— اور
مجبوری کی انتہا یہ کہ اس حالت پر اُف کرنا بھی ممکن نہیں، بلکہ الٹا انہیں مسکرانا اور
شکریہ ادا کرنا ناگزیر محسوس ہو رہا ہے۔ کل وہ جس قوم سے کہتے تھے کہ تم اور ہم الگ
الگ قومیں ہیں، آج اس سے خوشامدانہ ادا سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم اور تم دونوں ایک
ہیں۔ کل جن لوگوں سے نفرت تھی، آج ان کے سامنے زانو تہ کرکے یہ اقرار باندھنے
کی نوبت آگئی ہے کہ ہم تمہارے وفادار ہوکے رہیں گے۔ پھر وہ مجبور ہوئے کہ جس
جھنڈے کے خلاف صف آرا رہے ہیں اسے سلامیاں دیں، جس بولی سے ان کی
سماعت مجروح ہوتی تھی اسے اپنی قومی زبان کی جگہ چپ چاپ خالی کرکے دیں،
ان کو اپنے احساس خودداری کو اس حد تک دبانا لازم محسوس ہوا کہ جن شعائر اسلامی
سے اکثریت چڑتی ہو۔ ان کی بجا آوری سے توبہ کریں۔

پھر مقصد پاکستان ہی کی خاطر مسلمانوں کو ایک طویل سلسلۂ فسادات کا سامنا کرنا پڑا، اور جانوں، مالوں، جائدادوں اور آبروؤں کے بھاری نقصانات برداشت کئے گئے اسی سلسلہ فسادات کے پیٹ سے مشرقی پنجاب کی قیامت نے جنم لیا اور مسلمان قوم کو تہ و بالا کر دینے والا ایک زلزلہ برپا ہو گیا۔ یہ فساد نہیں تھا بربریت کا ایک ناچ تھا، وحشت کا ایک خونی کھیل تھا شیطنت کا ایک ہولناک مظاہرہ تھا معصیت کا ایک بے پناہ طوفان تھا، بزدلانہ مظالم کا ایک امڈتا ہوا سیلاب تھا، بے حیائی اور دیوثی کا ایک جھکڑ تھا ——— یہ آبادیاں اور بستیاں کھنڈر بن کے رہ گئیں، شہر قبرستان ہو گئے، گلیاں مرگھٹ بن گئیں، بازاروں میں لاشوں کے انبار لگ گئے، سڑکوں پر خون کی ندیاں بہہ نکلیں، ایوان آگ کا لقمہ ہونے لگے، اموال لٹنے لگے، معصوم بچوں کے سینوں میں چھریاں بھونکی گئیں، بڑھیا عورتوں کے پیٹ برچھیوں نے چھید دیئے، نوجوان لڑکیاں غنڈوں کی بہیمیت کا شکار ہونے لگیں، نقاب والیوں کے نقاب نچ گئے، پردہ والیوں کو برہنہ کر کے سڑکوں پر پھرایا گیا، نوجوانوں کو غیرت آئی تو اس نہتی غیرت کا راستہ تلواروں اور بندوقوں نے روک لیا ——— بزرگان امت کے مزارات کھود ڈالے گئے، مساجد کے مینار گرائے گئے، منبروں کے تختے اکھیڑ دیئے گئے، محرابوں پر کدالوں سے وار کئے گئے، قرآن کے اوراق کو پامال کیا گیا، موذن نہ رہے کہ اذانیں کہیں، نمازی نہ رہے کہ عبادت گاہوں میں نمازیں ادا کریں، خطیب نہ رہے کہ منبروں سے خطبے نشر کریں، قاری نہ رہے کہ ان کی قرأت فضاؤں میں لہریں لے سکے، علماء نہ رہے کہ قرآن کے درس جاری رہتے، ——— گنتی کے چند دنوں میں ایک لمبا چوڑا علاقہ اس قوم سے پوری طرح

خالی ہو گیا جو چند سال سے نہیں، کئی صدیوں سے اسے اپنا وطن بنا چکی تھی اور جس کی کئی نسلوں نے مسلسل اس وطن کی خدمات انجام دی تھیں چنگیز و ہلاکو کے مظالم کی طویل کہانیاں یہاں چند روز میں سروں سے بیت گئیں، مسلمانان اسپین کی بربادی کی داستان یہاں دو چار ہفتوں میں تاریخ نے دہرا دی۔

یہ ساری قیمت ہم نے جس پاکستان کے لئے ادا کی ہے، سوال یہ ہے کہ خود اس کا مقصد وجود کیا ہے؟ —— کیا صرف یہ کہ اس میں نوکریاں بلا شرکت غیر سے مسلمانوں کی ہوں؟ کیا یہ کہ اس میں تجارت اور کمائی کے دوسرے ذرائع کا کلی اجارہ تنہا مسلمانوں کو حاصل ہو جائے؟ کیا اس لئے کہ اس میں قوم کو عیاشی کے سامان فراہم کرنے کے لئے کھلے مواقع حاصل ہوں؟ —— اگر فی الواقع ہم نے اتنی بڑی قیمت انہیں ادنیٰ مقاصد کے لئے ادا کی ہے تو ہم سے زیادہ احمق کوئی اور نہ ہو گا! یہ چند حقیر دنیوی فوائد ہی اگر ہمارا مطمح نظر تھے تو ان کا حصول تو تقسیم ہند کے بغیر بھی ممکن تھا۔ ہم بآسانی یہ کر سکتے تھے کہ غیر مسلم اکثریت کے ساتھ مل کر رہیں۔ اور جو تہذیب وہ ہم پر مسلط کرنا چاہے، اسے لپک کر قبول کر لیں، جس بولی کو وہ ہماری زبانوں اور ہونٹوں پر لانا چاہے اسے ہنستے مسکراتے اپنا لیں، جن شعائر و مراسم کو وہ ہمارے اندر دیکھنا چاہے، ان کا مظاہرہ شروع کر دیں، جس پالیسی کو وہ وضع کرے اس کی رکشا کھینچنے کے لئے قلی بن جائیں —— اور اس دنیا پرستی کی جدوجہد میں جس قدر بے غیرتی کی ضرورت ہو اور خودداری کو جتنا گرانا پڑے، اور ابن الوقتی کا جتنا مظاہرہ کرنا لازم محسوس ہو، اس کے لئے تیار ہو جائیں۔ آخر تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہی ہیں کہ بندگان اغراض نے لوگوں کی جوتیاں چاٹی ہیں، اپنے اصولوں کو بیچا ہے، اپنے نصب العین سے غداریاں کی ہیں، قوم فروشی

کو شیوہ بنایا ہے، اپنی خودی کو ذلیل کیا ہے اور پھر مزے سے خواہشات پوری کی ہیں۔ بس اگر جھگڑا چند اجتماعی دنیوی خواہشات ہی کا تھا تو ان کے لئے کسی سے تصادم کرنے کا، ایک الگ وطن مانگنے کا اور اتنی بڑی بڑی قربانیاں دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں خریدنے کے لئے سب سے بہتر سکّے "قدویت" "ابن الوقتی" "بے اصولی" اور "بے غیرتی" ہی کے ہیں۔ محض ان خواہشات کے لئے "ہم جداگانہ قوم ہیں" کا نعرہ لگانا فضول تھا۔ اور محض ان خواہشات کے لئے ایک الگ وطن مانگنا ایک لغو حرکت تھی!

پھر آخر پاکستان کا مقصد کیا تھا؟ اس سوال کے جواب میں صرف ایک ہی لفظ پیش کیا جا سکتا ہے ——— اسلام!

دنیا بھر کی غیر مسلم قوموں کے سامنے چونکہ اسلام کا اجتماعی نظام اپنے سارے کمالات کے ساتھ کرۂ ارضی پر کہیں موجود نہیں تھا، اور خود مسلمان چونکہ اسے اجتماعی حیثیت سے چھوڑے بیٹھے تھے، لہٰذا ان قوموں کے لئے اس کی کتابی روایتوں میں کوئی وجہ کشش نہ تھی، چنانچہ یہ مجبور ہوئیں کہ خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر اپنی سیاست و معیشت کے نظام چلائیں۔ چنانچہ انہوں نے رنگا رنگ نظام ایجاد کئے؛ لیکن ہر نظام ایک مصیبت ثابت ہوا اور یکے بعد دیگرے، پاپائیت، بادشاہیت، جمہوریت، آمریت، سرمایہ داری اور سوشلزم کے تجربوں نے اپنی اپنی آفتیں ڈھائیں۔ ان نظاموں کے تحت انسان نے انسان سے لڑنا سیکھا، انسان نے انسانوں کو لوٹنا اور کچلنا سیکھا۔ اور ان نظاموں کے بطن سے جنگوں اور انقلابوں کی ایک نسل ایسی چل نکلی ہے جس کا تسلسل رکنے میں نہیں آرہا۔

بدقسمتی سے مسلمان قومیں غیر مسلم قوموں کے سیاسی تسلط میں رہنے کے ساتھ ساتھ علمی،

فکری اور تہذیبی میدانوں میں بھی ان کی غلام ہو کے رہ گئیں اور انہوں نے بھی مشعل برداری حق کے منصب کو چھوڑ کر اور اسلام سے منحرف ہو کر ان قوموں کی تقلید میں ٹھوکریں کھانے کو ترقی اور کامیابی سمجھا اور اسلام کی رہنمائی سے دنیا بے نصیب رہ گئی۔

اب دنیا بھر کے تمام ممالک جن راہوں پر ہو لئے ہیں ان سے ان کا ہٹ کے اسلام کی رہنمائی کی طرف اس وقت تک پلٹنا ممکن نہیں رہا جب تک کہ اسلام کا نظام عمل میدان میں اپنی ساری دلکشیوں کے ساتھ نمودار نہ ہو جائے۔ اور کوئی ایک ملک یا قوم اسے کاملاً اپنا کے تعمیر حیات کا فریضہ ادا کرنے پر تیار نہ ہو۔

پاکستان چونکہ ایک نوخیز ملک، اور ایک نومولود حکومت ہے، اور اسے اپنے مستقبل کے لئے کسی اصول و نظام کو منتخب کرنے کا موقع درپیش ہے، اس لئے دنیا کی واحد امیدگاہ یہی سرزمین اور اسی کے باشندے ہیں۔ اگر اس وقت یہاں اسلام کے نظام اجتماعی کو برسرکار نہیں ہوتا ہے تو پھر نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں اور کب یہ صبح صادق طلوع ہو اور کتنی مدت انسانیت خون خرابوں میں نباہ ہوتی رہے۔

خوش قسمتی سے پاکستان میں یہ قومی خواہش موجود ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو اور یہاں انسانوں کے قانون نہ چلیں، بلکہ اللہ کا قانون رائج ہو۔ یہ دراصل نتیجہ ہے ان دینی سرگرمیوں کا جس کے سوتے ہماری قوم کے ماضی میں جاری رہے ہیں۔ اس ملک کی فضا میں مجدد الف ثانیؒ کا نعرہ توحید آج تک لہریں لے رہا ہے۔ اس ملک کی ہواؤں میں شاہ ولی اللہ کا پیغام آج بھی گھلا ہوا ہے۔ اسی ملک کی مٹی میں تحریک مجاہدین سرحد کے خون کی خوشبو آج بھی محسوس ہو رہی ہے اور اس ملک کے ذہنی ماحول میں اقبال کی کلیمی ضرب کے اثرات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ انہیں آثار دینی

کا یہ فیض ہے کہ اس دیس کے عوام اپنے دلوں میں یہ جذبۂ مقدس رکھتے ہیں کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو۔ غلامی کی ایک لمبی رات انہوں نے اسی تصور کے سہارے کاٹی ہے کہ عنقریب اسلام کی سحر رونما ہوگی۔

پس اب جبکہ ملک پر وہ انگریزی راج نہیں رہا جو نماز روزہ کی اجازت دیتا تھا اور نکاح و طلاق کی آزادی دیتا تھا مگر دین کے اجتماعی معاملات کو اسلامی بنیادوں پر قائم کرنے کی آزادی دینے میں چونکہ اس کی اپنی موت واقع ہو جاتی تھی، لہٰذا وہ سنگین کے ذریعہ دین کے بڑے بڑے تقاضوں کو پورا کرنے میں مانع رہا ——— اس راج کے ہوتے ہوئے ہم یہ عذر کیا کرتے تھے کہ جب انگریز سر پر موجود ہے تو دینی نظام کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے۔ مگر ۱۵ اگست ۴۷ء سے اس عذر کا خاتمہ ہو گیا۔ اب ہم بدیشی راج سے آزاد ہیں اور اپنے مستقبل کا فیصلہ آزادی سے کر سکتے ہیں۔ اگر فی الواقع ہم نے آزادی خدا اور رسول کی اطاعت کے لئے حاصل کی تھی تو اس اطاعت میں کوئی خارجی طاقت حائل نہیں رہی ہے، بلکہ اب ہمارے راستے میں کوئی حائل ہو سکتا ہے تو وہ صرف خود ہم ہی ہیں۔

دوسری طرف ایک غیر مسلم اکثریت کے غلبہ کا ایک عذر پایا جاتا تھا کہ جب تک ایک غیر قوم کی اکثریت ہمیں اقلیت بنائے ہوئے ہے، ہم دینی نظام نہیں چلا سکتے۔ لیکن پاکستان کے وجود میں آتے ہی اس عذر کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب پاکستان میں مسلمانوں کو اللہ تعالےٰ نے بھاری اکثریت دے دی ہے۔ خدا کے دین کو قائم کرنے میں جو جو طاقتیں حائل ہو سکتی تھیں، اللہ تعالےٰ نے راستے سے ہٹا کر ہم پر اپنی حجت تمام کر دی ہے۔ اور اب یہ آزادی اور اکثریت ہیں جو ہمارے لئے ایک نازک

آزمائش کا پیغام ہے کہ ہم اب اپنا فرض ادا کرتے ہیں یا نہیں؟

اس سلسلہ میں حالات و واقعات متعدد اچھے شگون ہمارے سامنے لا رہے ہیں، مثلاً پاکستان والوں نے اپنے نئے دیس کے لئے جو نام چنا ہے وہ خود یہ بتاتا ہے کہ ہماری قوم ناپاکیوں سے بچ کر پاکیزگی کی زندگی تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ پاکستان کے معنی ہی یہ ہیں کہ اب یہاں کے باشندے جن اصولوں پر زندگی بسر کریں گے، وہ پاک اصول ہوں گے، جو قانون یہاں رائج کئے جائیں گے وہ پاک قانون ہوں گے، جو اخلاق عوام اختیار کریں گے وہ پاک اخلاق ہوں گے، کمانے اور خرچ کرنے کے جو ڈھنگ یہاں چلیں گے وہ پاک ڈھنگ ہوں گے، جو تعلیم یہاں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جائے گی وہ پاک تعلیم ہوگی، جو صحافت یہاں کے اخبارات اختیار کریں گے، وہ پاک صحافت ہوگی، جو خیالات یہاں کے مقرر پیش کریں گے۔ وہ پاک خیالات ہوں گے۔ جو ادب یہاں کے ادیب تعمیر کریں گے وہ پاک ادب ہوگا، اور حکومت کا جو ڈھانچہ یہاں کھڑا کیا جائے گا وہ پاک ڈھانچہ ہوگا ——— اگر اس نام کی لاج رکھنے کا لوگوں میں کچھ بھی احساس ہو تو فی الواقع پاکستان کا نام ایک نیک شگون ہے۔

پھر یہ بات بھی ایک اچھا شگون ہے کہ پاکستان کے گورنر جنرل، پاکستان کے وزیر اعظم اور پاکستان کی سیاست کے دوسرے اہم رہنما، اخبارات کے مدیر، دنیائے ادب و شعر کے ذہین عناصر سب کے سب مسلسل یہی اعلان کر رہے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی قانون چلے گا، خدا کا راج ہوگا، قرآن کی حکومت ہوگی، نبی کے اسوہ کی پیروی کی جائے گی۔ اور سارا نقشہ اسلام کے منشا کے مطابق بنایا جائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس ملک کے عوام اسلامی حکومت کے

خواہشمند ہیں اور جب اس ملک کے خواص اپنے عوام کو مسلسل اطمینان دلا رہے ہیں کہ تسلی رکھو یہاں اسلام کے اصولوں پر حکومت ہوگی تو پھر اسلامی نظام کی راہ میں روک کیا رہ جاتی ہے۔ وہ کچھ روکیں ہر بڑے کام میں ہوتی ہیں اور اسلامی نظام کے قیام میں بھی ہیں۔ مگر قوم اگر عزم کرلے تو کوئی روک ایسی نہیں کہ اسے دور نہ کیا جا سکے۔

مثلاً اسلامی نظام کے قیام میں ایک روک یہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے سیاسی سربراہ کاروں کو اسلامی نظام کا اتنا علم حاصل نہ ہو جو اس کی تعمیر کے لئے ضروری ہے۔ لیکن یہ کوئی بڑی روک نہیں ہے، اگر ہمارے اکابر اسلامی نظام کے صدق دل سے آرزومند ہوں اور ان میں پورا پورا اخلاص موجود ہو اور کوئی ذاتی غرض اور جماعتی مفاد اور نفس پرستی دلوں میں موجود نہ ہو تو ایسے مواقع پر مقصد کی خاطر ذاتی اقتدار اور لیڈر شپ کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ اس قربانی پر اگر اکابر قوم تیار ہوں تو انشاء اللہ انہیں قوم کے اندر سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو اسلامی نظام کا علم بھی رکھتے ہوں اور اس مجتہدانہ بصیرت سے بھی مسلح ہوں جس کے بغیر موجودہ ماحول میں اسلامی نظام کی مشینری کو نصب کرنا اور چلانا مشکل ہے۔ یہ قربانی ایک تاریخی قربانی ہوگی جس پر آنے والی نسلیں تک فخر کریں گی کہ ہمارے پاکستان کے گورنر جنرل، وزراء اور بڑے بڑے ارباب کار نے اپنی مسندیں ذوق و شوق سے ان لوگوں کے لئے خالی کر دیں جو ایک دینی فریضہ ادا کرنے کی ان سے زیادہ صلاحیت رکھتے تھے۔ ہمارے موجودہ اکابر نے اب تک جو سیاسی آئینی جدوجہد کی ہے، اس کے واسطے فی الواقع وہی موزوں ترین لوگ تھے، لیکن اب جو مرحلہ درپیش ہے اس کے لئے اگر وہ یہ دیکھیں کہ ان سے بہتر صلاحیتیں رکھنے والے لوگ قوم کے پاس موجود ہیں تو ان کے اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان

کا ہاتھ پکڑ کر خود انہیں آگے لائیں اور ان سے درخواست کریں کہ ہم اپنا فرض ادا کر چکے اب آپ آگے آئیے اور اپنا فرض ادا کیجئے ــــــــ ہم سیاسی جنگ کے لئے اچھے جرنیل ثابت ہو سکتے تھے سو اسے ہم نے جیت لیا۔ اب تعمیری مہم درپیش ہے، اس میں آپ زیادہ کامیاب ثابت ہوں گے لہٰذا ہم پیچھے ہٹتے ہیں، آپ آگے آئیں۔

پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرتے ہوئے ہمارے بعض اکابر اس پہلو سے بھی ڈرتے ہیں کہ اگر اسلامی حکومت نے پاکستان میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کو ذمّی بنا کے رکھا تو وہ اسے گوارا نہیں کریں گے اور ادھر پڑوس کے ملک میں مسلمان اقلیت کے لئے حالات خراب ہو جائیں گے ــــــــ حالانکہ یہ خوف بھی محض خیالی ہے اور لوگوں کو معلوم نہیں کہ اسلام نے ذمیوں کے ساتھ کتنا احسان آمیز سلوک کرنے کا پروگرام ہمارے حوالے کیا ہے۔ مسلمانوں کی پستی کی انتہا ہے کہ اسلام کے قانون ذمّہ پر خود انہیں اعتماد نہیں ہے کہ یہ ایک نہایت ہی قابل قدر قانون ہے اور اس عدم اعتماد کی وجہ عدم علم ہے۔

دراصل "ذمّی" کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی ریاست میں جو لوگ ریاست کے اصول و مسلک سے اختلاف رکھتے ہوں، لیکن پرامن زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں، ریاست ان کے جان، مال، آبرو کی حفاظت کا ذمہ لے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک قابل قدر احسان ہے جو اسلامی ریاست اپنے اصول کے مخالفین سے روا رکھتی ہے اور موجودہ ملحد ریاستوں کی طرح انہیں ملک بدر کرنے اور کچلنے کی کوشش نہیں کرتی!

دنیا بھر میں ہر ریاست کو دو گروہوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ (۱) ایک وہ گروہ جو

اس کے اصول اور نظام کو صحیح تسلیم کرے اور اس کے بقا و استحکام میں پوری قوتوں سے شرکت کرنے پر تیار ہو۔ (۲) دوسرے وہ گروہ جو کسی ریاست کے نظام سے اصولاً اختلاف رکھتا ہو اور اس کے بقا و استحکام میں اپنے اصولی اختلاف کی وجہ سے حصہ لینے پر تیار نہ ہو۔ چنانچہ دنیا بھر کی ریاستیں ——— اور سو فیصدی جمہوری ریاستیں ——— اپنے اصولوں سے اختلاف کرنے والی کسی شخصیت یا پارٹی کا وجود گوارا نہیں کرتی ہیں اور انہیں کوئی منصب دینا تو کجا، اپنے حدود میں زندگی کا حق بھی نہیں دیتی ہیں، ایسی طاقتوں کے لئے ان کے پاس یا تو جیل کی کوٹھریاں ہیں یا تختۂ ہائے دار اور یا پھر جلا وطنی کے فرمان! اور بس۔

چنانچہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ میں اگر کوئی فرد یا جماعت جمہوریت کے بجائے نازی ازم پر ایمان رکھے تو اس کے لئے ان ممالک میں کتنی خوفناک بدسلوکیاں ایجاد کی جاتی ہیں۔ اسی طرح آپ روس کی حدود ریاست میں مخالفین اشتراکیت کے لئے امن و آبرو کی زندگی کا کوئی تصور نہیں کر سکتے۔ ریاست کے اصول سے عدم اتفاق کرنے والوں کو چھوڑیئے، جمہوریت کا نظام تو اتنا تنگ ظرف ہے کہ وہ اپنی حدود میں اپنے مومنین کے ان گروہوں کو بھی ذلیل کر کے رکھتا ہے جو محض اقلیت میں ہونے کے "مجرم" ہیں۔ جمہوریت کے سائے میں جو مختلف نسلیں، مذہبی گروہ، بندیاں اور لسانی جتھے یکجا رہتے ہوں، ان میں سے ریاست کا ادارہ اس گروہ کو سامنے لاتا ہے جو کثیر التعداد ہو اور قلیل التعداد گروہ کو کچل کر اور دبا کر رکھتا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں حبشیوں سے، اور ہٹلر کے جرمنی میں یہودیوں سے جو سلوک کیا جاتا رہا ہے، اسے دنیا جانتی ہے، اور یہ سلوک جمہوریت کے مساویانہ حقوق کے اعلانات کے علی الرغم ہوتا رہتا ہے۔

اب جمہوریت کی ان تنگ نظریوں کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اسلام ذمی رعایا سے کتنا عالی ظرفانہ سلوک کرتا ہے۔ جمہوری اصولوں کی رو سے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان گروہوں کو ملک بدر کردے جو اس کے نظام اجتماع کے اصولوں سے عدم اتفاق رکھتے ہوں، لیکن وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ ان کو حفاظت سے اپنے سایۂ شفقت میں لینے پر تیار ہے۔

ہمارے غیر مسلم بھائی اسلامی نظام حکومت سے محض اس لئے ڈرتے ہیں کہ انہیں اسلام کے حسن سلوک کا اندازہ نہیں ہے اور ان کے سامنے اب تک اُن مسلمانوں کی زندگیاں رہی ہیں جو اسلام سے منسوب تو ہیں مگر اسلام پر عمل پیرا نہیں، بلکہ مغربی الحاد سے متاثر ہو کر غیر اسلامی زندگی گذار رہے ہیں۔ انہی غیر اسلامی زندگیوں کے مناظر دیکھ دیکھ کر ہمارے غیر مسلم بھائی خوف زدہ ہوتے ہیں کہ اگر ایسے لوگوں کے تحت ذمی بن کے رہنا پڑے تو امن و آبرو کے حصول کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن وہ یقین کریں کہ مسلمان اکثریت کی جمہوری حکومت تو یقیناً ایسے ہی مناظر پر مشتمل رہے گی۔ اور اس کے تحت یقیناً امن و آبرو کے حصول کا کوئی امکان نہیں ہے، لیکن اگر حقیقی اسلامی حکومت یہاں نمودار ہو تو وہ بہر حال اپنے لئے ایسے کارکن منتخب کرے گی اور ایسے خدام ملک میں تیار کرے گی جن کے ہاتھوں میں جس طرح مسلمان قوم کا مفاد محفوظ ہو اسی طرح غیر مسلم قوموں کے مفاد بھی محفوظ ہوں۔ پس موجودہ مسلمان قوم کی اکثریت کی جمہوری حکومت کا تصور ذہنوں سے نکال کر سوچئے۔

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اسلام نے ذمیوں کے ساتھ جو سلوک تجویز کیا ہے اس کے مقابلہ میں اس سلوک کو ترجیح کیوں دی جاتی ہے جو جمہوری حکومت میں اکثریت

اقلیت سے روا رکھتی ہے۔ جمہوریت کا تجربہ تو ہندوؤں کو پاکستان میں اور مسلمانوں کو ہندوستان میں آزادی کے فوراً بعد ہو گیا ہے کہ دونوں کو اقلیت بن کر رہنا اپنے وطن میں محال ہو گیا۔ اور جانیں مال اور آبروئیں فسادات کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ پھر جینے کا ماحول اگر فراہم ہو بھی جائے تو ظاہر بات ہے کہ اس کے بعد بھی دونوں طرف اقلیتوں کے لئے آبرومندانہ مساوات حقوق کا مقام حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔ ایک طرف ہندو اکثریت کی حکومت مسلمانوں کو دبا کے رکھے گی، دوسری طرف مسلمان اکثریت کی حکومت ہندو اقلیت کو گرا کے رکھے گی۔ دونوں طرف اقلیت کو کسی اونچے مقام تک پہنچنے میں اکثریت کا اقتدار حائل نظر آئے گا، دونوں طرف ٹھیکوں اور ملازمتوں اور ممبریوں اور وزارتوں کے بٹوارے میں اکثریت اقلیت سے انصاف کرنے پر کبھی تیار نہ ہوگی۔ اس حال میں ان کاغذی اعلانات حقوق سے کیا حاصل جن کو حاصل کرنے کے لئے کوئی اقلیت بے قرار ہو۔

اسلام میں ذمیوں کی حیثیت اقلیت کی نہیں اور نہ اسلامی نظام میں اقلیت و اکثریت کی تقسیمیں ہوتی ہیں، بلکہ اسلامی نظام میں ذمی اجتماعی نظام سے اختلاف کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے جمہوریت کے سے ظالمانہ سلوک کے بجائے اسلام بہت ہی مربیانہ سلوک تجویز کرتا ہے۔ اس کا معاملہ چونکہ کھرا ہے اور وہ قول و فعل کا تضاد گوارا نہیں کرتا، اس لئے یہ بات تو صاف صاف طے کر دیتا ہے کہ میرے نظام میں اقتدار کی حصہ داری صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو میرے نقطہ نظر کے اصولوں سے اتفاق کرتے ہوں اور ان کو غالب رکھنے میں پوری پوری جد وجہد کرنے پر تیار ہوں۔ البتہ وہ اپنے اصولوں سے عدم اتفاق کرنے والوں کو جینے کا پورا پورا

حق دیتا ہے اور ان کی فلاح و بہبود کے سامان بھی کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ کاغذ پر لکھے ہوئے سیاسی حقوق کی ایک ایسی دل خوش کن فہرست دے دے جس پر عملاً اسے کچھ نہ کرنا ہو، اور رواداری کے مظاہرہ کے لئے اپنی ہیئت انتظامیہ میں خود ہی چند نشستیں دے کر پھر خود ہی ان نشستوں پر منتخب ہونے والوں کو اپنی اکثریت کے دباؤ سے نظام زندگی پر کوئی اثر ڈالنے سے روکے رکھے۔ بلکہ اس معاملہ میں وہ صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ میرے قانون و انتظام میں صرف ان لوگوں کے لئے جگہ ہے جو مجھے برحق تسلیم کریں۔ البتہ میرے مقبوضہ ملک میں پُرامن زندگی بسر کرنے کی اجازت ہر اس انسان کو ہے جو میرے نظام کو درہم برہم کرنے کی سعی نہ کرے اور اسلامی معاشرہ کے خلاف بغاوت برپا نہ کرے۔ اس ایک پہلو میں وہ غیر مسلموں کو کوئی حق نہیں دیتا، لیکن اس کے سوا اور پہلوؤں میں جتنے مناسب و متوازن حقوق وہ غیر مسلم عناصر کو دیتا ہے، اتنے کوئی جمہوریت بھی نہیں دے سکتی اور دیتی ہے تو صرف صفحۂ قرطاس پر دیتی ہے، میدان عمل میں نہیں دیتی۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور واضح طور پر ہمارے سامنے ہیں!

۱۔ ہر ذمی کو اپنے مذہب کے اصولوں پر اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرنے کا حق ہے۔

۲۔ ہر ذمی کو اپنی زندگی کی معاشرتی تقاریب میں اپنی مخصوص رسوم کی بجا آوری کی عام اجازت ہے۔

۳۔ ہر ذمی کو اپنے معاشرتی مسائل میں اپنے پرسنل لا کے تحت مسلمان عدالتوں سے فیصلہ چاہنے کا حق ہے۔ بلکہ ضرورت ہو تو ذمیوں کے لئے ایسی عدالتیں قائم کی جا سکتی ہیں جن میں خود ان کے ہم مذہب لوگ جج ہوں ——— البتہ ملکی قانون (دیوانی فوجداری)

اسلام ہی کا ہوگا اور جہاں ان کا پرسنل لا اس سے متصادم ہو وہاں ملکی قانون کو ترجیح حاصل ہوگی۔

۴۔ ذمیوں کے منتخب نمائندوں کی ایک مستقل کونسل اسلامی نظام کے تحت اس غرض کے لئے مقرر کی جاسکتی ہے کہ وہ ان کی تعلیمی اور معاشرتی بہبود کے لئے مختلف تجاویز سوچے اور قوانین بنانے کی سفارشات کرے اور اسلامی شوریٰ ان تجاویز اور قوانین کو نافذ کرے گی، الا یہ کہ وہ اسلام کے ملکی قانون اور اخلاقی نظام سے متصادم ہوتے ہوں۔

۵۔ اسلامی ریاست ہر ذمی کی ابتدائی ضروریات پورا کرنے کی ذمہ دار ہوگی، اگر وہ بطور خود محنت کر کے انہیں پورا کرنے پر قادر نہ ہو۔

۶۔ اسلامی ریاست کے رفاہ عام کے تمام ادارات سے ذمیوں کو بھی استفادہ کرنے کا ویسا ہی حق ہوگا جیسا مسلم رعایا کو ہوگا۔

۷۔ اسلامی ریاست کے تحت جو ذمی قانونِ ذمہ کے تحت آباد ہوگا اس کی جان و مال اور آبرو کی پوری حفاظت کی ذمہ داری اس پر عاید ہوگی۔ اور اس ریاست کی حدود سے باہر کے مسلمانوں پر ذمیوں کے ہم قوم یا ہم مذہب لوگ چاہے کیسے ہی ظلم ڈھا رہے ہوں لیکن اسلامی ریاست اپنے ہاں کے ذمیوں پر کوئی ظلم نہ ہونے دے گی۔

۸۔ ذمیوں کو اسلامی ریاست کی ہر کارگذاری پر تنقید کرنے کا ویسا ہی حق حاصل ہوگا جیسا کسی مسلمان کو حاصل ہوگا۔ وہ اسلام کے اصولوں پر تنقید کرنے کے اور اپنے اصول و مسلک کی تبلیغ کرنے کے مجاز ہوں گے۔

۹۔ اسلامی ریاست ذمیوں کو بھی مختلف قسم کے اخلاقی مفاسد سے بچانے کی سعی کرے گی۔ اور ان کی تربیت کی کوشش جاری رکھے گی۔

۱۰۔ اسلامی ریاست اگرچہ اپنی شوریٰ کی رکنیت اور انتظامیہ اور عدلیہ محکموں کے کلیدی مناصب ذمیوں کو نہیں دے سکتی، لیکن ان خاص مناصب کے علاوہ وہ اپنے مختلف شعبہ ہائے کار میں ذمیوں کی خدمات بالمعاوضہ لے سکتی ہے۔

۱۱۔ اسلامی حکومت پوری سعی کرے گی کہ ذمیوں کو مسلمان اکثریت کی ذہنی مرعوبیت اور غلامی سے بچائے اور ان کی اندھی تقلید میں مبتلا نہ ہونے دے ———!

اسلام کا معاملہ چونکہ کھرا ہے اور اسے جو کچھ کرنا ہے، اتنا ہی کہنا ہے، اس لئے اگرچہ یہ حقوق بظاہر کم معلوم ہوتے ہیں، لیکن چونکہ ان کی پوری مقدار عملاً ادا ہوتی ہے، لہٰذا یہ جمہوریت کے ان حقوق ناموں سے زیادہ قیمتی ہیں جو محض اعلان کے لئے ہوتے ہیں، عمل کے لئے نہیں ہوتے۔ فی الواقع اگر ہمارے غیر مسلم بھائی اسلام کے ان حقوق کو جمہوریت کے عملی حقوق کے مقابلہ میں وزن کرکے دیکھیں تو وہ یقیناً اسلام کے عملی حقوق کو ترجیح دیں گے۔

یہ اندیشہ کہ پاکستان میں غیر مسلموں کو یہ حقوق دینے سے ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق بھی اس حد میں سمٹ جائیں گے، اگرچہ صحیح ہے، لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس سے مسلمان خسارے میں نہیں رہیں گے جمہوری نظام میں انہیں انڈین اسمبلی میں جو چند نشستیں مل سکتی ہیں اور جو چند ملازمتیں وہ حاصل کرسکتے ہیں، شاید وہ انہیں حاصل نہ ہوسکیں۔ لیکن ان کو حاصل کرکے بھی وہ ہندوستان کے نظام زندگی پر کوئی اہم اثر نہیں ڈال سکتے، بلکہ ایک بے بس اقلیت کی حیثیت میں ان کی یہ ممبریاں اور ملازمتیں بھی اکثریت کے گھیرے میں رہیں گی۔ البتہ ان ممبریوں اور ملازمتوں سے محروم ہوکر وہ اگر اپنے اندر اصول و اخلاق کی قوت پیدا کرکے سوسائٹی کو متاثر کرنا شروع کریں

تو شاید ایک دن وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود اکثریت پر چھا کے رہیں گے ــــــ خصوصاً اس حال میں جبکہ پاکستان غیر مسلم عناصر سے حقیقی اسلامی معیار پر حسن سلوک کر کے ان کے دلوں اور دماغوں کو متاثر کر رہا ہوگا۔ اور ہندوستان کی ہندو اکثریت کو بھی اخلاقی پہلو سے جیت رہا ہوگا۔

بہر حال ذمیوں کے معاملہ میں اسلام کا جو عادلانہ نظام کتاب و سنت سے اخذ ہوتا ہے، اس کے متعلق اگر خود مسلمان ہی شبہ میں مبتلا نہ ہوں، اور وہ پورے مومنانہ وثوق کے ساتھ اس کے ٹھوس پن کو اجاگر کریں تو غیر مسلم حضرات غلط فہمیاں رفع ہونے کے بعد دل سے دعائیں کریں گے کہ پاکستان میں سچے مسلمانوں کے ہاتھوں اسلام کا نظام قائم ہو اور وہ اس کے تحت جمہوریت کے مقابلے میں زیادہ امن و آسائش پائیں گے۔ درحقیقت اسلام کے قانون ذمہ کا ذرہ برابر پاس بھی پاکستان کے اکابر و عوام کو ہوتا تو مشرقی پنجاب کے سارے خونی ڈرامے کے واقع ہونے کے باوجود پاکستان کے کسی غیر مسلم کی جان مال آبرو پر کوئی زیادتی نہ کی گئی ہوتی اور اس اخلاقی رویہ کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے باضمیر لوگوں کی رائے عام جیت لی جا سکتی تھی بلکہ پاکستان شاید ہمیشہ کے لئے بین الاقوامی ہمدردیاں حاصل کر لیتا لیکن ایک قیمتی موقع ضائع کر دیا گیا۔ تاہم اگر اسلام کے قانون ذمہ کو اوہام کا لحاظ کئے بغیر اب بھی صدق دلی سے نافذ کیا جائے تو انشاء اللہ اس سے ہندوستان پر نہایت اچھا اثر پڑے گا۔ اور وہاں کے مسلمانوں کے لئے بہتر حالات پیدا ہو جائیں گے۔

اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں، ایک خیالی ہوّا ان لوگوں نے حائل کر دیا ہے جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اسلامی حکومت ملّا راج کا دوسرا نام ہے۔ اور ملّا راج سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ آج سے صدیوں پہلے کے نمونے کے کچھ لوگ نہ معلوم کن جنگلوں اور غاروں سے تلاش کر کے لائے جائیں گے یا کچھ بوسیدہ قبروں سے برآمد کئے جائیں گے اور ان کو آج کی دنیا کی ایک سلطنت سونپ دی جائے گی۔ ان خیالی لوگوں کے ذہنوں میں کچھ اس طرح کا تصور ہے کہ پاکستان ایسے ملاؤں کے حوالے کر دیا جائے گا جن کو نہ لباس پہننے کا سلیقہ ہوگا، نہ کھانا کھانے کے ڈھنگ آتے ہوں گے، نہ بات چیت کرنے کا ذوق رکھتے ہوں گے، صفائی اور طہارت انہیں چھو بھی نہ گئی ہوگی، نفاست مزاج سے انہیں دور کا لگاؤ بھی نہ ہوگا، ان کے بال الجھے ہوئے ہوں گے، ان کی ڈاڑھیاں پریشان ہوں گی، ان کو یہ تک نہ معلوم ہوگا کہ زمین آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے، وہ کوڑے لئے گلی گلی پھریں گے اور لوگوں سے دن رات نمازیں پڑھاتے رہیں گے، جو غیر مسلم ان کے سامنے آئے گا اسے کہیں گے کہ پڑھ کلمہ ورنہ تلوار چلتی ہے، انہیں نہ دنیا کی سیاست کی خبر ہوگی، نہ معیشت و معاشرت کے جدید مسائل سے واسطہ ہوگا، بس تسبیحیں لئے وظیفے کرتے رہیں گے اور رات دن لوگوں کو فتوے دیتے رہیں گے ——— وغیرہ!

یہ تصویر کلیسیا کے نظام پاپائیت سے اخذ کی گئی ہے اور اسلامی نظام کو اسی کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش بعض اصحاب کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ حالانکہ اسلام کو اس تصور مسلمانی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ اپنے لئے جو کارکن چاہتا ہے انہیں وہ ماضی کی قبروں سے نکلوا کے نہیں لائے گا۔ بلکہ حال ہی کے انتہائی روشن

دماغ لوگ اس کی کل چلانے والے ہوں گے۔ اور ہم آپ ہی وہ کارکن ہیں جو اس کو عملاً نافذ کرنے کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ اسلام اپنے کارکنوں سے زیادہ سے زیادہ روشن دماغی، زیادہ سے زیادہ قوتِ ایجاد واجتہاد، زیادہ سے زیادہ سائنس کی واقفیت، زیادہ سے زیادہ صنعتی مہارت، زیادہ سے زیادہ معاشی قابلیت چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ تو ہر شخص سے یہ ہے کہ وہ اپنی دماغی جسمانی اور اخلاقی قوتوں کو انتہائی جلا دے۔ اور ان کو پورے کا پورا استعمال کرے۔ اگر کسی نے اس معاملے میں کوتاہی کی تو اس کو خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔ اس سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے اسلام کے استحکام کے لئے کیا اپنی علمی قابلیتوں کو تکمیل دی تھی؟ کیا تم نے جدید ترین وسائل کار حق کے فروغ اور نظام حق کے بقا کے لئے استعمال کئے تھے؟ کیا تم نے اپنے ملک کی معاشی ترقی کو انتہائی درجہ تک پہنچانے کے لئے خون پسینہ ایک کیا تھا؟ ——— اسلام اپنے ہر فرد کو اس سوال کے جواب کے لئے بہترین کارگذاریاں انجام دینے کی ہدایت کرتا ہے۔

پھر یہ بات بھی "ملاازم" کے تصورات میں شامل ہے کہ اسلامی حکومت گویا کئی صدیاں پہلے کی حالت پر منجمد کر کے قائم کر دی جائے گی اور حالات کے تغیر وتبدل سے وہ آنکھیں بند کر کے کام کرے گی۔ شاید وہ موٹروں کی جگہ اونٹوں سے کام لے، شاید وہ جدید غذاؤں کی جگہ کھجوروں اور ستوؤں پر زندگی بسر کرانا چاہے، شاید وہ ایٹم بم کی جگہ تیر کمانوں کو استعمال کرے، لیکن اسلام جہاں اپنے اساسی اصولوں کے لحاظ سے دنیا کا قدیم ترین مسلک ہے وہاں اجتہاد وارتقاء کے لحاظ سے وہ ہر زمانے کے لئے جدید ترین نظام ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی قدیم معنوی روح کے لئے ہر دور میں بہتر سے

بہتر قالب اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنے اصولوں کو غالب کرنے کے لئے ہر زمانے کے جدید ترین وسائل سے کام لیتا ہے۔ اور وہ ہر عہد کی مشکلات کے نئے سے نئے حل سامنے لاتا ہے۔ پس ملا راج کا تخیل کچھ لوگوں کا خود ساختہ ذہنی ہوا ہے ــــ ــــ اس ہوّے سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔

امر واقعہ یہ نہیں ہے کہ اسلام "ملاؤں" کو مسجدوں اور مدرسوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر آگے لانا چاہتا ہے اور انجینیرنگ، ڈاکٹری تصنیف وتالیف، صحافت، قانون سازی، ججی، سپہ سالاری، مدرسی وغیرہ تمام شعبے ان ملاؤں کے سپرد کر دینا چاہتا ہے، خواہ ان کو کسی منصب سے تعلق رکھنے والا فن آتا ہو یا نہ آتا ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام مختلف علوم وفنون کے انہی ماہرین کو اپنے نظام کی ساری مشین سونپنا چاہتا ہے۔ جو آج ہمارے اندر پائے جاتے ہیں۔ بس وہ ان میں سے اپنی ضرورت کے کارکن انتخاب کرتے ہوئے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اس کے اصولوں پر فی الواقع ایمان رکھتا ہے، کون اس کی حقیقی وفاداری کا جذبہ رکھتا ہے، کون دیانت داری سے اس کی پیروی کرتا ہے اور کون اس کو غالب کرنا چاہتا ہے ــــ پھر جو جو کوئی اس صفت کے ساتھ اسے ہاتھ لگے گا اسے وہ اپنے استعمال میں لائے گا۔ اور اس کے پاس امارت کے لئے، گورنری کے لئے، ججی کے لئے، سپہ سالاری کے لئے، بحری فوجی کے لئے، انجینیرنگ کے لئے، صحافت کے لئے، تصنیف وتعلیم کے لئے، اور دوسرے مختلف کاموں کے لئے وقت کے بہترین ماہرین پوری معلومات سے مسلح موجود ہوں گے! یہ نہیں ہوگا کہ جس جس کے چہرے پر داڑھی موجود ہو اور جو جو شخص نماز پڑھتا ہو وہ محض ان دو صفات کی وجہ سے اس کے نازک ذمہ داریوں کے منصب

پر فائز ہوتا چلا جائے۔ چنانچہ اس وقت اسلامی نظام کے قیام کی باقاعدہ تحریک جو لوگ چلا رہے ہیں ان میں سے کوئی بھی "ملا" کے اس خیالی ہوّے کے مطابق نہیں ہے جس کا پرچار کیا جا رہا ہے، بلکہ لکھے پڑھے لوگ جو سنجیدہ فکر رکھتے ہیں، علوم و فنون میں مہارت رکھتے ہیں، اعلیٰ ذوق سے مسلح ہیں، خوش پوش ہیں، نفاستِ مزاج سے متصف ہیں، جدید تعلیم سے بہرہ یاب ہیں، دنیا کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں، بین الاقوامی سیاست کو سمجھتے ہیں، ذہانت و اجتہاد کی خوبیاں رکھتے ہیں، اور اعلیٰ درجہ کی سیرت سے بہرہ ور ہیں ـــــ اسلامی نظام کے قیام کے لئے سرگرم سعی ہیں، ان میں ڈاکٹر، انجینیر، فلسفی، مصنف، ادیب، شاعر، مقرر، لیڈر، زمیندار، کارخانہ دار، تاجر، پروفیسر، وکیل، مولوی، اخبار نویس، سیاست دان، علمائے معاشیات، اور نفسیات کے رازداں شامل ہیں۔ اگر یہ سب ملا ہیں تو پھر اس دنیا کا کونسا فرد ایسا ہے جو ملا نہیں ہے۔

وہ حضرات جنہوں نے "ملا راج" کے خیالی ہوّے کو اسلامی حکومت کے راستے میں خود حائل کر دیا ہے، ان سے ہم یہ درخواست کریں گے کہ اسلام کو سمجھیں، اس کے مطالبات اور تقاضوں کا صحیح شعور حاصل کریں، پھر انشاء اللہ یہ ہوّا خود بخود راستے سے ہٹ جائے گا۔

ایک اور رکاوٹ جو اسلامی نظام کے قیام کے راستے میں رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کے اکابر اور قوم کے سربراہ کاروں کے اندر کچھ عناصر ایسے بھی موجود ہیں جو قوم کے ڈر سے اسلام کا نام تو لیتے رہتے ہیں اور اسلامی حکومت کے

نعرے تو بلند کرتے رہتے ہیں، لیکن ان کے دل میں اسلام کے اصولوں کی اور اس کے نظام کی کچھ وقعت باقی نہیں ہے۔ بلکہ یہ حضرات امریکہ یا روس کے غیر اسلامی نظاموں پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ ان کی پوری کوشش یہ ہے کہ کسی طرح عوام کو اس پر راضی کیا جائے کہ اسلام کے نام سے وہ نظام حکومت ملک میں قائم ہو جائے جو انہیں پسند ہے، چنانچہ ان کی کوشش یہ ہے کہ حکومت پاکستان کی طرف سے کبھی یہ اقرار نہ ہونے پائے کہ یہاں خالص اسلامی نظام زندگی قائم کیا جائے گا۔ اور حکومت پاکستان خدا اور رسول کے احکام کی پابند ہوگی، بلکہ اس کے بجائے یہ لوگ اس حکومت کو لادین حکومت کے نام سے آغاز کرنا چاہتے ہیں اور اس خطرناک جسارت کو انجام دینے کے لئے یہ عوام فریبی بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ حکومت کے بعض امور میں نمائشی اسلامیت کا رنگ بھر کر قوم کو مطمئن کر دیں کہ تو اسلامی نظام بن گیا

پھر انہیں لوگوں کے اندر وہ بھی ہیں جن کا مذہب صرف روپیہ ہے، جن کا دین محض اغراض پرستی ہے، جن کا مقصد حیات صرف عیاشی ہے اور ان کو اسلامی نظام کے قیام سے یہ خطرہ لاحق ہے کہ اگر یہ واقع ہو گیا تو پھر زندگی کے جن نزار عیاشی پر خزاں چھا جائے گی۔ پھر عوام کی کمائیاں چھینی نہ جا سکیں گی، پھر رشوتوں کا مینہ نہ برسے گا، پھر عہدوں اور بھاری تنخواہوں کی باران کرم نہ نازل ہو سکے گی۔ پھر شراب خانوں میں مئے سرخ کے دور نہ چلیں گے، پھر قوم کی مظلوم عورتوں کی عصمتوں سے نہ کھیلا جا سکے گا، پھر ناچ گھروں کی لذتیں نہ سمیٹی جا سکیں گی، پھر سینماؤں کے عریاں مناظر کے خزانے نہ لوٹے جا سکیں گے ——— ان اغراض پرستوں کا گروہ اپنی نفسانیت پر اسلام کو ساری قوم کو اور قوم کے مجموعی مفاد کو بھینٹ چڑھا دینا چاہتا ہے۔ اور

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے قیام میں اصل رکاوٹ یہی طبقہ ہے۔ یہ رہزنوں کا غول اگر حق کی راہ نہ گھیرے بیٹھا ہو تو منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں سے اس قوم کو نجات کیونکر ہو سکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ قوم اگر اپنا مقصود اسلام کو قطعی طور پر بنائے اور پھر اس کی طرف اقدام شروع کر دے اور اپنے راستے میں حائل ہونے والی طاقتوں سے کسی قسم کی رعایت روا رکھنے سے انکار کر دے تو اس غول بیابانی کو شکست دی جا سکتی ہے۔ یہ غول اپنے آپ کو دیر تک کمین گاہوں میں چھپا نہیں سکتا۔ اس کے بیانات، اس کے اعلانات؛ اس کے اعمال، اس کے افعال، اس کے فیصلے، اس کے جوڑ توڑ خود بول بول کر اس کی نشاندہی کر رہے ہیں اور آئندہ اور زیادہ وضاحت سے کریں گے۔ پھر اگر قوم چاہے تو ان کو راستے سے ہٹا سکتی ہے۔ اب ہمارے بیدار دل عوام کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اکابر کے افکار و اعمال کو ٹٹولنا شروع کریں، وہ ان کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھیں، وہ ان کے اخلاق کو ماپیں اور تولیں، پھر جس جس میں نفس پرستی کے آثار دکھائی دیں، اس کو آگے بڑھانے کے بجائے بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹائے اور کسی ایسے شخص کو کبھی ووٹ نہ دے، کبھی اس کی دعوت پر کان نہ دھرے، کبھی اس کی اسکیموں کو اپنے لئے مفید نہ سمجھے۔ جب اس طرح کا ناقدانہ رویہ اختیار کیا جائے گا۔ تو آہستہ آہستہ ردی مال چھنٹ کے الگ ہو جائے گا اور کھرا مال آگے ہوتا جائے گا۔ وہ لوگ جو اسلام کی پیشقدمی کو روکنا چاہتے ہیں وہ مسلمان قوم کے اندرونی دشمن ہیں اور انہیں گوارا نہیں کیا جا سکتا اب سے پہلے قوم غلام تھی تو طرح طرح کے لوگ اس پر مسلط رہتے تھے۔ لیکن اب یہ قوم آزاد ہے

اور اب کسی نااہل کو یہ اپنے کندھوں پر سوار نہ ہونے دے گی پس غیر اسلامی نظاموں پر ایمان رکھنے والوں سے بھی اور نفس پرستی اور عیاشی کے غلاموں سے بھی اب مسلسل یہ مطالبہ ہونا چاہئے کہ تم لوگ صاف صاف اعلان کرو کہ تم خود بھی اسلام پر چلو گے اور حکومت کو بھی اسلام کے خطوط پر چلاؤ گے، پھر جو جو لوگ یہ عہد کریں ان کو عملاً عہد پورا کرنے پر مجبور کیا جائے گا اور جو لوگ اس عہد سے کترائیں یا اس پر عمل کرنے سے فرار کریں ان کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ اسلام کا راستہ روکنے والے لوگ ہیں، اور قوم کا فرض ہے کہ وہ بھی ایسے لوگوں کا راستہ روک کے کھڑی ہو جائے! مگر ان اقتدار یافتہ لوگوں کا راستہ روکنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اسلام کے سچے طلبگار دینی اصولوں پر اپنے آپ کو منظم کریں اور پوری تنظیم کے ساتھ ان لوگوں کی منظم سرگرمیوں کو شکست دیں۔

خدا ہم سب مسلمانوں کو اقامت دین کی توفیق دے اور اپنی پوری قوتوں سے اسلام کے نظام عدل کو اس کی اصلی شکل میں زمین پر نافذ کرنے کی ہمت عطا کرے!

آمین!

پاکستان میں اسلامی نظام

(مادّی نقطۂ نظر سے!)

[یہ مقالہ ۲۹ فروری ۱۹۴۸ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں اسلامیہ کالج کے سیمینار میں پڑھا گیا۔ افادۂ عام کے لئے اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔]

(ادارہ)

محترم حاضرین و عزیز طلباء!

کسی ایسے مسلمان کے متعلق جو اسلام کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر ایمان لایا ہو، یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسلام کو یا اس کے اصول و قوانین کو مادّی افادیت کی ترازو میں تولے گا۔ اس کے لئے اسلام ذاتی، خاندانی یا قومی فائدے کے لئے قابل اتباع نہیں ہے، وہ اس کو اپنی انفرادی یا اجتماعی خواہشوں کے مطابق پا کر قبول نہیں کرتا وہ اسے ایک سوداگر کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ اسلام کو ایک طبعی ڈیوٹی

اور ایک فطری فرض اور ایک پیدائشی ذمہ داری کی حیثیت سے اختیار کرتا ہے وہ اسے اپنے مالک اور خالق اور رازق کے بنائے ہوئے ضابطہ کی حیثیت سے پیش نظر رکھتا ہے ——— اور جب ایک مرتبہ اس کی عقل اور اس کے جذبات اور اس کی خواہشات اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہیں تو پھر کسی فائدے کا لالچ اور کسی نقصان کا خوف اسے اس پروگرام سے اِدھر اُدھر نہیں لے جا سکتا۔ لیکن اِدھر انگریزی نظام زندگی کے زیر اثر دو صدیاں گذارنے اور انگریزی حکومت کی چھاتیوں سے دودھ پی پی کر پرورش پانے کی وجہ سے ہمارے ہاں مسلمانوں کی وہ قسم بہت بڑی تعداد میں نمودار ہو چکی ہے جو مسلمان بھی کہلانا چاہتی ہے اور اسلام کو مادیت کے کافرانہ زاویۂ نظر سے ناپنا تولنا چاہتی ہے اور اسے شخصی اور قومی نفع و نقصان کو تولنے کی جو ترازو یورپ سے حاصل ہوئی ہے وہ اسی سے اسلام کے اخراجی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کی عادی ہو گئی ہے۔ اسلام کو اس قسم کی کسی ترازو سے تولنے کا حق غیر مسلم حضرات کو تو بہرحال حاصل ہے، مسلمان کسی طرح اس کے مستحق نہیں تھے، لیکن اگر ہمارے یہ نرالے مسلمان ناپ تول کے اسی پیمانے کو استعمال کرنے پر بضد ہوں تو اسلام بہرحال اپنے آپ کو ہر کسوٹی پر پرکھے جانے، ہر ترازو پر تلنے اور ہر پیمانے سے ناپے جانے کے لئے پیش کرتا ہے۔ وہ ہر جگہ میں کھرا نکلے گا اور ہر ترازو میں وزنی ثابت ہوگا۔

یہاں اسلام کے اصول و عقائد .... اور اس کے احکام و قوانین کو الگ الگ کر کے ان کے مادی فوائد کا اندازہ پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس خطاب میں پیش نظر صرف یہ بیان کرنا ہے کہ پاکستان کی نو خیز سلطنت کے مستقبل پر جو لوگ مادی افادیت کے لحاظ سے غور کرتے ہیں، وہ اگر اپنے مخصوص معیار

پر ہی اسلام کو پرکھ کر دیکھیں تو انہیں اندازہ ہوگا کہ اسلام جو قوت و استقلال ان کی قوم اور ان کے ملک کو دے سکتا ہے، وہ دنیا کے کسی اور نظام سے حاصل ہونے کی چیز نہیں ہے۔ اپنے اس بیان سے میں ان کے اندر اس بات کی تحریک کرنا چاہتا ہوں کہ وہ دیانت داری سے اپنے ملک اور اپنی قوم کے نفع و نقصان کی ترازو ہاتھ میں لیں اور پوری راست بازی سے اسلام کے نظام کو اس پر تولیں اور پھر اگر اس کی گراں بہا قدر و قیمت ان پر واضح ہو جائے تو کامل خلوص کے ساتھ اپنے سارے تعصبات، اپنے سارے معتقدات، اپنے پسندیدہ فلسفوں، اپنے محبوب نظریوں کی گرہیں ختم کر دیں۔ اور پوری قوت کے ساتھ اس کی بنا رکھنے کی مہم میں شریک ہو جائیں۔

اب میں ترتیب وار ان مفید مادی نتائج کا تذکرہ کرتا ہوں جو اسلام کو نظام سیاست و تمدن کے طور پر قبول کرنے سے پاکستان میں نمودار ہو سکتے ہیں اور ضمناً یہ بھی عرض کروں گا کہ اس سے انحراف کرنے سے کون سے مضر اثرات ہماری اجتماعی قوت پر پڑیں گے تاکہ آپ صحیح موازنہ کر سکیں۔

پہلی چیز جو پاکستان کے مستقبل کی تعمیر میں ملحوظ رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کے مسلمان باشندوں کو ایک سلطنت چلانے کے لئے بہرحال ایک اجتماعی شعور کی ضرورت ہے، یعنی ان کے اندر یہ احساس پرورش پانا چاہئے کہ وہ ایک مستقل قوم ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم مسلمانوں میں آج تک قومی شعور جس درجہ میں بھی پایا گیا ہے، وہ اسلامیت ہی کے احساس کا نتیجہ تھا۔ یہی احساس ہمیں جوڑنے والا تھا، اسی احساس کے تحت ہمارے اندر یکجہتی پیدا ہوتی رہی ہے اور اسی میں جب کبھی کمزوری آتی ہے، ہمارے اندر انفرادیت پسندی اور طوائف الملوکی

کے رجحانات نے انتشار پیدا کیا ہے۔ ہماری قومی وحدت ہمیشہ اسلامی عقائد و اخلاق کی مرہون منت رہی ہے۔ ہمارا اجتماعی نظام ہمیشہ اسلامی تاریخ کی گراں قدر روایات کی تحریک سے ابھرا ہے اور ہمارے لئے احساس قومیت کے وہ محرکات بالکل بے اثر ہیں جو دوسری قوموں میں انتہائی شدت سے اپنے نتائج دکھاتے ہیں چنانچہ آپ کو اس کا تجربہ ہوگا کہ چند سال پہلے کانگریس نے کتنے زور سے وطنی قومیت کی تحریک کو مسلمانوں میں چلانے کی کوشش کی تھی، اس کے لئے کتنی ہی مختلف تدابیر اختیار کی گئیں اور کتنی ہی بڑی بڑی شخصیتیں استعمال کی گئیں، حتیٰ کہ کانگریس کو حکومت کے اقتدار سے جو حصہ ملتا رہا ہے، اس کو بھی اس نے مسلمانوں کے دینی تصور قومیت کو کمزور کرنے اور ان میں وطنی قومیت کے تصور کو ابھارنے کے لئے استعمال کیا، کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں نے اس مہم میں زور قلم صرف کیا، کتنے ہی لیڈروں اور مقرروں نے خطابت کی قوت کو اس مقصد کے لئے جھونک دیا، لیکن یہ ساری کوششیں ناکام ہوگئیں۔ پھر آپ کو اس کا بھی تجربہ ہے کہ مسلم لیگ نے جب اپنے پروگرام کی طرف مسلمانوں کو بلانا چاہا اور ان کو مجتمع کرنے کے لئے قومی شعور کو ان کے اندر ابھارنے کی ضرورت پیش آئی تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ مسلمانوں کی دینی حس اور عقیدہ کی وحدت کو اکسایا جائے۔ چنانچہ اس طریقہ کو اختیار کرنے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنے گرد سمیٹ سکی۔ ان دو تازہ تجربات ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے اندر قومی شعور اسلام ہی کے شعور سے ابھرتا ہے۔ اور ان کے مزاج ایسے بن گئے ہیں کہ ان میں اجتماعی ولولہ دین ہی کے ذریعے نمودار ہو سکتا ہے۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد یقیناً ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام پاکستان کے مسلمانوں میں قومی جذبہ کو تیزی سے ابھار دے گا۔ اور پریس کی قوت، اسٹیج کی قوت، تعلیم کی قوت، لٹریچر کی قوت، اور دوسری ساری قوتیں اسلامی حکومت کے تحت ہم آہنگ ہو کر دینی قومیت کے احساس کی تکمیل کریں گی اور دیکھتے دیکھتے یہ ملک دنیا کی ایک عظیم طاقت کا گہوارہ بن جائے گا۔ ہمارے عوام میں ایک اخوت ابھرے گی، ہمارے اونچے اور نیچے طبقوں کے درمیان مساوات کا ظہور ہوگا۔ اور ہمارے مختلف فرقوں کے لوگ ایک اصول اور ایک مسلک رکھنے والی برادری میں ڈھل جائیں گے۔

لیکن اگر یہاں اسلامی نظام برپا نہ کیا جائے، بلکہ بجائے اس کے کسی دوسرے ملک سے ہم کوئی کافرانہ نظام زندگی لا کے یہاں نصب کر دیں تو اس کے مزاج سے چونکہ اسلامی قومیت کے تصور کو کوئی سازگاری نہیں ہوگی، اس لئے لازماً یہاں وطنی قومیت کے تخیل کو فروغ دینا ہوگا، اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، وطنی قومیت کا تخیل مسلمانوں کے ہزار سالہ مزاج سے کسی طرح بھی سازگار نہیں ہے، پس اس کے فروغ کی ساری مساعی اسی طرح رائیگاں جائیں گی، جس طرح کانگریس کی مساعی ایک مرتبہ یہاں ناکام ہو چکی ہیں۔ پھر عوام کو، وطنی قومیت کا پیغام دیتے وقت آپ کی پوزیشن تو کانگریس سے بھی زیادہ کمزور ہوگی، کیونکہ آپ کانگریس کے خلاف جب صف آرا ہوئے تھے تو آپ وطنی قومیت کی تردید کا پروگرام لے کر کھڑے ہوئے تھے اور پھر آپ نے وطنی قومیت کی مخالفت اور دینی قومیت کی حمایت میں جو فکری مواد اسٹیج اور پریس سے کئی سال یہاں نشر کیا ہے اس کی گونج ان فضاؤں میں آج بھی باقی ہے۔

اب کس منہ سے آپ اپنی قوم کے سامنے الٹے قدموں لوٹ چلنے کی دعوت لے کے جائیں گے اور اگر جائیں گے تو پھر یہ اندازہ کیجئے کہ گذشتہ دس سال میں دینی قومیت کے تخیل کی آبیاری کر کے اس کی جڑیں خود آپ نے جس حد تک مضبوط کر دی ہیں، اس کے پیش نظر کئی سال تک بھی اگر اسے دماغوں سے نکالنے کی مہم جاری رکھی جائے تو کامیابی کے امکانات بہت ہی کم ہیں ــــــــــ نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی غیر اسلامی نظام جسے آپ یہاں بالجبر کھڑا کر دیں گے اسے زندہ رہنے کے لئے قومی شعور کی وہ روح حاصل نہ ہو سکے گی جس کا ہر سیاسی نظام محتاج ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر آپ مسلمانوں کے اندر اسلامی نظام کو نافذ کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ جس تصور قومیت کو دین کی اکساہٹ سے آپ نے گذشتہ چند برس میں ان کے اندر پروان چڑھایا ہے وہ آناً فاناً ایک عظیم الشان قوت محرکہ بن کے زندگی کی سرگرمیوں کو تیز تر کر دے گا۔ اور افراد کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں ایک نقطہ پر سمٹ کر وہ عظیم الشان نتائج دکھائیں گی جن کا پیشگی اندازہ آپ نہیں کر سکتے۔ لیکن کسی غیر اسلامی نظام کے تحت غیر اسلامی تصور قومیت کے لئے ذہنوں کو ہموار کرنے میں کئی سال تک مالی اور ذہنی قوتیں آپ کو ضائع کرنی پڑیں گی اور جب تک وہ نیا تصور قومیت برگ و بار لانے کے قابل نہ ہو جائے آپ کی قوم علمی، مادی، معاشی، جسمی، اخلاقی، ہر لحاظ سے کمزور رہے گی۔ اور نہ معلوم دنیا کی طاقت ور قوتیں آپ کی اس کمزوری سے کیا کیا ناجائز فائدے اٹھائیں گی اور کس کس طرح سے آپ کے ملک میں سازشوں کے جال پھیلاتی رہیں گی۔ عین ممکن ہے کہ صدیوں آپ کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔

دوسری چیز جو اسلامی نظام کے قیام سے پاکستان کو حاصل ہو سکتی ہے ایک متعین

پروگرام اور ایک متعین راہِ عمل ہے۔ اسلام آپ کو اپنے مستقل اصول دیتا ہے، اپنے اٹل قوانین و ضوابط دیتا ہے؛ اپنے مستحکم مقاصد عطا کرتا ہے اور اصلاح و فلاح کا ایک دوامی نظام بہم پہنچاتا ہے۔ اسلام کے اس عطیہ کا فائدہ یہ ہے کہ آپ کے اندر فکری انتشار کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اسلام کے تحت زندگی بسر کرنے والی قوم کو فلسفے گھڑنے، پروگرام تراشنے، اصول ایجاد کرنے، مقاصد کو نت نئے سانچوں میں ڈھالنے کی ذمہ داری سے پوری طرح نجات مل جاتی ہے اور یہ وہ چیزیں ہیں جن پر غیر مسلم اقوام کی قوتوں کا ایک بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہے اور عملی کام کے لئے قوت کی مقدار کم رہ جاتی ہے۔ پھر ان کے خود ساختہ فلسفے اور نظام چونکہ چند ہی سالوں میں اپنے مفاسد کی وجہ سے ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں۔ لہذا دو ایک قرنوں کے بعد ان کو کسی نئے فلسفے کے تحت مجتمع ہو کر اپنے ہی قائم کردہ اقتدار کے خلاف انقلابی تحریک برپا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انقلابی کشمکش جب بھی کسی قوم میں رونما ہوتی ہے تو وہ اپنے تخریبی سیلاب میں اس کی بہت سی تعمیری قابلیتوں کو بہالے جاتی ہے، اور اس کے پورے تمدن کو تہ و بالا کر دیتی ہے، پھر جب بیش بہا قربانیوں کے بعد کسی نئے فلسفے کی بنا پر کوئی نیا نظام قائم ہو جاتا ہے۔ تو بجائے اس کے کہ قوم کی قوتیں اسے نشو و نما دینے چلی جائیں چند ہی سال بعد پھر اسے بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور پھر توڑ پھوڑ کا پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظام کا قیام آپ کی قوتوں کو اس طرح کی بربادی سے بالکل محفوظ کر دیتا ہے۔

اسلامی نظام کو اختیار کرنے کے بعد آپ کی ساری قوتیں یکسوئی سے اس کے استقلال و استحکام اور اس کی توسیع میں مصروف ہو جائیں گی اور آپ کو نت نئے

فلسفے اور پروگرام گھڑنے سے نجات مل جائے گی۔ اور آپ کے اندر انقلابی توڑ پھوڑ
کے بحران نمودار نہیں ہو سکیں گے۔ پھر اس بات کی گنجائش بھی نہ رہے گی کہ آپ کی قوم
میں اغراض پرست لوگ اٹھیں اور گوناگوں غیر اسلامی تحریکوں کی طرف عوام کو بلائیں،
کوئی مغرب کی طرف کھینچے کوئی مشرق کی طرف، کوئی سوشلزم کا پروگرام لائے اور
کوئی سرمایہ داری کا۔ کوئی امریکہ کی ذہنی غلامی کی دعوت دے اور کوئی روس کی تقلید
کی ـــــــ اور مختلف پارٹیاں بنیں، مختلف گٹھ جوڑ قائم ہوں، مختلف مورچے لگیں،
اور پھر ایک ہی ملک کے باشندے الگ الگ جھنڈوں کے تحت الگ الگ
نعروں کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف جنگ آزما ہوں اور وہ قوتیں جنہیں یکسوئی
سے اجتماعی نصب العین پر صرف ہونا چاہئے تھا باہم آویزی میں برباد ہوں پھر پہلی
انقلاب کے کسی خونی ڈرامہ کو اسٹیج کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اسلامی نظام اگر
برپا ہو، تو یہاں ہر فلسفی ایک ہی فلسفے کے گن گائے گا۔ ہر مقرر ایک ہی نصب العین
کے لئے خطاب کرے گا، ہر لیڈر ایک ہی پروگرام پیش کرے گا، ہر پارٹی ایک
ہی نظام جماعت پر استوار ہو گی، ہر ادیب ایک ہی تخیل کا علمبردار ہو گا، ہر اخبار
ایک ہی پالیسی کا پابند ہو گا ہر پروفیسر اور مدرس ایک ہی نظام زندگی کی تعلیم دے
گا، اور زندگی کے ساز کے سارے تار پوری طرح ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ ان میں سے
الگ الگ سُر نہیں نکلیں گے، ان کی یہ کیفیت یہ نہ ہو گی کہ من چہ سرایم و طنبورہ من چہ می
سراید! ـــــــ یہ بات آپ کو دنیا کے کسی اور نظام سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ
ممکن ہے کہ آپ میں سے کچھ افراد اشتراکی نظام کو پسند کرتے ہوں۔ یا کچھ افراد سرمایہ داری
کی رغبت رکھتے ہوں لیکن دونوں میں سے جو بھی اقتدار پر قابض ہو جائے وہ پوری

قوم کو اپنے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے خلاف پبلک میں کچھ نہ کچھ طاقتیں رد عمل کریں گی اور کرتی رہیں گی۔ یہ بات صرف اسلامی نظام کے ذریعے ہی ممکن ہے کہ پوری قوم میں توافق و تعاون پیدا ہو جائے اور ابتدا میں ایک معمولی سی کشمکش پیش آنے کے بعد مستقل وحدت نمودار ہو جائے!

تیسرا تحفہ جو اسلام پاکستان کے باشندوں کو دے سکتا ہے وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی یک رنگی ہے۔ اسلامی نظام کے قیام ہی سے اس تضاد کا خاتمہ ہو سکتا ہے جو ہماری زندگیوں کے ایک ایک گوشے میں پھیلا ہوا ہے اور جس کی وجہ سے آج تک ہماری قوتیں دو طرف بٹ کر صرف ہوتی رہی ہیں۔ اور یکسوئی کے اس فقدان نے ہمیں مسلسل کمزور اور کمزور سے کمزور تر کر دیا۔ اسی تضاد کا احساس تھا جس نے ہمیں انگریزی حکومت کے تسلط سے نکلنے پر اکسایا، یہی تضاد کا احساس تھا جس نے ہمارے اندر ہندو اکثریت کے غلبہ سے بچنے کی تحریک پیدا کی ——— اور اگر اس تضاد کو ہم نے برقرار رہنے دیا تو پاکستان کے اندر کسی غیر اسلامی نظام کے تحت سکون سے زندگی گذارنا مسلم عوام کے لئے ممکن نہ ہو گا!

یہ تضاد جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں، اسلامیت اور جاہلیت کا تضاد ہے، جو ایک مدت سے ہمارے افکار و اعمال میں نفوذ کئے ہوئے ہے اور جس کی حیثیت ہماری اجتماعی زندگی کے لئے بالکل وہی ہے جو افراد کے لئے کسی مزمن مرض کی ہوتی ہے کہ وہ تن بدن کو گھلاتا رہتا ہے اور کسی کل آدمی کو چین نہیں آتا۔ اس تضاد کے بے شمار مظاہر ہماری زندگی میں پھیلے ہوئے ہیں، اور اس کے گوناگوں مناظر ہم روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، بلکہ خود ان مناظر کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہ جو

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص مسلمانوں کا سا نام دھراتا ہے، مسلمانوں کی سوسائٹی میں شامل رہتا ہے، مسلمانوں کی سی بعض رسوم اختیار کئے رہتا ہے، لیکن اپنی زندگی کی حرکات و سکنات کو اسلام کے تابع نہیں بناتا، یہی وہ تضاد ہے جو ہماری قوتوں کو گھلائے دے رہا ہے۔ ہم میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو روزانہ نماز میں خدا کے سامنے پانچ مرتبہ یہ اقرار باندھ کے جاتے ہیں کہ اے آقا ہم تیری بندگی کریں گے، تیرے تجویز کردہ صراط مستقیم پر زندگی کا سفر طے کریں گے، وہ نہایت بے تکلفی سے مسجد کی چار دیواری سے نکلتے ہی اپنے قول و قرار کو پاؤں کے نیچے روند دیتے ہیں اور پھر زندگی کے سارے مشاغل میں وہ تمام ایسی کارروائیوں کو بے تکلفی سے سرانجام دیتے ہیں جو ان کی نماز کی عین ضد ہوتی ہیں۔ پھر ہم میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ہر سحر کو نماز تہجد ادا کرنے کے بعد خدا کے مالک، حاکم، کارساز، رازق اور معبود ہونے کی تسبیحیں پڑھتے ہیں لیکن اپنا دن ان کاموں میں صرف کرتے ہیں جو صرف خدا کے منکروں کو زیب دیتے ہیں، وہ تجارت میں جھوٹ بھی بول لیں گے، وہ سودی اداروں کے حساب کتاب کی نوکریاں بھی کر لیں گے، وہ اس خدا کے دشمنوں کے قدم جمانے کی خدمت بھی انجام دے لیں گے جس کے نام کی تسبیحیں پڑھ کے وہ گھر سے چلے تھے پھر ہم میں وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کی یہ وارننگ پڑھ کے آتے ہیں کہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے تحت معاملات کے فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں، فاسق ہیں، ظالم ہیں، پھر نہایت اطمینان سے ان عدالتوں کی کرسیوں پر براجمان ہو جاتے ہیں جن کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ ایک ملک میں اللہ کے باغیوں کا قانون چلے اور اس کا نازل کردہ قانون پامال کیا جاتا رہے۔ پھر ہم میں وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو رقص

خانوں کا افتتاح تلاوتِ قرآن سے کرتے ہیں، جو قوم فروشی کرکے کمائی ہوئی دولت سے مسجدیں بناتے ہیں، جو غیر اسلامی عہدوں کی خاطر ووٹ لینے کے لئے خدا اور رسول کے واسطے دیتے رہتے ہیں، جو سودی بنک کو "اسلامی بنک" بھی کہہ لیتے ہیں اور اسی طرح کے گوناگوں تضاد اسلامیت اور جاہلیت کے اندر جمع کئے پھرتے ہیں۔ اور ان تضادوں کی وجہ سے ہماری قوتیں دو مختلف سمتوں میں صرف ہوتی ہیں اور ہمارا وہی حال ہے کہ ؎

پکڑے ہے جو ایمان تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

ہمارے عقائد ہم سے کچھ اور مطالبہ کرتے ہیں اور ہماری قوم کی غیر اسلامی اجتماعی فضا ہم سے کچھ اور چاہتی ہے۔ نماز روزہ اور دوسری عبادتیں ایک اور طرح کا اخلاق ہم میں ابھارنا چاہتی ہیں، لیکن جو سیاسی معاشی نظام ہمارے اندر برسرِ عمل ہے وہ اخلاق کا ایک دوسرا نقشہ ہمارے سامنے لاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت ہمیں کسی اور راستے کی طرف بلاتی ہے اور ہمارے سیاسی رہنماؤں کا بلاوا بالکل دوسرا ہے۔ جن صحابہ کرام سے ہمیں عقیدت ہے ان کا اسوہ ایک الگ مزاج رکھتا ہے اور وقت کے اکابر جو ہمارے پیش رو بنے ہوئے ہیں ان کی سیرت ایک الگ نمونے کی ہے اس حال میں قوم نہ دینی روایات کو پوری طرح چھوڑ سکتی ہے نہ غیر اسلامی رجحانات کی پیروی میں پوری توجہ صرف کر سکتی ہے چنانچہ آدھی قوتیں اسلام کے مطالبات پر صرف ہوتی ہیں اور آدھی جاہلیت کے تقاضوں پر۔ یہ قوتوں کا دو رخا صرف ہونا اگر کسی طرح جاری رہے تو یہ پاکستان کی اجتماعی قوت

کو کبھی بھی پورے عروج پر نہ پہنچنے دے گا۔ ناگزیر ہے کہ افراد ملک کی پوری قوتیں یکسو ہوں، ان کے عقائد اور اعمال میں تضاد نہ رہے، ان کے دین اور دنیا میں اختلاف نہ ہو، ان کی عبادات اور معاملات میں تصادم نہ ہو، اور یہ مدعا حاصل کرنے کے لئے ہمیں انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کو یا تو بالکل اسلامیت کے تحت دینا ہوگا یا پوری طرح جاہلیت کے حوالے کرنا ہوگا۔

اب یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام کے اثرات کا اگر ہم جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ یہ پاکستانی مسلمانوں کے اندر گہری جڑیں چھوڑ چکے ہیں اور ان سے کسی طرح ان کے ماضی کو نوچ کر علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور ان کو ان روایات سے بے نیاز نہیں کیا جا سکتا جن کا عظیم الشان ذخیرہ نسلاً بعد نسل ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ملتا چلا آرہا ہے۔ کوئی ممکن شکل ایسی نہیں ہے کہ آپ ان کے دل و دماغ سے ان عقائد اور ان اقدار کو کھرچ سکیں جو قرآن سے انہیں حاصل ہوتے ہیں۔ پس ممکن یہی ہے کہ جاہلیت کے تازہ اثرات کو جن کی جڑیں زیادہ گہری نہیں ہیں اکھیڑ کے اپنی سوسائٹی اور اپنے افراد کو ہم بالکلیہ اسلام کے زیر اثر لے آئیں۔ اور یہ چیز ہمیں خالص اور مکمل اسلام ہی کے قیام سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اگر ہمارے ملک میں اسلامی نظام برپا ہو جائے تو یہاں سرعت سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں یکسانی پیدا ہونے لگے گی اور چند سال کے اندر اندر ہمارے کروڑوں افراد کی پوری قوتیں اسلام ہی کے لئے مخصوص ہو جائیں گی اور تضاد کے وہ مظاہر باقی نہ رہیں گے جو ہماری اجتماعی قوت کو گھلا رہے ہیں۔ بخلاف اس کے اگر یہاں کوئی غیر اسلامی نظام کھڑا کر دیا جائے تو پھر وہی تضاد سالہا سال کے لئے ہمارے اوپر

مسلط ہو جائے گا جو انگریزی دورِ تسلط میں ہمیں زندگی کے ہر گوشے میں کھٹکتا رہا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس تضاد کا احساس مسلمان عوام کو پھر کسی داخلی انقلاب پر اکسا دے اور دو گونہ رجحانات کے تصادم سے ملک کی قوت برباد ہو۔ یکسوئی اور یکسانی کے ظہور کی توقع صرف اسلامی نظام کے قیام سے وابستہ ہے۔

اسلام جو چوتھی نعمت ہمارے ملک کو بہم پہنچا سکتا ہے وہ مادی اور صنعتی ترقی کی تیز رفتاری ہے۔ اسلامی نظام کا قیام پاکستان کے مادی عروج کو جتنا جلد مکمل کر سکتا ہے، اتنا جلد کوئی دوسرا نظام نہیں کر سکتا، آپ کو میری یہ رائے شاید بہت ہی عجیب و غریب معلوم ہوگی، اس وجہ سے کہ آپ کے سامنے اب تک دینداری کا یہ تصور رہا ہے کہ آدمی ڈاڑھی بڑھا لے، پائجامہ کے پائنچے پنڈلیوں تک چڑھا لے، نماز روزہ کرتا رہے، وقتاً فوقتاً الحمد للہ اور لاحول ولا قوت الا باللہ کہتا رہے تو گویا وہ دینداری کے معیار پر پورا اتر گیا۔ دینداری کے اسی تصور کے تحت کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے اور وہ اس غلط فہمی کو پھیلا بھی رہے ہیں کہ اسلامی نظام شاید ملاؤں کی حکومت کا نام ہے —— اور ملا کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے وہ وہی ہے جو ابھی میں نے بیان کیا ہے۔ اس میں مزید یہ باتیں بھی شامل کر لیجئے کہ اسلام کا ملا ایک ایسا انسانی وجود ہے جو زمانے سے دو صدیاں پیچھے چلتا ہو، جس کو دنیا کا جغرافیہ نہ آتا ہو، جس کو لباس پہننے کا سلیقہ نہ ہو، جس کو صحت و صفائی کے اصول نہ آتے ہوں، —— رہے سیاست و معیشت اور تہذیب و تمدن کے اونچے مسائل تو وہ ان سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت کے کارکنوں کے اس خود ساختہ ذہنی تصور کی وجہ سے بہت سے لوگ اسلامی نظام کا نام سن کر ڈر جاتے ہیں۔ اور

ان کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ اسلامی نظام صنعتی اور مادی ترقی کو اخلاقی ترقی کے متوازی جاری کرے گا، یہی نہیں، بلکہ مادی ترقی کی رفتار کو وہ اپنے زیر اثر ملک میں دوسرے ممالک سے زیادہ تیز کر کے دکھائے گا۔

حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام اپنے اوپر ایمان لانے والوں سے جو کڑے مطالبات کرتا ہے ان میں یہ چیز بنیادی طور پر شامل ہے کہ ہر مسلمان کو اپنی ہر قوت: سرمائے کی قوت، علم کی قوت، فن کی قوت، جسم کی قوت، خطابت و تصنیف کی قوت پوری دیانتداری کے ساتھ اجتماعی مقاصد پر صرف کر دینی چاہیئے۔ وہ ہر شخص کے لئے لازم ٹھہراتا ہے کہ ملک کے تمام وسائل کو وہ بہتر سے بہتر طریق پر استعمال کرنے کی تدابیر اختیار کرے وہ مسلم قوم کے استحکام و استقلال کے لئے اپنے وقت اور مال کو بہتر سے بہتر پروگرام کے تحت صرف کرے، وہ اسلامی حکومت کے نشو و ارتقا کے لئے ان تمام لوازم کو ترقی دے جو ایک اسٹیٹ کو قوی بناتے ہیں۔ اس کی اسپرٹ ہر نوجوان سے یہ کہتی ہے کہ سائنس، انجینیرنگ، ڈاکٹری اور دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود اسے حاصل نہ کیا، تو خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ اس کی اسپرٹ اپنے ہر سرمایہ دار سے کہتی ہے کہ تو اگر ایک لاکھ روپیہ کا سرمایہ پیدائش دولت کے کام میں لگا سکتا تھا لیکن ۹۹۹۹۹ روپے استعمال کئے اور ایک روپیہ بیکار پڑا رہنے دیا تو تجھے آخرت میں اس کوتاہی کا حساب دینا ہوگا۔ اس کی اسپرٹ ہر موجد سے یہ کہتی ہے کہ اگر تو کوئی نئی ایجاد پیش کرنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود غفلت میں پڑا رہے گا تو تجھے اس غفلت کی سزا کل کی عدالت سے قبول کرنی ہوگی۔ اسی طرح اسلام کی اسپرٹ ایک

ایک کارخانہ دار، ایک ایک مزدور، ایک ایک زمیندار، ایک ایک مزارع، ایک ایک سائنس دان اور ایک ایک انجینیرنگ سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے مال، اپنے علم، اپنی قوت اور اپنے وقت کی کوئی رمق بھی اگر مشترکہ مقصد کی خدمت سے بچا رکھیں گے تو ان کے خلاف آخرت میں بہرحال مقدمہ چلایا جائے گا۔ اسلامی نظام کے تحت یہ اسپرٹ جس قوم میں پھیل جائے، آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس کی قوتیں کتنی زیادہ پیدا اور ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس کا حال بالکل اس کھیت کا سا ہوتا ہے جسے اعلیٰ درجہ کی کیمیاوی کھاد پوری مقدار میں دی گئی ہو اور ترقی یافتہ ذرائع سے اسے سیراب کیا گیا ہو۔ اس میں جب تخم ریزی کی جاتی ہے تو اس کی مٹی گویا اپنی پوری پیدا آور قوتوں کو پودوں کی شکل میں باہر اگل دیتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس میں سے نباتات ابلی چلی آ رہی ہو۔ اسلامی عقائد رکھنے والی سوسائٹی کے اندر سے اس کی قابلیتیں اور صلاحیتیں پورے زور سے اس طرح بہنے لگتی ہیں جس طرح پہاڑوں سے آپ چشموں اور ندیوں کو بہتا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہاں صنعتی اور مادی ترقی رینگتی اور رستی نہیں، بلکہ سیلاب بن کے بہتی ہے۔

اس دعوے کے ثبوت میں اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ آج سے پہلے جب اسلامی نظام اپنی کامل شکل میں اس زمین کے ایک حصے پر نافذ ہوا تھا تو اس وقت اس کے علمبردار آپ کے روایتی ملا کی طرح زندگی کی ہماہمی سے کنارہ کش ہو کر غاروں اور جنگلوں میں نہیں جا بیٹھے تھے اور نہ انہوں نے اپنے اسٹیٹ کی مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے محض دعاؤں اور وظیفوں اور تسبیحوں سے کام لیا تھا، بلکہ انہوں نے اپنے دور کی تجارت میں نمایاں مقام حاصل کیا، اپنے دور کی صنعت

میں پیش پیش رہے، اپنے دور کے بہتر سے بہتر اسلحہ وآلات کو وہ کام میں لائے۔ انہوں نے ہر پہلو سے زیادہ سے زیادہ قوت سمیٹی اور اس ساری قوت کو اللہ تعالیٰ کی رضا پوری کرنے والی حکومت کی تقویت میں صرف کیا۔ اور اسی لئے وہ غالب بن کے رہے۔

آپ بھی اگر آج اسلامی نظام کے علمبردار ہیں تو اسلام اس کو گوارا نہیں کرتا کہ آپ علوم وفنون میں، سائنس کی ایجادات میں، صنعت وحرفت کی دولت افزائی میں اور کان کنی اور زراعت کی ذمہ داریوں میں پھسڈی بن کے رہیں۔ بلکہ وہ ہر مسلمان کو اپنے اپنے دائرۂ عمل میں ماہر ترین اور سرگرم ترین کارکن کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے اور ان سارے کاموں کو وہ آپ پر بطور عبادت کے لازم کرتا ہے۔ اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ اس قوم کی صنعتی و مادّی ترقی سے جو اپنی ساری دنیوی سرگرمیوں کو حدود اللہ کے تحت عبادت کی حیثیت سے انجام دے رہی ہو، ان قوموں کی رفتار ترقی کو کیا نسبت ہو سکتی ہے جو محض ضرورت کا احساس کر کے اور اپنے افراد کو محض روٹی اور عیش کا لالچ دلا کر ان سرگرمیوں میں استعمال کر رہی ہوں۔ اسلامی نظام کے تحت اپنی مادی سرگرمیوں کو بھی عبادت کی حیثیت دے کر ہی آپ اپنی اجتماعی قوت کو اس سطح پر لے جا سکتے ہیں جس سطح پر موجودہ دنیا کی بڑی قومیں متمکن ہیں، —— ورنہ اگر آپ انہی قوموں کی رفتار سے چلے تو زمانے کے ہزاروں الٹ پھیروں کے بعد بھی آپ ان کے برابر نہ ہو سکیں گے نتیجہ یہی کہ آپ دوسروں کے پیچھے دھیرے دھیرے رینگتے رہیں گے۔

اسلام کا پانچواں عطیہ اخلاقی قوت کا استحکام ہے۔ ہر قوم کے پاس قوت کی تین

قسمیں ہوتی ہیں، ایک افرادی قوت، ایک مادّی قوت، ایک اخلاقی قوت۔ ان میں سے اوّل الذکر کا انحصار انسانی عزم وہمت پر نہیں، لیکن مادّی قوت کو انسان کوشش کرکے ایک خاص معیار پر لے جا سکتا ہے، رہی اخلاقی قوت سو اس کا میدان بہت ہی وسیع ہے اور انسان اس میدان میں جتنی زیادہ سرگرمی دکھائے اتنا ہی زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔ قوموں کی اجتماعی سیاسی قوت انہی تین قوتوں کا مجموعہ ہوتی ہے کوئی قوم جس طرح افرادی قوت اور مادّی قوت سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، اسی طرح وہ اخلاقی قوت سے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جنگ جیتنے کے لئے سپاہیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ بہتر اسلحہ اور اس کے استعمالی علم وتجربہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان دو چیزوں کے بل پر کوئی فوج جنگ نہیں جیت سکتی، بلکہ اسے ایک تیسری طاقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، یعنی نظم کی، اطاعت کی، وفاداری کی، دیانت داری کی، شجاعت کی، مقصد سے محبت کی اور موت سے بے خوفی کی! ــــــــ یہی قوت اخلاقی قوت کہلاتی ہے۔ یہ قوت اس قسم کے معجزے دکھاتی ہے کہ زیادہ تعداد کی فوج کم تعداد کی فوج سے شکست کھا جائے اور اچھے اسلحہ رکھنے والے سپاہی کم تر درجہ کے ہتھیاروں کے مقابلہ میں بھاگ کھڑے ہوں۔

اب آپ یہ سوچئے کہ امریکہ، روس، برطانیہ اور دوسری مستحکم قوموں کے مقابلے میں آپ کی مادّی طاقت بہرحال حقیر ہے اور اگر آپ اسے ترقی بھی دے لیں تو اس بات کا امکان بہت ہی کم ہے کہ ان پیش رو طاقتوں کی برابری کر سکیں، کیونکہ یہ آپ کے انتظار میں رک کر کھڑی تو ہونے کی نہیں، بلکہ آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا

رہی ہیں۔ الٹا امکان اسی بات کا زیادہ ہے کہ آپ ترقی کرنے کے لئے خود ان کی مدد لیں، ان سے قرض حاصل کریں۔ ان سے دب کے رہنے کے معاہدے کریں، ان کو اپنی سیاست میں دخل دینے کے مواقع دیں ـــــــ اور اس حال میں ظاہر ہے کہ آپ ان کی برابری کا دم بھرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔

ان پیش رو قوموں کو جا لینے کی ایک ہی صورت ممکن ہے کہ آپ کے ہاں اخلاقی قوت کا معیار اتنا بلند ہو جائے کہ وہ مادی قوت کی کمی کو پورا کرے۔ پھر یقیناً آپ کے افراد کی کم تعداد اور آپ کے وسائل کی کم مقدار بھی آپ کو ان سے آگے لے جا سکتی ہے اور اسلام کے پاس آپ کی اخلاقی قوت کو بلند کرنے کا بڑا دسیع پروگرام موجود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مادہ پرست قوموں میں بھی نظم اور ڈسپلن ہوتا ہے، انضباط ہوتا ہے، کچھ نہ کچھ انفرادی اخلاق ہوتے ہیں کچھ نہ کچھ تجارتی حسن معاملت ہوتا ہے، اور اخلاق کے مختلف لوازم کو پورا کرنے کا ایک اہتمام وہ کرتی ہیں، کیونکہ اخلاقی قوت ہر قوم کی طبعی ضرورت ہے۔ لیکن یہ اخلاقی انضباط محض خارجی تدابیر سے قائم کیا جاتا ہے، یعنی کچھ قانون کی نگرانیاں، کچھ پاسبانیاں ایسی فراہم کی جاتی ہیں جو افراد کو انار کی سے روک رکھیں، اور اسی طرح تنخواہوں اور عہدوں کے لالچ اور شہرت کی بھوک وغیرہ کو بھی اخلاقی اکساہٹ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ان انتظامات کے باوجود جن افراد کا تصور حیات یہ ہو کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، انسان جانوروں کی طرح چرنے چگنے کے لئے بنا ہے، اخلاق صرف نفع پرستی کا نام ہے، کسی کے سامنے مرنے کے بعد اعمال نامہ پیش نہیں کیا جاتا ہے، ان کو قانون اور

افسروں کی نگرانیوں کے قلعوں میں جہاں بھی کوئی رخنے مل جاتے ہیں وہیں سے وہ باہر نکل بھاگتے ہیں۔ اور موقع پاکر اپنی خواہشات کے لئے پلید سے پلید کارروائیاں کر گذرتے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص کی کچھ قیمت ہوتی ہے، کم ہو یا زیادہ اکوئی ایک پیسے پر بکتا ہے تو کوئی ایک روپے میں اکوئی ہزاروں میں اپنے آپ کو بیچتا ہے تو کوئی کروڑوں میں۔ کسی کی قیمت بیوی یا محبوبہ کا ایک تبسم ہے، کسی کا مول واہ وا اور زندہ باد کے نعرے ہوتے ہیں، کسی کے لئے تنخواہ اور عہدہ کی ترقی ضمیر فروشی کی محرک ہو جاتی ہے، ——— چنانچہ دنیا کی بلند ترین قوموں میں رشوت سفارش، سازش، قومی رازوں کی سوداگری اور ایسی ہی ذلیل وبائیں پورے زور شور سے پھیلی ہوئی ہیں۔ لیڈر اپنی لیڈری کے لئے پارٹی بازیاں کرتے ہیں، مصنف اپنے ٹکے کھرے کرنے کے لئے اخلاق سوز لٹریچر بہم پہنچاتے ہیں، اخبار نویس اپنے پیٹ کے لئے قوم کو فساد میں مبتلا کرتے ہیں، مدبر، اپنے عہدوں کے لئے اور ذاتی اقتدار کے لئے جنگ کے سیلاب کے دہانے کھولتے ہیں اور اس طرح قوم کی قوت کو خود اس کے فرزند برباد کرتے رہتے ہیں۔

بخلاف اس کے اسلام جن عقائد سے انسان کی زندگی کی پرورش کرتا ہے ان کی پاکیزہ فطرت اسے ذمہ داری کے انتہائی احساس پر پہنچا دیتی ہے۔ چنانچہ اسلام کے بنائے ہوئے انسانوں کے لئے مرجانا آسان ہوتا ہے لیکن جس اصول و مقصد پر ان کی قوم کی بنا قائم ہوتی ہے اس سے ہٹ جانا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اپنی خواہش کو پاؤں تلے مسل دیں گے۔ لیکن قوم کی دولت میں سے خیانت کر کے ایک پائی بھی اس کے لئے حاصل نہ کریں گے۔ وہ اپنے ایسے اعزہ و اقرباء کی خوشنودی

کو ٹھکرا دیں گے جو معاشرہ کے مفاد کی خلاف ورزی کا مطالبہ کرتے ہوں وہ پوری دنیا کو رشوت میں لے کر بھی اس پر راضی نہ ہوں گے کہ عدل کے ایک فیصلے کو بدل دیں اور حق کے ایک مطالبے میں تبدیلی کر دیں انہیں دنیا جہاں کی واہ وا کسی غلط سمت میں اقدام کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی ہے اور انہیں دنیا بھر کے پریس اور اسٹیج کی ملامت راست روی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ وہ کسی عورت کے تبسم پر ملی مفاد کو بیچ نہیں سکتے، وہ کسی گروہ کی "زندہ باد" کے اوپر ملک کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اور عہدہ کی ترقی کا لالچ اور اقتدار کی ہوس کا زور انہیں اپنی قوم کو فساد اور جنگ کی چتا میں دھکیلنے پر مائل نہیں کر سکتا۔ انہیں قومی قلعے کے جس دروازے پر آپ کھڑا کر دیں گے، وہ دیانت دار ثابت ہوں گے، انہیں جو منصب آپ سپرد کر دیں گے وہ اس کے سچے امین نکلیں گے، انہیں جو فرض آپ سونپیں گے، اسے وفاداری سے ادا کریں گے —— کیونکہ انہیں یہ قطعی یقین ہے کہ مختلف فرائض اور ذمہ داریوں کے معاملے میں وہ دنیا کی عدالتوں اور افسروں اور نگرانوں کے سامنے ہی جواب دہ نہیں ہیں، بلکہ ایک ایسے قہار و جبار آقا کے سامنے بھی جوابدہ ہیں جو علیم و خبیر ہے۔

پس اسلام اپنے کارکنوں میں جو شجاعت، بے غرضی، جو فرض شناسی، جو اطاعت و تابعداری، جو ہم آہنگی و یک رنگی، جو دیانت و امانت پیدا کرتا ہے اس کی کوئی مثال دنیا پرست قوموں کے اخلاق میں نہیں مل سکتی۔ اس کا نظام اگر پاکستان میں نافذ ہو تو اس نظام کی فطرت کے مطابق جو کارکن تیار ہوں گے وہ ہمارے ملک کی اخلاقی قوت کا خزانہ اتنا بھرپور کر دیں گے کہ اگر مادی قوت کے

خزانے میں کوئی کمی بھی ہوگی تو وہ اس سے پوری ہو جائے گی ——— اور ہم لوگ اپنی مجموعی قوت کے لحاظ سے موجودہ اقوام سے بہت جلد آگے نکل سکیں گے۔

اسلام کا چھٹا تحفہ یہ ہے کہ وہ آپ کی قومی خودی کو مستحکم کرے گا۔ اور آپ کو ذہنی آزادی اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کر دے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر آپ نے یہاں روس یا امریکہ یا کسی دوسرے ملک کا ایجاد کردہ اصول اور نظام نافذ کیا تو آپ اس ملک کے مقابلے میں ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہیں گے اور آپ کی حیثیت اس کے مقابلہ میں وہی ہوگی جو کسی امیر آدمی کے مقابلہ میں بھکاری کی، کسی صاحبِ ایجاد کے مقابلہ میں نقال کی، کسی مصنف کے مقابلہ میں خوشنویس کی اور کسی راہبر کے مقابلہ میں پیرو کی ہوتی ہے۔ آپ ہر اہم موقع پر اپنے ضمیر سے نہیں بلکہ پرائے فلسفے سے رہنمائی چاہیں گے۔ آپ ہمیشہ ایجاد کے بجائے نقالی کی تدابیر سوچتے رہیں گے۔ یہ حالت جب قوم پر مسلط ہو تو وہ سیاسی طور پر آزادی پاکر بھی ذہنی طور پر دوسروں کی غلام رہتی ہے اور اس کی قومی خودی کبھی نشو ونما نہیں پاتی چنانچہ چین، ترکی، مصر، ایران، عرب، عراق، افغانستان اور اسی طرز کے دوسرے ممالک کی مثالیں آپ کی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں کہ سیاسی طور پر آزاد ہونے کے باوجود ذہنی غلامی نے انہیں دوسروں کی نگاہ ناز کا شرمندۂ احسان بنا کے رکھا ہے۔ لیکن بخلاف اس کے جن ممالک نے اپنے نظام اپنے اندر سے ابھارے ہیں مثلاً امریکہ، برطانیہ اور روس کو دیکھ لیجئے، وہ دنیا میں مستقل طاقتیں ہیں ان کے اندر قومی خودی کا

احساس کام کرتا ہے وہ اگر رہنمائی کا منصب حاصل نہ بھی کر سکیں، تو کسی کی نقالی تو انہیں ہرگز گوارا نہیں ہے۔ وہ اپنی مشکلات کو خود حل کرتے ہیں، وہ اپنے اقدامات کو اپنی عقل سے سوچتے ہیں، وہ اپنے فیصلوں کو اپنے اندر سے برآمد کرتے ہیں اور باہر کے کسی ملک کی طرف بھکاریوں کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔

اسلام خود آپ کے گھر کا اصول اور آپ کا قومی نظام ہے۔ اس کے اصول کو قبول کر کے اگر آپ زندگی کی تعمیر کریں تو آپ کو کسی طاقت کے سامنے نگاہیں نیچی نہ کرنی پڑیں گی، کسی کے نقوش قدم کی پیروی نہ کرنی پڑے گی اور آپ اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں آزاد محسوس کریں گے۔ بلکہ صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کے بعد اس کی حفاظت اور اس کو دنیا بھر میں پھیلانے کا ایک زوردار ولولہ آپ میں نمودار ہو گا۔ اور آپ یہ احساس کریں گے کہ فلاح و سعادت کے اس پروگرام کے واحد بین الاقوامی علمبردار آپ ہی آپ ہیں۔ اور آپ میں یہ شعور کام کرے گا کہ آپ کے اپنے کارخانے کا کچھ مال ایسا ہے، اپنے کھیت کی کچھ ایسی پیداوار ہے جو دوسروں کے پاس موجود نہیں ہے اور جسے تنہا آپ ہی آپ ساری منڈیوں میں سپلائی کرنے والے ہیں۔ آپ کسی کے ایجنٹ اور کارندے نہیں ہیں، بلکہ خود موجد اور میکر اور پروپرائٹر ہیں، اور دنیا کی مختلف طاقتیں آپ کے مال کی ایجنسی لینے کی محتاج ہیں۔ اس احساس کے تحت آپ کی قوتیں ابھریں گی، آپ میں خود اعتمادی پیدا ہو گی، آپ میں حفاظت کا جذبہ رونما ہو گا۔ اور آپ میں اپنی حمیت و خودداری کو محفوظ رکھنے والی غیرت ابھرے گی۔ آپ اپنا فلسفہ خود بنائیں گے، اپنی سیاست خود تعمیر کریں گے، اپنے معاشی مسائل خود حل کریں گے، اپنا نظام تعلیم خود ایجاد کریں گے، اپنا عسکری پروگرام خود سوچیں گے، اپنی صنعت کی تنظیم خود

کریں گے ـــــــ اور کسی موقع پر آپ کو دوسروں کے بازاروں سے خرید کر کوئی اصول و قانون نہ لانا پڑے گا۔

قومی خودی قوت و بقا میں جو دخل رکھتی ہے، اس کا آپ اگر صحیح اندازہ کر سکیں تو آپ ان لوگوں کو ہرگز اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے جو آپ کو اسلام سے ہٹا کر دنیا کی برسر قوت قوموں کے دین کی طرف بلا رہے ہیں۔ یہ لوگ خود اغیار سے مرعوب ہیں اور قوم کی قوم کو مرعوب رکھنا چاہتے ہیں، یہ خود ایجاد کی صلاحیت سے محروم ہیں اور آپ سب کو تقلید کی بیماری میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں ـــــــ حالانکہ اسلام اصولوں، فلسفوں اور نظاموں کے معاملے میں دوسروں کی تقلید کرنا تو کجا، اپنے ماننے والوں کی خودداری اس حد تک مضبوط کرنا چاہتا ہے کہ وہ لباس اور وضع قطع تک میں کسی دوسری قوم کی ذہنی غلامی کا ثبوت نہ دیں، بلکہ اپنی ضروریات کے مطابق اپنی ظاہری ہیئت تک میں خود اپنے ذوقِ ایجاد کے تحت تغیر و تبدل کریں یقین جانئے کہ اسلام کا نظام اگر یہاں قائم ہو جائے تو وہ آپ کو خودی اور خودداری کی ایسی عظیم الشان دولت عطا کرے گا کہ آپ کو دوسروں سے نہ اصولوں کی بھیک مانگنا پڑے گی، نہ سرمائے کی اور نہ کسی اور پہلو سے نظرِ عنایت کی۔

یہ وہ چھ عظیم الشان تحائف ہیں جو اسلام پاکستان کو عطا کر سکتا ہے ان میں سے جس تحفے کی قدر و قیمت کو آپ چاہیں، خالص مادہ پرستی اور افادیت ہی کی ترازو سے تول کر دیکھ لیجئے، آپ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ فی الواقع ان تحائف سے آپ کی قوت و طاقت میں جو اضافہ ہوتا ہے وہ کسی نظام کے قیام سے نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی یہی وہ نعمتیں ہیں جن کے زیر اثر اس کا نظام جو خالص اور مکمل شکل میں صرف ۳۰ برس

چلا تھا، اپنے وارثوں کو ہزاروں سال کے لئے دنیا میں مقتدر کر گیا۔ اور بگڑے بگڑے بھی وہ کئی صدیاں عروج و اقتدار کی گذار گئے۔ اتنا لمبا دور اقتدار کسی اور قوم کو تاریخ میں کبھی حاصل نہیں ہوا ہے اور یہ نتیجہ تھا اسلام کی معجزانہ قوت بخشیوں کا۔ اب ان قوت بخشیوں کو سامنے رکھ کر اس نازک لمحے میں آپ کو اور آپ کی قوم کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ پھر اسی نظام کو اپنی ایک نوخیز سلطنت میں نافذ کرے گی یا اسے چھوڑ کر مادہ پرست قوموں کی نقالی کرے گی!

آخر میں اس بات کو میں پھر دہرا دینا چاہتا ہوں جو میں نے اس خطاب کے آغاز میں کہی ہے کہ اسلام کو آپ جس پیمانے سے چاہیں ناپیں اور تولیں، لیکن جب اسے قبول کرنے کا فیصلہ کریں تو اس کا مطالبہ یہ ہے کہ نفع پرستی اور افادیت کے زاویۂ نظر کو الگ کر کے آگے آئیے اور اسلام کو اس حیثیت سے اپنا دین بنائیے کہ یہ آپ کے خالق و مالک کی طرف سے بطور ایک فرض کے آپ پر عائد کیا گیا ہے۔ اور بلا چون و چرا آپ کو اس کا اتباع کرنا ہے! ورنہ وہ اسلام اسلام ہی نہیں ہوگا جو فرض شناسی کے بجائے افادہ پرستی کے تحت اختیار کیا گیا ہو۔

مریضانِ قنوطیت اور اُنکی اقسام

(۱)

اِدھر دو سال سے تحریکِ اقامتِ دین کے عوامی دَور کا آغاز ہونے کے بعد سے اپنی ملّت کے مختلف عناصر کو قریب سے دیکھنے کا جو موقع ملا ہے، اس کے دوران میں نہایت تلخ حقائق سامنے آئے ہیں وہ حقائق جن کا علم اب تک ہوا ہے، ان کے پیشِ نظر اندازہ ہوتا ہے کہ بہ حیثیت ملّت ہم اگر جی رہے ہیں تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے۔

اس وقت ہمارے مختلف عناصر کے اندر نہایت مہلک قسم کے ذہنی و اخلاقی روگ پھیل چکے ہیں جو اندر ہی اندر ہماری اجتماعی قوت کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں۔ پھر ان روگوں کی چھوت ایک سے دوسرے کو لگ رہی ہے۔ اور ہمارے کتنے ہی قیمتی افراد ہیں جو بیماریوں کا سرچشمہ بن چکے ہیں اور اپنے گھناؤنے تخالف کو

سارے معاشرے میں پھیلاتے پھرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے ذہنی و اخلاقی مفسدات جسمانی امراض سے زیادہ تباہ کن ہیں اور یہ اس سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ جتنی توجہ ہم ملیریا، چیچک اور تپِ دق وغیرہ پر صرف کر رہے ہیں۔ ان جسمانی وباؤں سے ملت کے افراد پر تباہی وارد ہوتی ہے، لیکن جن نفسیاتی سوشل بیماریوں کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں، وہ اس نوعیت کی ہیں کہ قوموں اور ملتوں کو لے بیٹھتی ہیں۔

آج کی صحبت میں ہم ایک ایسے خطرناک روگ کے تذکرے کا آغاز کر رہے ہیں۔ جس نے ہمارے اکابر اور عوام میں ایک بڑی تعداد کو اپنے پنجوں میں دبوچ دکھا ہے۔ مرض کے ساتھ مریضوں کا تذکرہ ناگزیر ہے لیکن اس تذکرے سے جہاں ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگوں کو چھیڑا اور چڑایا جائے، وہاں متعلقہ افراد اور عناصر کو بھی حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے اصل حقائق پر غور کرنا چاہئے۔ اور ان کی اصلاح کے لئے فکرمند ہونا چاہئے ——— نہ اس کہ علامات و اسباب مرض کا تجزیہ کرنے پر محض اس وجہ سے اشتعال دکھایا جائے۔ کہ کیوں اس تجزیئے نے ایک چھپے مرض کو واضح کر دیا اور صحت و تنومندی کے جھوٹے زعم کی قلعی کیوں کھول دی۔ آخر غور کیجئے کہ اگر سل کے مادے سے متاثر شدہ مریض کو کوئی شخص مختلف علامات سے استدلال کر کے بروقت متنبہ کر دے۔ کہ تمہیں اپنے علاج کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تو یہ اشارہ کوئی گالی تو نہیں کہ اس پر بُرا منایا جائے۔ بلکہ یہ سچی خیرخواہی ہے۔ بالکل اسی طرح ہم یہ سطور پورے خیرخواہانہ جذبے سے سپردِ قلم کر رہے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ان حقائق کے واضح ہونے پر رنجیدہ ہو، جن کو ہم عرض کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے صبر کے سوا

اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

درحقیقت جس روگ کا ہمیں تذکرہ کرنا ہے وہ خود تحریک اقامت دین کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ غور فرمائیے کہ کیا ایک سلطنت اپنی فوج کو دشمنوں کے مقابلے کے لئے مضبوط تر بنانے کا پروگرام سامنے رکھنے کے بعد عوام کی صحت سے غفلت برت سکتی ہے؟ —— یقیناً نہیں! تو بالکل اسی طرح اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اگر ہم دنیا کے ہر کلمۂ کفر و شرک کے خلاف علم جنگ بلند کر رہے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے سرفروشان حق کی ایک سپاہ کو منظم کرنے میں مصروف ہیں تو ہمارے فرائض میں یہ بات بھی بنیادی طور پر داخل ہے کہ ہم اپنی ملت کی ذہنی، نفسیاتی اور معاشرتی و اخلاقی صحت کے معیار کو ترقی دینے کی سعی کریں۔ پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اگر کسی ملت کے اجتماعی، اخلاقی ماحول میں چند وبائیں پھوٹ پڑی ہوں وہاں اگر ان وباؤں کی روک تھام کی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو بڑے سے بڑا ڈاکٹر اور طبیب اور مضبوط سے مضبوط پہلوان بھی زیادہ دیر تک اپنے آپ کو ان وباؤں سے نہیں بچا سکتا۔ خود ہماری اپنی ذہنی و اخلاقی صحت کا دارومدار بھی اسی پر ہے کہ ہم اپنے ماحول کی تطہیر سے غافل نہ ہوں۔

ہم اس حقیقت کا بھی شدید احساس رکھتے ہیں۔ کہ جس مرض پر ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں اس کو اپنے اندر پال کر ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ایک مملکت کو ترقی کی راہ پر لے چلنے کی نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آزادی کا آفتاب طلوع ہو گیا، لیکن ہماری ذہنی و روحانی دنیا میں

ابھی وہ ساری تاریکیاں اطمینان سے ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں جنہوں نے غلامی کی رات کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ یہ تاریکیاں گویا یخ بستہ ہو چکی ہیں۔ اور اب ان کو بڑی محنت سے کھرچ کھرچ کر ضمیروں سے الگ کرنا پڑے گا!

ہمارے ملک میں ایک بہت بڑا گروہ ایسے لوگوں کا پایا جاتا ہے جو یقین وعزم کے جوہر حیات افزا سے بالکل محروم ہو چکا ہے ——— حالانکہ اس جوہر کے بغیر اجتماعی زندگی کا استحکام کبھی ممکن نہیں ہوا۔ اس ضروری جوہر کو گنوا دینے کے بعد یہ گروہ ایک انتہائی "قنوطیت" کے خطرناک مرض کا شکار بن چکا ہے۔ اس مرض کا خاصہ یہ ہے کہ جب رونما ہو جاتا ہے تو مریض میں کسل، ضعف، ناکارہ پن اور وہن کے آثار ابھر آتے ہیں۔ صبح و شام گردش کرتے ہیں، لیکن قنوطیت کے مریض کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ تاریخ کے ورق الٹے جاتے ہیں لیکن "اہل یاس" کے اندر کوئی حرکت نمودار نہیں ہوتی۔ فرائض پکارتے ہیں اور ذمہ داریاں بلاتی ہیں، لیکن متاع یقین وعزم کو کھو بیٹھنے والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی انقلاب کے قافلے جرس بجاتے ہوئے ان کے سامنے سے گزرتے ہیں، لیکن ان کی رگوں کا خون بدستور منجمد رہتا ہے۔ ذلتیں، نکبتیں اور مصیبتیں ان کے ٹھونکے لگاتی ہیں، لیکن ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں!

ایسا ایک کثیر التعداد گروہ ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس گروہ کے قنوطیت زدہ افراد باطل کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہیں اور ان پر کڑھتے بھی ہیں، لیکن اصلاح کی کسی تدبیر کے کامیاب ہونے کا ان کو یقین نہیں، حق کو حق مانتے ہیں اور شاید

دلوں میں اس کے غلبے کے لئے دعائیں بھی کرتے ہیں لیکن یہ توفیق نہیں کہ حق کی پکار پر اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی قوتوں کی پونجی اس راہ میں لگادیں۔ ان کو جب کبھی دعوتِ کار دی جاتی ہے تو بات ٹھیک ہے کہہ کر پھر حالات کی ناسازگاری اور لوگوں کی نااہلیت کا رونا رونے لگ جاتے ہیں۔ ہر دعوتِ حرکت کے مقابلے میں ان کا جواب یہ ہوتا ہے۔ کہ بس اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

مختصر یہ کہ قنوطی گروہ نہ صرف یہ کہ خود ہی مردانگی کو ایک مرتبہ رو پیٹ چکا ہے، بلکہ دوسروں کو بھی مایوسی کی چھوت لگانے میں سرگرم عمل ہے۔

ہمارے مریضانِ قنوطیت کی چند اقسام ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی علامات اور ہر ایک کے اسبابِ مرض جداگانہ ہیں، ان کی مختلف اقسام کا الگ الگ تذکرہ کئے بغیر بات نہ کھلے گی۔

خدا اور خدا کے دین سے مایوسی مریضانِ قنوطیت میں سے انتہائی خطرناک حالت تو اس گروہ کی ہے جو اپنے آپ سے مایوس ہے تو اس وجہ سے ہے کہ وہ خدا اور اسلام ہی سے مایوس ہو چکا ہے۔ اس گروہ کا مرض قریب قریب لاعلاج ہے، اِلّا ماشاءاللہ!

اس طبقۂ اولیٰ کی بیماری کی جڑ یہ ہے کہ زبان سے خدا اور اس کے دین کو ماننے کے باوجود اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے تعلق رکھنے کے باوجود اس کو خدا کے وجود ہی میں شک ہے۔ پھر اگر خدا کے وجود کا کوئی رسمی تصور ہے بھی تو اس کی صفات پر شعوری ایمان تو بہرحال باقی نہیں ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہمارے ہزاروں بھائی ایسے ہیں جو سرے سے یہ احساس رکھتے ہی نہیں کہ کوئی ایسی ہستی کائنات

کی خالق و ناظم ہے جو باختیار ہے، جو عادل ہے، جو تقدیر ساز ہے، جو جزا و سزا دینے والی ہے، جو انسان کے لئے حق کی راہوں پر چلنے میں حامی و ناصر ہے، جو قربانیوں کو ضائع جانے نہیں دیتی، جس نے کوئی اخلاقی ضابطے اور تمدنی قوانین بنائے ہیں، جس کی ہدایت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، جس کے وعدوں پر یقین قائم ہو سکتا۔ اور جو عالم الغیب والشہادۃ ہے۔

ان حضرات کے ذہن اندر سے فلسفۂ الحاد کے سامنے مفتوح ہو چکے ہیں، چنانچہ خدا کے متعلق صحیح عقیدے کے برقرار نہ رہنے کی وجہ سے ان کے دلوں کی گہرائیوں میں "اسلام" سے بھی پوری پوری مایوسی اور بددلی پیدا ہو چکی ہے۔ یہ لوگ "اسلام زندہ باد" بھی پکارتے ہیں، نماز روزہ بھی کر لیتے ہیں، نبی صلعم اور قرآن سے وابستگی کا اظہار کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کرتے، لیکن ان کی روحیں اسلام کے منزل من اللہ ہونے کا یقین کھو چکی ہیں، یہ اسے تیرہ سو سال پہلے کا وقتی دین سمجھتے ہیں۔ اور دورِ حاضر میں اس کے احیاء اور اس کے چل نکلنے کے بارے میں پوری طرح بدگمان ہیں۔ پھر ستم یہ کہ ان کو یہ بھی بھروسہ نہیں ہے کہ اگر اقامتِ دین کی جدوجہد میں یہ جان و مال سے کوئی حصہ لیں تو ان کی رائیگاں [illegible] کا صلہ دینے والا کوئی موجود ہے جس کے پاس بیکراں خزانے ہیں، بلکہ ان کے سامنے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے!

اس گروہ کے نزدیک ہر وہ اصول و نظام جو غالب ہو گیا ہو۔ اس کے سائے میں امن و چین سے بیٹھے چلے جانا اور ہر وہ ٹولی جو اقتدار پر قابض ہو گئی ہو اس کی رکاب تھام کر چلنا ہی بہترین مسلکِ حیات ہے!

چنانچہ جہاں تک باطل اصولوں اور غیر اسلامی نظاموں کے قائم کرنے اور چلانے کا تعلق ہے، یہ حضرات کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ یہ ہر نظامِ کفر و شرک اور ہر تہذیب فسق و فجور کے کامیابی سے چل نکلنے کو ممکن تسلیم کر لیتے ہیں، اور ان کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی ہم نوائی کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کرتے، لیکن جہاں سوال اسلام کے اصول و نظام کا آیا، بچارے "اوں آں" کرنے کے سوا اور کسی قسم کا جذبہ دکھانے پر قادر نہیں ہوتے۔

یہ حضرات نہایت دیدہ دلیری سے مسلمان کہلا کر یہ بھی کہہ گزرتے ہیں کہ اسلام چلا کے برس تھا؟ کبھی کہتے ہیں اسلام کی ماہیت ہی آج تک مشتبہ ہے تو اسے لے کے چلنا کیا معنی؟ کبھی فرمائیں گے کہ اسلام کے بارے میں فرقی اور گروہی اختلافات اتنے کثیر ہیں کہ جہاں نظامِ اسلامی کے قیام کا سوال چھڑا، باہم اختلافات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوگا، لہٰذا اس متبرک ورثے کو لپیٹا لپٹایا پڑے رہنا چاہئے۔ کبھی ارشاد ہوگا کہ آج کل دین کو مانتا کون ہے؟ سب کو اپنی دنیا بنانے کی پڑی ہے ——— الغرض یہ کسی طرح اپنی قوتوں کی کوئی رمق اسلام کے غلبے کے لئے صرف کرنے پر تیار نہ ہو سکیں گے۔

اس طبقے کو تو اسلام کے ان بنیادی عقیدوں کی دعوت دینے کی ضرورت ہے، جن کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کوشش کے نتائج کے ظہور کا لمبا انتظار کرنے کی ہمت ہونی چاہئے۔

ان بچاروں کی بالکل وہ حالت ہے (بلا تشبیہ تام) جسے قرآن نے "لا مولیٰ لهم" کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اور یہ حالت اس حالت کے بالکل برعکس

ہے جیسے قرآن نے "اللہ ولی الذین امنوا یخرجھم من الظلمت الی النور" کہہ کر پیش کیا ہے۔ یہ ایک بہت ہی قابلِ رحم حالت ہے۔ جس پر ہر سچے مسلمان کو عملی ہمدردی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ یہ ایک کارواں ہے جس کی مشعل گل ہو چکی ہے۔ اور جو غول بیابانی کے نرغے میں گھرا ہوا ٹامک ٹوئیے مارتا پھرتا ہے لیکن اس کی دشت نوردیوں کی کوئی منزل نہیں، بلکہ ان دشت نوردیوں کا حاصل صرف تکان ہے!

جو بدنصیب "ایمان باللہ" کے محور سے ہٹ گیا، اس کا اوّل بھی یاس و نومیدی ہے۔ اور اس کا آخر بھی یاس و نومیدی ہے۔ وہ محرومی کی منزل سے چلتا ہے۔ اور عمر بھر کے سفر کے بعد محرومی ہی کی منزل پر پہنچتا ہے ——— اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّیْ!

اس گروہ کے خوش بخت ترین افراد وہ ہیں جو خدا اور اس کے دین پر اپنا ایمان بالکل تو نہیں کھو بیٹھے، لیکن اپنی سیاہ کارگذاریوں کے پیش نظر اپنے خدا سے اور اس کے دین سے بدگمان ہیں۔ چنانچہ ان کو خدا اور دین سے ملتا بھی وہی کچھ ہے جس کی یہ توقع رکھتے ہیں جیسے کہ حضرت ابوہریرہ سے یہ ارشادِ نبوی (صلعم) مروی ہے کہ یقول اللہ تعالیٰ انا عند ظن عبدی بی۔ یعنی میرا معاملہ اپنے بندوں سے ویسا ہی ہوتا ہے جیساکہ وہ مجھ سے توقع رکھتے ہیں۔

چنانچہ اللہ کے دین سے سوئے ظن رکھنے والوں کے پلّے نامرادی اور قنوطیت کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا۔ اور اس طرح ان کی نامرادی اور قنوطیت میں اور اضافہ ہوتا رہتا ہے، وہی بات کہ

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ اور پھر اللہ نے اس بیماری کو اور بڑھا دیا!

اس طرح کے لوگوں کی گرہ کشائی کی واحد صورت یہ ہے۔ کہ ان کو اللہ سے اور اس کے دین سے اپنا معاملہ درست کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ تاآنکہ یہ غیر شعوری ایمان سے نکل کر شعوری ایمان کی طرف آئیں، یہ دورنگی کو چھوڑ کر یک رنگی اور حنیفیت اختیار کریں، یہ نفاق اور تضاد کی آلائشوں سے ضمیروں کو پاک کریں، یہ خدا کے مقابلے میں چالیں چلنے سے باز آجائیں۔ اور اس کے احکام و قوانین کا اپنے عمل سے مذاق اڑانا چھوڑ دیں۔ ان کا مرض اپنے گروہ کے متذکرہ صدر عنصر کے مقابلے میں زیادہ جلد علاج پذیر ہو سکتا ہے۔

بساطِ سیاست کے ناکام کھلاڑی

دوسرا اہم گروہ مایوسین جو سوسائٹی میں پھیلا ہوا ہے، ان لوگوں پر مشتمل ہے جو میدانِ سیاست میں اپنا کھیل ہار بیٹھا ہے۔ ایک جواری کی طرح جو اپنا سب کچھ داؤں میں لگا دینے کے بعد گھنٹوں مہروں کو حرکت دیتے دیتے یکایک جب دیکھتا ہے کہ حریف نے بازی مار لی تو اس کی ساری خیالی جنتیں دھڑام سے زمین پر آرہتی ہیں۔ رئیس اعظم بنتے بنتے وہ آناً فاناً کنگال ہو کے رہ جاتا ہے۔ ہمارے وہ ہزاروں بھائی سیاسیات سے بددل ہو کر قنوطیت کی انتہائی حالت میں مبتلا ہو گئے ہیں جنہوں نے اپنی جانیں اور اپنے مال بساطِ سیاست پر رکھ کر سالہا سال تک مہرے لڑائے۔ اور جب فیصلہ کی گھڑی آئی۔ تو انہوں نے یہ دیکھا کہ کھیل اس پر ختم ہوا کہ ان کا حریف ان

کی ساری متاع کو لے اڑا ہے! واقعتاً یہ حالات مضمحل کر دینے والے ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اب ان حضرات میں یہ حوصلہ نہیں رہا کہ وہ اپنے کھیلے ہوئے کھیل پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور نئے سرے سے بہتر خطوط پر دوبارہ جدوجہد کریں۔

اس طرح سیاسی بازی ہرنے والوں میں بالعموم یہ بیماری پیدا ہو جایا کرتی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کا سارا بار دوسروں کے کندھوں پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ثابت یہی کرتے ہیں کہ لوگ نااہل تھے اور حالات ہی ایسے ردی تھے کہ ہم کچھ نہ کر سکے، ورنہ خود ہمارے اندر کوئی کوتاہی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے غالب حریف کے "دربار" میں اعتراف شکست کر کے اس کے اقتدار کے پاسبان تک بننے پر اتر آتے ہیں۔ اور ایک وقت آتا ہے کہ اصلاح کی کوششوں کو روکنے میں ایسے ہی لوگ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ کیونکہ قنوطی گرتا ہے۔ تو گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اس کے گرنے کی کوئی حد نہیں ہوتی، اِلّا یہ کہ اسے بروقت امداد بہم پہنچ جائے۔

ٹھیک یہی بیماری ان تمام لوگوں میں کسی نہ کسی درجہ میں جڑیں چھوڑ رہی ہے۔ جو تقسیم ہند سے پہلے سیاست کی رزمگاہ کے بڑے مجاہد شمار ہوتے تھے۔ اور اپنے اپنے مورچوں سے داد شجاعت دے رہے تھے، لیکن تقسیم ہند نے اُن کے نظریۂ اصول، ان کے مسلک اور ان کے طرز سیاست کا چلن بالکل ختم کر دیا۔

یہ کتنا عبرت ناک منظر ہے۔ کہ بہت سے ذہین لوگوں کی ذہانتیں، بہت سے ارباب بصیرت کی بصیرتیں، بہت سے جوانمردوں کے عزائم، بہت سے سیاسی مجاہدوں کی عمروں کی قربانیاں اپنی قیمت کھو چکی ہیں۔ اور دوسری طرف وہ لوگ جو

ان کے سامنے طفلِ مکتب بھی نہ تھے۔ جنہوں نے کوئی قربانیاں نہیں دی ہیں جنہوں نے کوئی لمبی کشمکش نہیں کی ہے، وہ آج سربراہ کاری کے نشۂ پندار سے بدمست ہیں۔ جوتنے اور بونے کی محنت کرنے میں اور لوگ لگے رہے اور فصل کاٹ کے لے گیا کوئی اور!

اب ان کا کہنا یہی ہے کہ عوام اس قابل نہیں ہیں کہ کسی اچھے مقصد کے لئے کسی ٹھوس پروگرام پر چل سکیں، لہٰذا بہترین مسلک تو یہی ہو سکتا ہے کہ سیاست و تمدن کی گاڑی جدھر بھی چلتی ہے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

واقعہ یہ نہیں ہے!

ہم اپنے ان بھائیوں کی خدمت میں جو مختلف محاذوں پر لڑتے لڑتے اس انجام پر پہنچے ہیں کہ ہمیشہ کے لئے اپنے ہتھیار کھول کر "صاحبِ فراش" ہو جائیں۔ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ خدارا سنجیدگی سے اپنے سیاسی جہاد کی تاریخ کا جائزہ لیجئے! یقین جانئے کہ اگر کسی گروہ نے کوئی صحیح اصول اور صحیح مقصد اختیار کیا ہو تو کوئی "تقسیم" اس اصول و مقصد کی قدر و قیمت کو ختم نہیں کر سکتی۔ اور کوئی مجاہد حق کے موقف پر کھڑا ہو کر باطل سے نبرد آزما ہو رہا ہو۔ تو اسے جان دینے پر بھی شکست نہیں ہوا کرتی۔ آپ اسے تسلیم کریں گے کہ اسی دنیا میں وہ مقدس ہستیاں بھی گذری ہیں کہ جو اس حالت میں بھی اپنے حریفوں کے مقابلے میں فاتح تھیں، جبکہ ان کے سروں پر تشدد کے آرے چل گئے، جبکہ ان کی گردنوں میں پھانسی کے پھندے ڈالے گئے، جبکہ اُن کو آگ کے آلاؤ کے حوالے کیا گیا اور جبکہ ان کو کوڑے لگائے گئے اور ان کے چہروں پر سیاہی لیپ کر ان کو مجرموں کی طرح کوچہ و بازار میں پھرایا گیا۔ یہ حضرات صرف

وہ بازی کھیلے ہیں جس میں چاہے۔ ان کی ساری متاعِ حیات کھپ گئی لیکن ان کا حریف بازی جیت سکے ان کے سامنے سے کبھی نہ اٹھا۔ انہوں نے جو جنگ لڑی اس میں نہ پیٹھ دکھانے پر تیار ہوئے، نہ اپنے ہتھیار کھول کر انہوں نے دشمن کے حوالے کیے کہ لو اب ہمیں لونڈی غلام بنا لو!

دنیا میں ناکامی صرف ان کے لئے ہوتی ہے۔ جو کسی اٹل حقیقت اور کسی ثبت قدر رکھنے والے مقصد کو لے کے نہیں اُٹھتے، بلکہ ان وقتی مقاصد پر جان ومال کی بازی لگا دیتے ہیں۔ جن کی اہمیت آج ہوتی ہے۔ تو کل نہیں ہوتی، جن کی قدر ایک جغرافی خطے کے اُس طرف ہوتی ہے۔ اِس طرف نہیں ہوتی، اور جن سے عوام ایک حال میں دلچسپی لیتے ہیں، دوسرے حال میں نہیں لیتے۔ اس طرح کے مقاصد کی جنگ میں جسے فتح ہوتی ہے۔ اُسے عارضی فتح ہوتی ہے۔ اور جسے شکست ہوتی ہے وہ لازماً مایوسی و نامرادی کے غار میں جا گرتا ہے۔ ایسے مقاصد کے لئے کشمکش کر کے ناکام ہونے والوں کا بھی ——— اور بظاہر کامیاب ہونے والوں کا بھی ——— بالآخر انجام ویسا ہی ہوتا ہے۔ جس کو کتاب اللہ نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"فمثلہ، کمثل صفوانٍ علیہ تراب، فاصابہ وابلٌ فترکہ صلداً، لایقدرون علیٰ شئ مما کسبوا"

سو اس کی مثال ایسی ہے، جیسے صاف، پتھر ہو، اس پر مٹی کی ایک تہ ہو پھر اس پر برس جائے زور کا مینہ، اور اسے چٹیل کر کے چھوڑ جائے،

اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے یوں واضح فرمایا ہے

وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلنٰه هبآءً منثورًا

اور ہم نے آیا ان کی اہم سرگرمیوں کو جو انہوں نے سرانجام دی تھیں۔ اور پھر اسے غبار پریشان بنادیا۔

پس آج اگر آپ یہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ آپ کی کشت کاریوں کا کوئی حاصل نہیں تو مایوس ہو کر بیٹھ رہنے کی بجائے اس پر غور کرنا چاہئے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ——— کہیں آپ نے اپنی جھولی میں گھٹیا مقاصد کے بیج تو نہیں ڈالے تھے؟ اور کہیں آپ نے چٹیل زمین پر بیج تو نہیں بکھیر دیا تھا؟

کاشت کارانِ حق جو کلمۃ اللہ کا بیج جھولیوں میں ڈال کے نکلتے ہیں وہ لمبی محنت کر کے بجائی کرتے ہیں۔ وہ کھیتی کو اپنی ہڈیوں کے چونے کی کھاد دیتے ہیں اور اپنے خونِ دل سے اسے سیراب کرتے ہیں۔ لیکن ان کی ہمیشہ زندہ رہنے والی روحیں کبھی اس سوئے ظن میں مبتلا نہیں ہوتیں کہ ان کے بوئے ہوئے بیج مر سکتے ہیں، ان کی کھپائی ہوئی محنت رائگاں جا سکتی ہے۔ اور ان کی جانفشانیوں کا انجام نومیدی و نامرادی ہو سکتا ہے۔ بلکہ جب وہ بیج بو رہے ہوتے ہیں۔ تو ان کی نگاہ ان چمن زاروں اور تاکستانوں پر جمی ہوتی ہے۔ جو اس تخم ریزی کے نتیجے میں بہت آگے چل کے نمودار ہونے والے ہوتے ہیں۔

ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے۔ کہ بیج لیا جائے جو مرنے والا نہ ہو۔ اور جب اُگے تو برگ و بار لائے، نہ کہ کانٹے بکھیرے، دوسرے یہ کہ کاشت صحیح طریقوں سے کی جائے، اور تیسرے یہ کہ ”دہقان“ کو یہ یقین ہو کہ جس زمین پر

محنت صرف کر رہا ہوں۔ اس کے مالک کے ہاں میری محنت محفوظ رہے گی!

ہمارے سیاسی مایوسین اگر غور کریں۔ تو وہ ماضی کا جائزہ لینے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ کہ ان تین تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر انہوں نے جانفشانیاں کی ہیں۔ چنانچہ آج وہ ایک ناخوشگوار صورت حالات سے دوچار ہیں۔

سیدھی بات یہ ہے کہ اگر کسی فرد یا گروہ کی جانفشانیوں کا منتہا رضائے الٰہی کا حصول ہو تو تلخ سے تلخ صورت حالات بھی اسے بددل نہیں کر سکتی۔ اور وہ اپنی جدوجہد کو بحیثیت ایک ڈیوٹی کے سرانجام دینے میں کبھی کوتاہ کار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ مایوسی کا کوئی احساس اس کے اندر ہو سکتا ہے یہ وہ مقصد ہے جس کی قدر و قیمت کبھی ضائع نہیں ہو سکتی۔ جس نے اعلائے کلمۃ اللہ پر کمر ہمت باندھ لی اس کو نہ اس پر ضد کہ کوئی ملک ایک رہے اور نہ اسے اس سے چڑ کہ وہ دو یا دو سے زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے، پھر اسے نہ اس کی پرواہ کہ یہ چھٹی صدی ہجری کا دور ہے یا چودھویں صدی کا زمانہ ہے۔ پھر اسے نہ اس سے گھبراہٹ کہ سر پر باہر کا امپیریلزم مسلط ہے۔ یا گھر کے بتوں نے خداوندی جمالی ہے ——— اسے تو ہر حال میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ پھر اگر اس کی دعوت پھیل نکلے تو بھی اسے اطمینان کہ اس کی مُزد محفوظ ہے۔ اور اگر ساری دنیا مل کر اس کی دعوت کو روک دے اور اسے پھانسی پر لٹکا دے، تو بھی اسے اپنے مالک پر پورا بھروسہ ہے کہ اس کا اجر اسے بہر حال مل کر رہے گا! اس کا ایمان اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کی صداقت کی پے بہ پے گواہی دیتا ہے کہ :-

ان اللہ لا یضیع اجر   اللہ تعالیٰ بھلائی کی راہ اختیار کرنے والوں

المحسنین (پ ۱۱ ع ۴) کی مزدوری کو ضائع نہیں جانے دیتا۔

اور :-

ان الذین یتلون کتب اللہ واقاموا الصلوۃ وانفقوا مما رزقنھم سرا وعلانیۃ یرجون تجارۃ لن تبور ہ لیوفیھم اجورھم ویزیدھم من فضلہ انہ غفور شکور ہ (پ ۲۲ ع ۱۶)

وہ لوگ جو کتاب الٰہی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور نماز قائم کرتے ہیں اور خفیہ و علانیہ اس رزق میں سے (راہ حق میں) صرف کرتے ہیں۔ جو ہم نے ان کو عطا کیا ہے اور اس سوداگری پر آس لگائے بیٹھے ہیں جو کبھی خسارے میں نہیں جا سکتی ——— (سمجھ لو) کہ ان کو ان کے معاوضہ ہائے کار پورے کے پورے دیئے جائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے اس میں اور بھی اضافہ کر دے گا۔ بلاشبہ وہ (خطاؤں کو) معاف کرنے والا بھی ہے۔ اور محنتوں کا حق ادا کرنے والا بھی ہے!

پس ہمارے سیاسی مایوسین کو دلوں کی گہرائیوں کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے کیا فی الواقع اپنے لئے وہی کاروبار پسند کیا تھا جس میں خسارے کا کوئی امکان نہیں؟ ——— اور کیا انہوں نے اپنا حساب اللہ بنک میں کھولا تھا جس کے دیوالیہ ہونے کا کوئی امکان نہیں! وہ اگر دیانتداری سے اپنے ضمیروں کے اندر اتر کے غور کریں گے تو ان پر از خود یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کی نگاہوں نے کاروبار کے انتخاب میں بھی اور اس کے طریق کار کے انتخاب میں بھی

غلطی کی ہے۔ ان کا کاروبارِ سیاست بہر حال دنیوی مفادات سے متعلق رہا ہے۔ اور انہوں نے اپنا پورا حساب اللہ کے بنک میں نہیں کھولا بلکہ ایسے بنکوں میں اپنا زیادہ سرمایہ لگایا ہے۔ جو دیوالیہ ہونے والے تھے اور وہ دیوالیہ ہو گئے۔

اب کیا ہو؟

اس سوال کے جواب میں صحیح مشورہ کسی خیر خواہ کی طرف سے اگر ہو سکتا ہے۔ تو صرف یہ ہے کہ ایک حوصلہ مند تاجر کی طرح جو ایک کاروبار میں ایک مرتبہ سرمایہ ڈبو دینے کے بعد ہمت ہار کے بیٹھ نہیں رہتا۔ بلکہ بچی کھچی پونجی کو پھر سوچ سمجھ کر کسی یقینی نفع دینے والے کاروبار میں لگانے کی تدبیر کرتا ہے۔ آپ حضرات اپنے ضمیروں میں سے رہا سہا سرمایۂ عزم و اخلاص نچوڑیں اور اسے کسی منفعت بخش "کاروبار" میں لگا دیں۔ یقین جانیئے کہ ہمت ہار کر اپنی آزاد تجارت کی بساط لپیٹ دینے کے بعد آپ کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہوگا کہ آپ دوسروں کے ہاں "نوکر" بھرتی ہوں۔ اور جن سے کبھی آپ کو برابری کے دعوے تھے اور جن کے سامنے کبھی سینے تان کر آپ چلا پھرا کرتے تھے، ان کے جی حضوریوں اور دست نگراں کی صفوں میں کھڑے ہوں۔ اس ذلیل حالت میں مبتلا ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آپ ایک خوانچہ ہی لگا بیٹھیں، لیکن وہ آپ کا اپنا آزاد کاروبار ہونا چاہئے۔ کاروبار میں خدشہ نقصان (Risk) بہرحال ہوتا ہے۔ اور اسے برداشت کرنے کے لئے جتنی مردانگی کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بغیر چھوٹے سا چھوٹا کاروبار بھی نہیں چل سکتا۔ یہ خدشہ نقصان

Risk) صرف وہ لوگ برداشت کر سکتے ہیں۔ جن کے دلوں میں اس خدشہ کے مقابلے میں امیدِ منفعت زیادہ قوی ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی قنوطی اور کوئی یاس زدہ شخص اپنے بل بوتے پر ایک روپے کا بھی کاروبار کر سکے! قنوطی اور یاس زدہ لوگ دوسروں کی جوتیاں اٹھانے کے سوا اور کسی کام کے نہیں رہتے۔

آپ حضرات کا تو وہ حوصلہ تھا کہ آنکھیں بند کر کے متاعِ حیات ایک ایسے جوئے میں جھونک دی جس میں جیت کا امکان بہرحال پچاس فیصدی سے زیادہ نہ تھا، اور یا پھر اب یہ نامردی کہ اقامتِ دین کے یقینی نفع بخش کاروبار میں ایک کوڑی تک لگانے کا دل گردہ نہیں! ببیں تفاوت رہ از کجاست تابکجا!

آپ حضرات کی یہ عجیب حالت ہے۔ کہ اگر آپ کو سرگرمیوں کے احیاء کی دعوت دی جاتی ہے کہ اُٹھیئے، امیدوں کے چراغوں میں تیل ڈالئے اور آزمودہ راہوں سے بچ کر جن میں سے ہر ایک راہ ضلالت کی تعریف میں آئی ہے، اُس سواءالسبیل اور اس صراطِ مستقیم پر چل کھڑے ہو جیئے۔ جس پر انبیاء اور صلحاء کے نقوشِ قدم ثبت ہیں، تو آپ دعوت دینے والوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں ——— جیسے ایک صاحبِ تجربہ بزرگ کسی ناتجربہ کار نوجوان کے خیالات کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ آپ کو وہ لوگ احمق دکھائی دیتے ہیں جو آپ کے خارج حریفوں سے اختلاف رکھتے ہوئے حق کے غلبے کے لئے منظم طریق سے سرگرم عمل ہیں۔ آپ خود کام کرنا چھوڑ چکے ہیں۔ لیکن جو لوگ کام کرنے کی ہمت

رکھتے ہیں ان کو اپنے تجربات کی روشنی میں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تم بھی یہ سب کچھ کر کے دیکھ لو، تمہارا انجام بھی اسی طرح قنوطیت ہوگا جس طرح ہمارا ہوا۔ آپ کا مشورہ ساری دنیا کے لئے ہے کہ کسی تبدیلی کی جدوجہد میں حصہ نہ لو۔ بلکہ کھاؤ، پیو، شادی بیاہ رچاؤ، بچے پیدا کرو، اور دنیا سے رخصت ہو جاؤ! — حالانکہ اس کے برعکس خود آپ کو اپنی ناکامی کے پس منظر میں اس کے وجوہ تلاش کرنے چاہئیں۔ اور از سر نو اپنے لئے ایک پائدار اصول اور ایک صحیح راہ عمل کا انتخاب کر کے حرکت میں آنے کی صورتیں نکالنی چاہئیں!

براہ کرم اپنے ذہن پر، اپنے طرز فکر پر اور اپنے مشوروں پر نظر ثانی کیجئے —— —— دوسروں کے لئے نہیں، اپنے فائدے کے لئے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد جب آپ کے سامنے شروع ہو چکی ہے۔ تو پھر اذانِ دعوتِ حق کی آواز کانوں میں پہنچنے کے بعد آپ کا فرض یہ ہے کہ آپ اٹھیں اور لپک کے آئیں اور ایک سپاہی کی طرح صفِ اوّل میں آ کھڑے ہوں۔ اور اللہ کے مطالبات کے مطابق ایک طرف گردن بندگی کو خم کریں اور دوسری طرف خیر و شر کی جنگاہ میں پورے ولولے کے ساتھ دادِ شجاعت دیتے ہوئے نظر آئیں۔ لیکن یہ تو ایک عجیب مرض ہے کہ اذان ہو یا رجز، آپ حق کی پکار سن کر حالات کا رونا رونے بیٹھ جائیں۔ حق کی کامیابی کے عدم امکان پر دلائل لڑانا شروع کر دیں اور کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوں! یہ حقیقت بہرحال آپ کو جان لینی چاہئے کہ:-

من اراد الاخرة وسعی لها سعيها وهو مؤمن

جس کسی نے انجام کار کی (بہتری) کا قصد کیا۔ اور اس کے لئے اس کے تقاضوں کے

فاولٰئک کان سعیھم مشکورا (پ ۱۵ ع ۲)	مطابق دوڑ دھوپ کی بحالیکہ وہ مومن ہو۔ تو ایسے لوگوں کی جانفشانیوں کا حق ادا کیا جائے گا۔

یہ وعدہ صرف اُس انجام کار ہی سے متعلق نہیں ہے۔ جو زندگی بعد موت میں پیش آنے والا ہے، بلکہ عین اس مادّی دنیا کی زندگی سے بھی اس کا تعلق ہے۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر واضح کیا گیا کہ:

من عمل صالحا من ذکر اوانثیٰ وھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون ۰	مردوں اور عورتوں میں سے جو کوئی عمل صالح پر کاربند ہُوا، بحالیکہ وہ مومن ہو، تو اسے یقیناً ہم وہ زندگی نصیب کرینگے جو حیات طیبہ ہو۔ اور ایسے لوگوں کے اجر کا حساب ہم لازماً چکائیں گے، اُن اچھے اعمال کے لئے جو انہوں نے سرانجام دیئے۔

یہ ضابطہ جہاں افراد کے لئے ہے، وہاں گروہوں کے لئے بھی ہے۔ کوئی فرد یا جماعت جس نے اعلائے کلمۃ اللہ کو زندگی کی جدوجہد کا محور بنایا ہو، جس نے رضاء الٰہی کے حصول کو منتہا ٹھہرایا ہو، اور جس نے اپنی سعی و جہد کو مقصدِ حق کے تقاضوں کے مطابق صحیح حدود کا پابند رکھا ہو۔ اس کے لئے دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت میں بھی۔ اس کی حیات بہر حال طیب ہوتی ہے، اس کا قلب ہمیشہ مطمئن ہوتا ہے، اس کی روح ہمیشہ پُر اُمید ہوتی ہے —— اور کوئی کٹھن سے کٹھن منزل ایسی نہیں، جہاں اسے نامرادی اور مایوسی اور قنوطیّت کا سامنا کرنا پڑے۔ جس فرد اور جس جماعت نے اطمینان کھو دیا۔ یقین کا جوہر ضائع کر دیا۔ امیّد کی روشنی گم کر دی اسے بہر حال یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے اصُول، مقصد اور طریق کار میں بنیادی کمزوریاں

نہیں! اگر ہمارے سیاسی مایوسین کو یہ حقیقت محسوس ہو جائے۔ تو اب بھی پانسہ پلٹ سکتا ہے۔

تھڑدلے پن کے مریض ہماری ملت کا تیسرا بڑا قنوطی عنصر وہ ہے۔ جو شخص اپنے تھڑدلے پن کی وجہ سے بار بار دل شکستہ ہوتا ہے۔ یہ عنصر خدا اور اس کے نبی اور دینِ برحق سے وابستگی رکھتا ہے اور نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا دین اس کے ملک پر غالب ہو۔ اقامتِ دین کے لئے دعائیں بھی کرتا ہے حق کے لئے جدوجہد کرنے والوں اور اس جدوجہد میں مصیبتوں کا سامنا کرنے والوں سے ہمدردی بھی رکھتا ہے، لیکن بہر حال چونکہ اس عنصر پر مایوسی کے دَورے پے بہ پے پڑتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے اس عنصر کی قوتیں تحریکِ حق کے کام نہیں آ سکتیں۔ اُلٹا اس کی قنوطیت عوام کو بزدل بناتی ہے!

ان تھڑدلے پن کے مریضوں کی تین حالتیں ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کو الگ جدا جدا بیان کئے جاتے ہیں :-

بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جن کے جذباتِ حمیتِ دین اتنا وسیع ظرف نہیں رکھتے۔ کہ نتائج کے رُونما ہونے کا وقت آنے تک صبر کے ساتھ مسلسل محنت کرتے چلے جائیں، بلکہ جب ان کی خواہش کے مطابق نتائج جلد رونما نہیں ہوتے، عوام کی زندگیاں سرعت سے نہیں بدلتیں، اقتدار ہدایت کو قبول نہیں کرتا تو یہ دل برداشتہ ہونے لگتے ہیں کہ شاید حق کا غلبہ ممکن نہیں ہے۔

ان حضرات کی نگاہیں اگر اسلام و جاہلیت کی کشمکش کی تاریخ پر بھی ہوں تو

انہیں اندازہ ہو کہ اسلام کی جنت کرہ ارضی پر آراستہ کرنا کسی شعبدہ بازی سے ممکن نہیں۔ بلکہ یہ کام ایک لمبی محنت کا محتاج ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی محنت ایک صالح مستقبل کی تعمیر میں صرف کی ہے۔ تب کہیں جا کے تاریخ کو ایک دور سعادت حاصل ہوا ہے۔ یہاں حکم یہ ہے کہ عمر نوح "دعوت الی اللہ" میں کھپا دی جائے، چاہے بظاہر احوال قرنوں کی جدوجہد کے بعد خدا کا سپاہی وقائع کے متعلق یہی دردناک رپورٹ پیش کرنے پر مجبور ہو کہ:۔

رب انی دعوت قومی لیلاً ونہاراً فلم یزدھم دعاءی الا فراراً ۔ وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذانھم ۔ واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکباراً ۔

اے میرے رب! میں نے رات دن اپنی قوم کو پکارا، لیکن میری پکار سے ان کا گریز بڑھتا ہی گیا! اور میں نے جب بھی ان کو اس غرض سے بلایا کہ آپ اُن کی مغفرت فرمائیں تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اوپر سے کپڑے لپیٹ لئے، پھر ہٹ سے کام لیا اور اکڑ بازی دکھائی ــــ انتہا درجے کی اکڑ بازی!

یہ وہ مہم ہے جسے عیسیٰ علیہ السلام شروع کرتے ہیں لیکن ان کی زندگی گذر جاتی ہے اور مہم سر نہیں ہوتی، بلکہ ان کا شروع کیا ہوا کام محمد صلے اللہ علیہ وسلم پورا فرماتے ہیں۔ اللہ نے انسانی تاریخ کے انقلابات کے جو قوانین اور طریقہ ہائے کار ٹھہرا رکھے ہیں ان میں جلد بازی کی کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ وہ کسان کے سے صبر کے متقاضی ہیں سورۂ معارج میں انہی قوانین کی ایک حقیقت یوں بیان کی گئی ہے:۔

سئال سائل بعذاب واقع

ایک مطالبہ کرنے والے نے ٹوٹ پڑنے والے

للکفرین لیس لہٗ دافع ۝ من اللہ ذی المعارج ۝ تعرج الملٰئکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ ۝ فاصبر صبرا جمیلا ۝

عذاب کا مطالبہ کیا ! (حالانکہ اس) سرکشی کرنے والوں کے پاس کوئی اسے ٹال سکنے والا نہیں ہے، ـــــ اس اللہ کی جانب سے جو ارتقائی منازل کا مالک ہے! (دنیا کا انتظام چلانے والے) ملائکہ اور روح (احکام اور فیصلے لینے کے لئے) اس کی طرف زینہ بزینہ صعود کرتے رہتے ہیں، ایک ایسے لمبے دن میں جس کی مقدار (انسانی جنتریوں کے لحاظ سے) پچاس ہزار سال کی ہے!

پس (اے نبی صلعم) صبر کرنے کے بہترین طریق سے صبر کیجئے!

انھم یرونہ بعیداً ۝ ونراہ قریباً ۝

یہ لوگ عذاب الٰہی کو بہت دور پاتے ہیں۔ لیکن ہم اسے بالکل قریب دیکھتے ہیں!

نبی صلعم اور آپ کے صحابہ جب دعوتِ حق دیتے ہوئے ایک عذاب کے انجام سے کفار کو ڈراتے تھے۔ تو وہ ان جانبازانِ حق کی بظاہر (نعوذ باللہ) حقیر سی قوت کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے ذہن میں یہ بات سماتی ہی نہ تھی کہ یہ چند آدمی قوم کی کایا پلٹ سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے ہم پر اللہ کی طرف سے خود ان کے ہاتھوں عذاب آسکتا ہے۔ چنانچہ مخالفین حق ان کو چیلنج کرتے تھے کہ دیکھو ہم ڈٹ کے حق کا انکار کر رہے ہیں پس کیوں نہیں تم عذاب لے آتے! اس طرح طنز و تعریض سے جانبازانِ حق کے جذبات پر بھی گہرا اثر پڑتا تھا، خود نبی صلعم کا دل بھی دکھتا تھا کہ یہ خدا کے احکام

کو ٹھکرانے والے اور آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑانے والے زمین پر اقتدار جمائے کیوں دندناتے پھرتے ہیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حق کے سپاہیوں کو یقین دلایا کہ تبدیلی مقدر ہے، پانسہ پلٹ کے رہے گا، اقتدار اہلِ حق ہی کو ملے گا اور منکرین پر لازماً عذاب آکے رہے گا لیکن اس انقلاب کے لئے ہمارے قوانین ایک خاص تدریج سے کام کرتے ہیں، لہٰذا صبر سے کام لو، ہمت ہارنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ صبر جس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، اس کے بغیر کسی تبدیلی کا علم اٹھانا درست نہیں ہے، کجا کہ اسلامی انقلاب کا نعرہ بلند کیا جائے۔

اسی سلسلے میں دوسری جگہ فرمایا کہ:۔

ولکل امۃ اجلٌ فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃً ولا یستقدمون!

ہر گروہ کے لئے (اس کے احوال و اعمال کے لحاظ سے مہلت کار کے خاتمے کی) ایک گھڑی معین ہے، پس جب وہ گھڑی آجاتی ہے تو نہ وہ اس سے ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں، نہ ایک لمحہ آگے بڑھ سکتے ہیں!

یعنی ہر قوم، ہر جماعت، حکومت، وزارت کیلئے احوال و اعمال کے لحاظ سے اللہ کے ہاں ایک خاص حد تک مہلت کار معین کی جاتی ہے اور اس کو اصلاح و ترقی کے لئے قانونِ امہال کے تحت باقاعدہ موقعہ دیا جاتا ہے۔ جب تک یہ مہلت کار اور موقع اصلاح ختم نہ ہو جائے۔ نئی طاقتوں کو پورے صبر کے ساتھ تبدیلی کی تکمیل کی جدوجہد جاری رکھنی ہوتی ہے، لیکن جب یہ مہلت اور موقعہ ختم ہو جائے تو پھر اس میں اضافہ کرنا کسی کے بس میں نہیں!

حق و باطل کی کشمکش کا فیصلہ کرنا دراصل دنیا کی برسرِ اقتدار طاقتوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ خود اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ حقیقت جن لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اپنی مساعی کی کامیابی کے بارے میں شبہات اور ان کے نتائج کے ظہور کے بارے میں مایوسی میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔ مکہ کے داعیانِ حق کے گروہ میں جن لوگوں کے اندر اس قسم کے اثرات وقتی طور پر ابھر آیا کرتے تھے، ان کی تسلی کے لئے قرآن نے نبی صلعم کی زبان سے، بظاہر مخالفین و معاندین کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہلوایا کہ:

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ط مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ط اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝ (پ ۷، ۱۳۶)

ان سے کہہ دیجئے کہ میں تو اپنے رب کی طرف سے اتاری ہوئی دلیل (دلیلِ حق) پر قائم ہوں، اور تم نے اسے جھٹلایا، میرے بس میں وہ (عذاب) نہیں ہے جس کے لئے تم شور مچا رہے ہو۔ (اس کے بارے میں) حکم دینا اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں ہے وہ حق کو واضح کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے!

وہ لوگ جو اپنے رب کی طرف سے نازل ہونے والے قطعی اور یقینی دلائل پر اپنی سرگرمیوں کی بنیاد رکھ رہے ہوں، ان کو ہر لحظہ یہ یقین رکھنا چاہئے کہ فیصلہ بہرحال اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور وہ "خیر الفاصلین" ہے۔ اور اس نے اپنی تعریف میں خود کہا ہے کہ واللہ یقضی بالحق "یعنی وہ عدل کے ساتھ حساب چکاتا ہے! وہ مساعی کو نہ تو رائگاں جانے دینے والا ہے، نہ ان کے

نتائج کے ظہور کے ٹھیک وقت آجانے پر کسی طرح کی تاخیر کرنے والا ہے۔ یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے رہے تو نہ بے صبری پیدا ہو سکتی ہے، نہ مایوسی!

مکہ میں جب کشمکش شدید تھی اور آزمائشوں کی بھٹی گرم تھی اور حق کا داعی اعظم (صلعم) اس بات پر کُڑھ رہا تھا کہ جن کی وہ خیر خواہی میں سرگرداں ہے، وہی اس کے دشمن ہو کھڑے ہوئے ہیں تو اس وقت اسے مایوسی کی طرف مائل ہونے سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یوں خطاب کیا۔

قد نعلم انه ليحزنك الذي يقولون فانهم لا يكذبونك ولكن الظلمين بايت الله يجحدون ۝ ولقد كذبت رسل من قبلك فصبروا على ما كذبوا واوذوا حتى اتهم نصرنا ج ولا مبدل لكلمت الله!

ہم جان چکے ہیں کہ (اے نبی صلعم) آپ کو وہ یاوہ گوئی جو یہ (انکار کرنے والے) لوگ کرتے ہیں دُکھ دیتی ہے۔ سو یہ یقین کیجئے کہ یہ آپ کو نہیں جھٹلاتے۔ بلکہ یہ ظالم تو خود خدا کی آیات سے انکار کرتے ہیں! اور یہ معاملہ آپ ہی کو نہیں پیش آیا) آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے۔ ان پیغبران کو دُکھ دیئے گئے، لیکن انہوں نے اس (روش) پر صبر کیا۔ جس کے ذریعے، انہیں جھٹلایا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہماری مدد ان کو پہنچ گئی! اور اللہ کے اٹل قوانین کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے!

ولقد جاءك من نباى المرسلين ۝ و ان كان كبر عليك

اور تصریح کے باب [illegible] اگر ان لوگوں کا اعراض تمہارے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ تو پھر (سوچو!) کہ اگر تم زمین میں کوئی سرنگ کھود کر یا

اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم باٰیۃ - ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدیٰ فلا تکونن من الجٰھلین ۰

آسمان پر سیڑھی لگا کر کوئی (فیصلہ کن) آیت لا سکتے ہو۔ تو لا دو! خدا اللہ نے اگر چاہا ہوتا۔ تو وہ ان کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس جذباتی نہ ہو!

نبی صلعم اور آپ کے رفقا کو متنبہ کیا گیا کہ لوگوں کے حق کو جھٹلانے اور اہل حق کو ایذا دینے کے رویے پر کڑھنا بیکار ہے اور غلبہ حق میں دیر ہوتے دیکھ کر گھبرانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ حالات ہمیشہ داعیان حق کو پیش آتے ہیں۔ سبھی کو جھٹلانے والوں نے جھٹلایا، اور دکھ دینے والوں نے دکھ دیا ہے۔ لیکن اس ساری کشمکش کے لئے کچھ خدائی ضوابط ہیں جو ہر دور میں اپنا کام برابر ایک نہج سے کرتے ہیں۔ اور ان کے تحت آخر کار معینہ نتائج نکل کے رہتے ہیں۔ لیکن اگر تم ان قوانین ——— کلمت اللہ ——— کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے جلد بازی چاہتے ہو اور گھبراہٹ اور مایوسی میں پڑتے ہو تو پھر اگر جلدی سے کچھ کر دکھانا تمہارے بس میں ہو تو اپنی سی کر دیکھو۔ زمین میں سرنگ نکال کر کوئی فیصلہ کن آیت کھود نکالو یا آسمانوں میں سیڑھی لگا کر کوئی ہتھیار اتار لاؤ! ظاہر ہے کہ تم قوانین الہیٰ سے بے نیاز ہو کر کچھ کر نہیں سکتے۔ لہذا کڑھنے اور بددل ہونے کے بجائے صبر سے کام کرنے کا جو سیدھا طریقہ ہے اس کو اختیار کرو اور محنت کرتے جاؤ!

پھر یہ بھی واضح کر دیا کہ :-

فذکر انما انت مذکر! پس آپ ان کو (حق کی) یاد دہانی کرائیے، آپ

لست علیھم بمصیطر — صرف حق کی یاددہانی کرنیوالے ہیں، ان پر (اصلاح کے) دارو غے نہیں بنائے گئے!

یعنی تحریک حق کے سپاہیوں کا کام اصلاح کی جدوجہد ہے، نتائج کی ذمہ داری ان پر نہیں! وہ دعوت دینے کے ذمہ دار ہیں، لوگوں کے قلوب کو عملاً کسی جبر سے بدلنا ان کے سپرد نہیں کیا گیا! ان کا فرض انقلاب کی کوشش ہے، لیکن انقلاب کو عالم واقعہ میں برپا کر کے تکمیل تک پہنچانے کا تعلق اُن سے نہیں، خود اللہ سے ہے۔

دین کے جو خادم اپنی ذمہ داری کی حدود سے آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی ذمہ داریوں پر بھی ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں، ان کو پہلے قدم ہی پر مایوسی آگھیرتی ہے۔ اور وہ بددلی کے ساتھ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں کہ بس اب کچھ نہیں ہو سکتا!

دعوتِ حق اور تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کا کام بالکل ایک کسان کا سا ہوتا ہے۔ ایک مدت کھیتی کو تیار کرنے پر صرف ہوتی ہے، پھر اسے سینچنا ہوتا ہے، پھر اس میں بیج ڈالنا ہوتا ہے، پھر اس کے گرد باڑ کھڑی کرنی ہوتی ہے، پھر اس کی نلائی اور گوڈی کرنی ہوتی ہے، اور پھر صبر سے اس "اجلِ مسمّی" کا انتظار کرنا ہوتا ہے جبکہ وہ اپنا حاصل دے۔ اگر کسان بے صبرا ہو اور ہل جوتنے کے ساتھ ہی زمین سے مطالبہ کرے کہ لا فصل دے، یا بیج ڈالنے کے ساتھ ہی اس سے معاوضۂ محنت طلب کرے تو زمین اسے مایوسی و نامرادی کے سوا اور کچھ نہ دے سکے گی۔ ایسے ہی اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کو انسانی تمدن و سیاست کی کھیتی پر لمبے صبر کے ساتھ محنت کرنی ہوتی ہے اور نتائج کے لئے اجلِ مسمّٰی کا انتظار پورے سکون سے کرنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کے کچھ پلے پڑتا ہے۔ ورنہ اگر بے صبری کا

یہ عالم ہو کہ ادھر آپ بیج ڈال کے فارغ ہوئے، ادھر آپ بورے نوچیاں لے کے پہنچ گئے کہ بس اب پھلوں اور غلے کو گھر پہنچانا ہے، تو ظاہر بات ہے کہ پھلوں اور غلے کا تو کیا سوال وہاں تو کھیتی میں کوئی کونپل بھی پھوٹتی ہوئی نظر نہ آئے گی۔ ایسا بے صبرا کسان بددل اور مایوس ہی تو ہوگا! بے صبروں کے لئے موزوں پیشہ کاشتکاری نہیں بلکہ بھیک مانگنا ہوتا ہے کہ ادھر سوال کیا اور اُدھر کسی خدا ترس سے پکی پکائی روٹی مل گئی!

اللہ نے تحریکِ حق کے کارکنوں کے لئے صبر سے محنت کرنے کو لازم ٹھہرایا ہے۔ اس مطالبے کو پورا کئے بغیر اگر آپ دن میں ہزار مرتبہ بھی اس بات کے لئے دعائیں کریں کہ غیر اسلامی نظام کا غلبہ ختم ہو اور اسلامی نظام غالب ہو جائے تو یہی دعائیں موجبِ ثواب سہی ——— لیکن انقلابِ حق کے بپا کرنے میں یہ بالکل لا حاصل رہیں گی!! ایسی دعاؤں میں جان اسی وقت آسکتی ہے کہ جب "تواصو بالحق" کے فریضے کو "تواصو بالصبر" کے ساتھ کوئی منظم جماعت انجام دے رہی ہو!

پس آپ حضرات اللہ کے قوانین کا طریق کار اگر ذہن نشین کر لیں تو پھر آپ مایوسی کے زرغے سے نکل سکتے ہیں، ورنہ اگر آپ نے کلمۃ اللہ کے مفہوم کو پیشِ نظر نہ رکھا اور ان کے تقاضے پورے نہ کئے تو آپ خود تو قنوطیت کا شکار رہیں گے ہی نہ جانے اور کتنے حوصلہ مند افراد کے دل توڑ کے اس دنیا سے رخصت ہوں گے اور اس طرح اندیشہ ہے کہ آپ غلبۂ دین کی حمایت کے بجائے ایک طرح سے صد عن سبیل اللہ کے مجرم قرار پا جائیں۔ وقت ہے کہ آپ اپنے طرزِ فکر کو بدل لیں اور اپنے دلوں میں امید اور یقین کے بیج بوئیں!

ٹھہرو- مایوسین کا دوسرا طبقہ ان پر مشتمل ہے۔ جو مشکلات کو دیکھ کر ہول کھاجاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی صدق دل سے حق کے حامی ہیں، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ جب تحریکِ حق کا قدم آگے بڑھتا ہے تو ان کے حوصلوں میں کچھ کچھ جان آنے لگتی ہے۔ اور چاہتے ہیں کہ کاروانِ اسلام میں بڑھ کے جا شامل ہوں۔ ابھی یہ آگے بڑھنے کے لئے پر تول ہی رہے ہوتے ہیں کہ تحریکِ حق کی کوئی نہ کوئی مشکل ان کے سامنے آجاتی ہے، بس مشکل سامنے آئی اور ان کے حوصلوں پر اوس پڑ گئی۔ یہی لوگ ہیں جن سے یہ فقرے سننے میں آتے ہیں کہ:۔

"حق تو یہی ہے، مگر لوگ اسے مانتے نہیں"۔

"تحریک ٹھیک ہے، لیکن اسے کوئی چلنے کب دیتا ہے"۔

"اسلامی نظام ہمہ تن سعادت ہے، مگر اس کے مخالفین سخت رکاوٹیں ڈال رہے ہیں!"

———— وغیرہ! اور ان فقرات کے پیچھے دنیا کی تاریک ترین ناامیدی جھلک رہی ہوتی ہے۔ ان حضرات کو اس وادی کے نشیب و فراز سے آگاہی ہے نہیں، جس میں سے ہو کے اقامت دین کی شاہراہ نکلتی ہے۔ یہ منزل گاہِ حق کی طرف تیز رفتاری سے دوڑنے پر تیار ہیں۔ بشرطیکہ ان کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ سارے راستے میں قالین بچھے ہوئے ہیں، کارواں سرائیں بنی ہوئی ہیں، اور سبیلیں لگی ہوئی ہیں۔ بخلاف اس کے اگر ان کو یہ خبر ہو جائے کہ راستے میں کانٹے بھی آتے ہیں، جھاڑیاں بھی ہیں، چٹانیں اور کھائیاں بھی ہیں، بلندیاں اور پستیاں بھی ہیں، پیچ اور خم بھی ہیں تو پھر یہ لمبی سانس لے کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اپنے نماز روزہ اور ذکر و تسبیح میں یا کاروبار

اور بیوی بچوں سے دلچسپی لینے میں لگ جاتے ہیں۔

صدیوں سے جامد مسلمانی میں پڑے پڑے ان کے ذہنوں نے دین کا وہ تصور ہی گم کر دیا ہے۔ جس کا نقشہ مشکلات سے ٹکر لینے کا ولولہ پیدا کرتا ہے۔

ان کو معلوم نہیں کہ جو شخص بھی مسلم بنتا ہے، اس کو اوّل قدم پر یہ انتباہ دیا جاتا ہے کہ:۔

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون؛ ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکٰذبین

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ اس پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؛ حالانکہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کی آزمائش کی ہے! پس اللہ ضرور ان لوگوں کو بھی جانے گا جو اپنے ایمان کے دعویٰ میں) صادق ہیں۔ اور وہ لازماً ان لوگوں کو بھی جانے گا۔ جو اپنے ایمان کے دعوے میں جھوٹے ہیں!

کوئی تحریکِ اصلاح و انقلاب ایسی نہیں ایجاد ہو سکی ــــــــ چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی۔ جو آزمائش کی وادیوں سے باہر باہر ہی سے اپنا راستہ نکال کر کامیابی کی منزل پر پہنچ جائے۔ خاص طور پہ تحریکِ حق کو تو بہت ہی خطرناک گھاٹیوں سے گذرنا پڑتا ہے اور جب کہیں اسلامی نظام کے دروازے پر دستک دینے کی نوبت آتی ہے۔

اس حقیقت کو نہ جانے والے لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد

کرنے پر نوکریاں بھی چھٹتی ہیں، رشتے بھی ٹوٹتے ہیں، روزگار بھی تباہ ہوتے ہیں، غداری کے خطابات بھی ملا کرتے ہیں، تخریب و انتشار پیدا کرنے کے الزام بھی لگا کرتے ہیں، پکڑ دھکڑ بھی ہوتی ہے، نگرانی بھی کی جاتی ہے، جھوٹے پروپیگنڈے سے پریشان بھی کیا جاتا ہے، مخالفانہ سازشیں بھی کی جاتی ہیں، گالیاں بھی دی جاتی ہیں تو ان کے دل بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کو اس بات میں شبہ ہو جاتا ہے، کہ ایسی مخالفتوں اور ایسی رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے بھی دینِ حق کا بول بالا ہو سکتا ہے۔ یہ شبہ فطرتاً مایوسی پر منتج ہوتا ہے۔ مخالفتیں کم ہوتی ہیں تو یہ شبہ بھی دور ہونے لگتا ہے اور امید اکس آتی ہے۔ اور مخالفتیں بڑھتی ہیں تو یہ شبہ بھی پھر ابھر آتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قنوطیت طبائع پر مستولی ہونے لگتی ہے۔

مردانِ کار کی فطرت دوسری ہوتی ہے۔ ان کو مقصد کی راہ میں جتنی جتنی مشکلات حائل نظر آتی ہیں، اتنا ہی اتنا ان کا عزم اور ولولہ ترقی کرتا ہے اور ان کی غیرت و حمیت بیدار تر ہوتی جاتی ہے۔ لیکن مختصر دل والے حضرات کا حال اس کے برعکس یہ ہوتا ہے۔ کہ مشکلات کم ہوں تو ان کی ہمت بڑھتی ہے، مشکلات زیادہ ہوں تو ان میں مایوسی اور بددلی پیدا ہو جاتی ہے۔

مریضانِ یاس کی اس صنف میں دین کے حق ہونے اور خیر و فلاح ہونے میں کوئی تذبذب نہیں پایا جاتا، نہ ان میں نفاق کا وہ مادہ موجود ہے جس کی وجہ سے آدمی اپنی نفع پرستی اور آرام پسندی کی خاطر جان بوجھ کر دین کے مطالباتِ ایثار و فداکاری سے جی چراتا ہے، بلکہ اس کے خلاف یہ حضرات اپنے گرد و پیش کی مشکلات کو دیکھ کر دین کے پنپنے کے امکان سے مایوس ہیں۔

درحقیقت اقامتِ دین کی عالمگیر تاریخ کے ابواب تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے نہیں ہیں، ورنہ ان کو اندازہ ہوتا کہ تحریکِ حق پہلے جن مشکلات کا مقابلہ کرکے فاتح بنتی رہی ہے، ان کے مقابلے میں آج کے حالات شاید بہت ہلکے اور قابلِ برداشت ہیں۔

کاش ان کو اس بات ہی کا اندازہ ہوتا کہ نبی صلعم اور آپ کے صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کن منازل سے ہو کے گذرے ہیں؟ آپ کے ساتھی جب مکہ میں پٹ رہے ہوتے تھے اور تپتی ریت پر لٹائے جا رہے ہوتے تھے تو بظاہر احوال کیا وہ اس کا تصور بھی کر سکتے تھے کہ ایک دن سارے عرب کا انتظام ان کے ہاتھوں میں ہوگا؟ آپ سوچئے کہ نبی صلعم جس دن طائف میں پتھر کھا رہے تھے اور جس دن آپ خانہ بدر ہو کر حرا میں پناہ گزیں تھے۔ اور جس دن مدینہ کے باہر تین سو تیرہ رفقاء کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے جا رہے تھے، کیا اس وقت ظاہری مشکلات کا حساب کرنے والوں کے نقطۂ نظر سے اس کا کچھ بھی امکان نظر آتا تھا کہ یہ مشکلات میں گھرا ہوا انسان نہ صرف یہ کہ مکہ میں فاتح بن کر داخل ہونے والا ہے، بلکہ روم و عجم کی سلطنتوں کی باگ ڈور بھی اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں آنے والی ہے؟

لیکن اُس "انقلابی" کو اللہ کے قوانین و سنن پر اور اس کے وعدوں پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ اور وہ اوّل روز سے ہی یہ جانتا تھا کہ مشکلات کے طوفان کتنے ہی اٹھیں، تحریکِ حق کے لئے نامرادی کی کوئی وجہ نہیں! چنانچہ اس نے شدید مشکلات میں گھر کر بھی پورے اطمینان سے حق کے زریں مستقبل پر نگاہیں جما کر مخالفین حق کو چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

فانتظروا انی معکم — پس آنے والے حالات کا تم بھی انتظار کرو۔
من المنتظرین! — اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

اس کے سامنے اپنے اللہ کے متعلق یہ یقینی حقیقت تھی کہ:

انہ لا یفلح المجرمین — وہ مجرمین کو کبھی فلاح و کامرانی نہیں دیتا۔

اور اسے اس پر بھی بھروسہ تھا کہ:

والعاقبۃ للمتقین — اور حق و باطل کی کشمکش میں، انجام کار کا غلبہ اہل تقوٰی کے لئے ہے!

ان حقیقتوں کو جاننے کی وجہ سے مشکلات سے گھبرا کر موسٰے علیہ السلام کے پیروؤں پر بھی مایوسی کا دورہ پڑا تھا اور انہوں نے موسٰی علیہ السلام سے شکایت کی تھی جس کا بیان اس آیت میں ہے:۔

قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا و من بعد ما جئتنا ۰ — انہوں نے کہا کہ ہم کو تمہارے آنے سے پہلے بھی ستایا گیا ہے اور تمہارے آنے کے بعد بھی (ستایا جا رہا ہے)

موسٰی علیہ السلام نے اس کا جواب یوں دیا کہ:

قال عسٰی ربکم ان یھلک عدوکم و یستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون ۰ — موسٰی (علیہ السلام) نے کہا کہ وہ وقت دور نہیں کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو تباہ کر دے اور تم کو زمین میں اپنا نائب قرار دے اور دیکھے تم (اقتدار پا کر) کیا روش اختیار کرتے ہو!

اس جواب سے صاف ظاہر ہے کہ موسٰی علیہ السلام مشکلات کے طوفان کو جبور

کرتے ہوئے ساحل مراد کو دیکھ رہے تھے کہ وہ سامنے ہے اور اپنے ساتھیوں کی نگاہوں کو بھی انہوں نے اس پہچاننے کی کوشش کی۔ اس قسم کے لوگ جو مخلص ہو کر مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے قنوطیت کا شکار ہوتے ہیں، اپنے مرض کے لئے بہترین علاج سورہ آل عمران کی ذیل کی آیات میں پائینگے:۔

ولا تهنوا ولا تحزنوا
وانتم الاعلون ان كنتم مومنين ۝
ان يمسسكم قرح فقد مس
القوم قرح مثله ط وتلك
الايام نداولها بين الناس ج
وليعلم الله الذين امنوا و
يتخذ منكم شهداء ط والله
لا يحب الظلمين ۝ وليمحص
الله الذين امنوا ويمحق
الكفرين ۝ ام حسبتم
ان تدخلوا الجنة و
لما يعلم الله الذين
جاهدوا منكم و
يعلم الصبرين ۝ ......
....

اور نہ ڈھیلے پڑو اور نہ ملول ہو، اور (یقین رکھو کہ)
تم ہی غالب رہو گے۔ بشرطیکہ تم سچے مسلمان ہوئے!
اگر تمہیں (راہ حق میں) کوئی زخم لگا ہے تو تم سے
پہلے لوگ بھی ایسے ہی زخم کھا چکے ہیں۔ اور ہم
(سلسلۂ) ایام کو لوگوں کے سامنے گھماتے رہتے ہیں۔
اور یہ اس لئے کہ اللہ جان لے کہ تم میں سے (سچے)
مومن کون ہیں اور تم میں سے بعض کو شہید منتخب
کر لے: — اور جان لو کہ اللہ ظالموں کو پسند
نہیں کرتا۔ اور پھر یہ (حالات کی آزمائش) اس
لئے ہے کہ اللہ ایمان والوں کو نکھار دے اور
انکار کرنے والوں کو محو کر دے۔ کیا تم نے یہ سمجھ
رکھا ہے کہ تم (یونہی) جنت میں جا پہنچو گے حالانکہ
اللہ نے ابھی جانچ کے دیکھا ہی نہیں کہ کون تم
میں سے جدوجہد کرنے والے ہیں اور (یہ ضروری ہے
کہ) وہ جانچ کے دیکھے کہ جم کے رہنے والے کون ہیں!

وکاین من نبی قتل معہ ربیون کثیر فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ و ماضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصبرین۔

کتنے ہی نبی تھے جن کے ساتھ ہو کے خدا کے بیشمار طالبوں نے جنگ کی، پھر وہ اللہ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے نہ گھبرائے نہ سست پڑے اور نہ دب گئے۔ اور اللہ ڈٹ جانے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ان آیات میں یہ یقین دلایا گیا ہے کہ اگر تحریک حق کے تقاضائے جہاد کو پورا کرنے میں کوتاہی نہ کی جائے اور کارکنان حق میں ایمان صادق موجود ہو تو پھر آخری غلبہ ان کا ہے۔ دوسری طرف یہ واضح کر دیا گیا کہ جنت کو جانے والی راہ بہرحال آزمائش کی وادیوں سے ہو کے نکلے گی اور جو لوگ ان وادیوں سے بالا بالا اپنا راستہ نکالیں، ان کو جنت پر نگاہیں مرتکز رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ ساتھ کے ساتھ اس بات سے روکا گیا کہ مسلمان وہن، ضعف اور قنوطیت کا شکار ہونے لگیں اور حالات کی ذرا ذرا سی تلخی پر جی چھوٹ جائیں۔

ان آیات کو ہمارے "نظر دلے" اسلام پسند حضرات کو تعویذ بنا کے رکھنا چاہیئے توقع ہے کہ ان سے ان کے حوصلے بلند ہو سکیں گے۔

علاوہ بریں اللہ کے یہ وعدے جن کی تلاوت بے سمجھے بوجھے کی جاتی ہے، اسلام کے خدمت گزاروں کے لئے جذبہ انگیز ہیں۔ اور یہ یقین و عزم کی روشنی سے دلوں کو منور کر سکتے ہیں، لہذا ان کو سمجھ بوجھ کے پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے:۔

(۱) کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی، ان اللہ قوی عزیز۔

اللہ نے (یہ فیصلہ) لکھ رکھا ہے کہ لازماً میں اور میرے رسول (اپنے مخالفین پر) غالب ہو کے

رہیں گے! بلاشبہ اللہ قوت اور غلبے والا ہے!

(۲) حقا علینا نصر المومنین

ہم پر یہ حق آتا ہے کہ ہم (حق و باطل کی کشمکش میں) اہل ایمان کی امداد کریں!

(۳) ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملٓئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ۔ نحن اولیاؤکم فی الحیوۃ الدنیا والاخرۃ الخ

وہ لوگ جو کہتے ہیں۔ کہ اللہ ہمارا رب ہے۔ اور پھر (اس قول پر) جم جاتے ہیں، ان پر ہماری طرف سے فرشتے (یہ پیغام لے کر اترتے ہیں) کہ نہ کسی طرح کا خوف کرو، نہ ملال، اور بشارت لو اس جنت کی جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ ہم خود دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں تمہارے کارساز ہیں!

وقال اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوۃ واتیتم الزکوۃ وامنتم برسلی وعزرتموھم واقرضتم اللہ قرضا حسنا

اور اللہ نے (بنی اسرائیل سے) کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔ بشرطیکہ تم نے نماز کو قائم کیا، زکوٰۃ دینے کا اہتمام کیا، میرے رسولوں (اور ان کے مشن) پر ایمان لاتے رہے، اور ان کو (جہاد حق میں) غالب کرنے کی کوشش کی، اور (اقامت دین کے لئے) اللہ کو (جان و مال کی قربانیوں کی صورت میں) قرض حسنہ دیا!

یہ وہ وعدہ ہائے حق ہیں جن سے اگر نگاہیں ہٹ جائیں تو آدمی بزدل، مایوس اور نامراد ہو کے رہ جاتا ہے، لیکن اگر اللہ کے ان وعدوں پر توجہ رہے، ان پر بھروسہ رہے تو پھر امید و یقین کے چراغ سینوں میں روشن رہتے ہیں اور قلت و کثرت تعداد و

وسائل سے آدمی ایمان و کفر کی کشمکش کے انجام کا حساب نہیں لگاتا! ہمارے تھڑدلے قنوطیوں کو ان وعدوں پر اعتماد قائم کرنے کی فکر کرنی چاہیئے!

مرعوبیت ان کوتاہ ظرف حضرات کا تیسرا طبقہ ایک اور مرض میں مبتلا ہے۔ وہ یہ کہ جب اس طبقے کو ایک مخالف قوت برسر اقتدار نظر آتی ہے۔ اور خدا کے پیدا کئے ہوئے بیشمار وسائل و اسباب اس کے قبضے میں نظر آتے ہیں اور جب یہ ان وسائل و اسباب کو حق کی مزاحمت اور باطل کے غلبے کے لئے پے در پے استعمال ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔ اور جب برسر اقتدار قوت کی چلت پھرت اسے مرعوب کرتی ہے تو اس کے ذہن میں یہ اثر ابھرتا ہے کہ بس جو غلط کار لوگ ایک مرتبہ غالب ہو گئے ہیں، غلبہ و اقتدار کی اجارہ داری ہمیشہ کے لئے ان کے حصے میں آگئی ہے۔ اس طبقے کے لوگ یہ تصور کرنے سے قاصر ہیں کہ جو تخت ایک مرتبہ بچھ چکا ہے وہ کسی طرح الٹا بھی جا سکتا ہے۔

یہ بیماری پہلے زمانوں میں بھی پائی گئی ہے۔ پہلے بھی "قوماً جبارین" کا رعب قلوب انسانی پر اسی طرح اثر ڈال چکا ہے۔

جب فرعون اور اس کے درباریوں نے بنی اسرائیل پر ظلم و ستم توڑنے کی اسکیم طے کی تھی اور یہ ثابت کرنے پر تل گئے تھے۔ کہ:

انا فوقھم قاھرون! ہم ان کے اوپر پورا پورا تسلط رکھتے ہیں۔

تو بنی اسرائیل میں سے اہل ایمان بھی فرعون کے اس عملی دعوے سے مرعوب ہوئے تھے۔ اس موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ فرعون اور اس کی حکومت سب خود اللہ کے تسلط میں گھرے

ہیں اور زمین پر دعوئے قاہری کرنے والوں کی حیثیت خدا کے سامنے کٹھ پتلیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ بادشاہ اور وزیر مشیت ربّانی کی شطرنج کے شاہ و وزیر ہیں، اور بس! چنانچہ موسےٰ علیہ السلام کے اس قول میں یقین و حزم کو جلا دینے والا جوہر ایک بڑی مقدار میں شامل ہے:۔

استعینوا باللہ واصبروا ج	اللہ سے مدد طلب کرو اور جمے رہو یقیناً یہ
ان الارض للہ یورثھا من	زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے
یشاء من عبادہٖ ط والعاقبۃ	جب جسے چاہتا ہے۔ اس کا وارث بنا دیتا ہے۔
للمتقین!	اور دیہ یقین رکھو کہ کفر و ایمان کی کشمکش میں)
	آخری کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے!

اللہ کا یہ قانون اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کچھ لوگ حق کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں، اس پر جم جائیں۔ اور آزمائشوں کے لمحوں میں اللہ سے استعانت چاہیں، ان تمام شرائط کو پورا کرتے ہوئے جو خود اس کی طرف سے مقرر ہیں تو پھر لازماً آخر کار فتح انہیں کی ہوتی ہے، اور وراثت ارضی ان کو ہی دی جاتی ہے۔ چاہے بظاہر احوال مقابلہ کرنے والی فاسد قوت کا ٹھاٹھ باٹھ کتنا ہی مستحکم اور اٹل محسوس ہوتا ہو۔

یہ سنت اللہ اتنی اٹل ہے کہ اس کے ریلے میں بڑی بڑی قومیں، بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑے بڑے کبر و استکبار کے دعوے، محل اور قصور، باغات اور چمن، لشکر اور اسلحہ بہ جاتے ہیں! یہ قانون ایسا بے پناہ قانون ہے کہ قلت کے ہاتھوں سے کثرت کو اور بے سرو سامانی کے ہاتھوں سے سرو سامان کو شکست دلوا دیتا ہے۔ اس قانون

کے تحت جب انقلاب آتے ہیں تو ایسے ایسے عجیب و غریب طریقوں سے آتے ہیں کہ پیشتر سے اُن کے آنے کے راستے کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی آمد "من حیث لا یحتسب" کی حقیقت کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ قانون ایک بے پناہ قوت ہے جس نے بارہا تمدن انسانی کو زیروزبر کر دیا ہے، جس نے نیچے کے طبقوں کو اوپر اور اوپر کے طبقوں کو نیچے پہنچا دیا ہے، جس نے مظلومی کو اختیار دے دیا ہے اور جباری کو عاجزی کے مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اس قانون سے جس کی نگاہ ہٹی ہوئی ہو وہ اسلام کے مورچے کا سپاہی بن کر کبھی نہیں لڑ سکتا۔

یہی قانون ہمارے معترضے مایوسوں کے ایک طبقے کی نگاہ سے اوجھل ہے اور اسی وجہ سے وہ وقت کے اقتدار سے مرعوب ہو کر آناً فاناً اپنے آپ کو مایوسی کے حوالے کر دیا ہے۔ ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ کسی ایسی طاقت کو شکست دینا ممکن ہے جو حکمران ہو، جس کے پاس روپیہ ہو، جو جاگیریں رکھتی ہو، جو اچھا کھاتی ہو اور اچھا پہنتی ہو، جس کے پاس ریڈیو ہو، جس کے قبضے میں پریس ہو، جس کے ساتھ ہزارہا زرخرید نقیب ہوں، جس کے گرد قصیدہ خوانوں کا ایک ہجوم ہو، جس کے لئے راستوں میں فرش بچھتے ہوں، جس کے حضور میں سپاس نامے پڑھے جاتے ہوں، جس کے استقبال کئے جاتے ہوں، جس کی خواہش قانون و عدالت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہو، جس نے پروپیگنڈے کے طوفان اٹھا رکھے ہوں ——— خصوصاً اس صورت میں کہ ایسی برسر اقتدار قوت کو چیلنج کرنے والوں کی تعداد کم ہو، ان کے پاس سرمایہ کم ہو، ان کے پاس ذرائع و وسائل کم ہوں، اور ان کو طرح طرح کی مشکلات درپیش ہوں۔ چنانچہ یہ حیب اپنے ذہن کی ترازو میں دونوں طرف کی

طاقتوں کو تولتے ہیں اور مادیت کے باٹوں سے تولنے پر انہیں دونوں کے وزن میں بہت بڑا فرق محسوس ہوتا ہے، تو جذبۂ اسلام دوستی رکھنے کے باوجود ان کے سینے بک دھک سے رہ جاتے ہیں، اور پھر یہ ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے سوا اور کچھ کرنے کی ہمت کھو بیٹھتے ہیں!

حالانکہ اقتدار کی امانت کو مشیت اپنے جس قانون کے تحت ایک طاقت سے دوسری طاقت کی طرف منتقل کرتی ہے، وہ افراد کی تعداد اور مادی وسائل کی مقدار کے حساب سے نافذ نہیں ہوتا، بلکہ اس کا نفاذ کچھ دوسرے امور کو ملحوظ رکھ کر کیا جاتا ہے۔

دنیا کا کوئی اقتدار بھی ہو، اسے جو لوگ آنکھوں کے سامنے کام کرتا دیکھتے ہیں، ان کو وہ ہمیشہ اٹل ہی محسوس ہوتا ہے۔ اور ان کی سمجھ میں یہ بات آہی نہیں سکتی کہ اس میں کدھر سے کوئی رخنہ ہے جس میں سے انقلاب اپنا راستہ نکالے گا۔ لیکن مشیتِ الٰہی جب انقلاب لانے کے حق میں ہو جاتی ہے تو اقتدار کے قلعوں میں ہر طرف رخنے ہی رخنے نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر جب واقعہ ہو چکتا ہے تو ہر ایک کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے۔ کہ یہ یوں ہوا!

انقلاب کے پیچیدہ قوانین کے طریقِ کار کا صحیح علم تو خود قانون ساز عالم ہی کو ہے، اور وہی دراصل مختارِ مطلق ہے۔ جو نظاموں کو زیر و زبر کرتا ہے چنانچہ اسی کا ارشاد ہے کہ:-

اولم یسیروا فی الارض	کیا یہ لوگ گھومتے نہیں زمین میں کہ دیکھیں
فینظروا کیف کان عاقبۃ	ان سے پہلے کے (دشمنانِ حق) کا انجام کیا ہوا!
الذین کانوا من قبلھم کانوا	حالانکہ وہ قوت واقتدار میں ان سے بڑھے ہوئے

هم اشد منهم قوة و اثاراً فی الارض فاخذهم الله بذنوبهم وما کان لهم من الله من واق ○ (المومن)

تھے۔ اور زمین میں انہوں نے زیادہ آثار چھوڑے ہیں! پس اللہ نے ان کو ان کے جرائم پر پکڑ لیا اور پھر ان کو اللہ کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہ تھا!

یہ آیت ایک طرف ان لوگوں کے استکبار کی تردید کرتی ہے۔ جو اپنی قوت کو بڑا پائدار سمجھتے تھے اور دوسری طرف ان اہل ایمان کے یقین و عزم کو بیدار کرتی ہے جو مخالفین کے تمکن سے دل ہی دل میں ہول کھاتے اور اس تمکن کے خاتمے کے امکان سے مایوس تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے سخت مایوس کن حالات میں نبی صلعم کی زبان سے اہل ایمان کو یہ درس دلایا کہ:-

قل اللهم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر ○ تولج اللیل فی النهار وتولج النهار فی اللیل وتخرج الحی من المیت وتخرج المیت من الحی وترزق من تشاء بغیر حساب ○

کہو کہ اے اللہ! اے سلطنت کے مالک! تو ہی جسے چاہے ملک عطا کرے اور جس سے چاہے ملک چھین لے، اور تو جسے چاہے غلبہ دے اور جسے چاہے پست کر دے — تو رات کو دن میں پروتا ہے۔ اور دن کو رات میں پروتا ہے۔ اور تو مردے سے زندے کو نکالتا ہے۔ اور زندے سے مردے کو نکالتا ہے۔ اور تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

یعنی انسانی تاریخ کے سارے انقلابات کی باگ ڈور خود اللہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے قوانین کے مطابق اِدھر سے سلطنت چھینتا ہے، اُدھر سونپتا ہے، ایک طرف عزت و غلبہ عطا کر رہا ہوتا ہے، دوسری طرف سے عزت و غلبہ کے عطیے واپس لے رہا ہوتا ہے، ابھی رات میں سے دن کو نکال دکھاتا ہے، ابھی دن میں سے رات کو برآمد کر لیتا ہے، وہ اپنی حکمت کے تحت زندہ طاقتوں کو موت بھی دیتا ہے اور مردہ قوتوں کا احیاء بھی کرتا ہے —— وہ اپنے خزائنِ رزق میں سے فرد یا گروہ پر بے حساب بارانِ رحمت کرتا ہے اور جس کا حصہ چاہتا ہے بسکیڑ دیتا ہے۔

یہ آیت نبی صلعم کے رفقاء کو مشکل ترین مراحل میں سے گذرتے ہوئے بشارت دینے آئی تھی اور اس میں درحقیقت آنے والے انقلاب کی صبح کے ظہور کا مژدہ پنہاں تھا۔ اس نے اہلِ ایمان کو یہ اشارہ دیا کہ اللہ تعالیٰ مقررہ وقت کے آتے ہی جب سلطنت کی باگ ڈور نا اہلوں سے چھین کر تم کو دینے پر آئے گا تو ان لوگوں کی طاقتیں اس کے فیصلے میں حائل نہ ہو سکیں گی، وہ جب تمہارے غلبے کے لئے اور تمہارے مخالفین کی ذلت کے لئے حکم صادر کر دے گا تو اس حکم کو تلواروں اور نیزوں کی کثرت نہ ٹال سکے گی، اور جب زندہ اقتداروں کے لئے موت کا پیغام دے گا اور تم کو نئی زندگی کا سربراہ کار بنانے کا آخری فرمان نافذ کر دے گا۔ تو کسی کی دولت و امارت اس کے آڑے نہ آ سکے گی، وہ جب تمہارے حصے میں کامرانی کی صبح مقدر کر دے گا اور تمہاری مزاحمت کرنے والوں کی جھولی میں نومیدی کی رات ڈال دے گا تو اس انقلاب احوال کو ٹالنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔ یہ سارے اختیارات خود اللہ ہی

کے قبضے میں ہیں!

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے دور نہ جائیے، کل کے جرمنی کو پیش نظر رکھ کر سوچئے!

—— کیا ۱۹۳۹ء سے پہلے کسی کو بھی یہ توقع تھی کہ جرمنی کی عظمت بہت جلد ختم ہو جانے والی ہے؟ کیا کوئی یہ پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ جاپان کی سطوت زوال کے سیلاب کی زد میں آچکی ہے؟ کیا ۱۹۳۵ء میں یہ تصور کیا جا سکتا تھا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزی حکومت برعظیم ہند سے قطعی طور پر برطرف ہو جائے گی؟ کیا کسی کو یہ اندازہ تھا کہ تقسیم ہند اتنی آسانی سے واقع ہو جائے گی؟ کیا کبھی خضر وزارت کو ۱۹۴۶ء میں اس بات کا شبہ بھی گذرا ہو گا کہ ۱۹۴۷ء میں اس کا وجود حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا اور اس کی پشت پناہی کرنے والی پارٹی کا نام تک لینا پنجاب میں ممکن نہ رہے گا؟ کیا مجلس احرار کو تقسیم سے پہلے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اسے سیاسیات سے دست بردار ہونا پڑے گا؟

یہ سارے واقعات ہمارے سامنے ہوئے ہیں۔ اور آج ان واقعات کے ہو چکنے کے بعد تو ہم ان کی توجیہ آسانی سے کر لیتے ہیں، لیکن ان کے واقع ہونے سے قبل بظاہر ان کے واقع ہونے —— اور جلد واقع ہونے —— کے بارے میں ہم کبھی تصور نہیں کر سکتے تھے!

تاریخ کے تغیرات کی یہ اچنبگیاں بتاتی ہیں کہ یہ سارا انتظام اس ہستی کے ہاتھ میں ہے جس کی تعریف کرنے کے لئے "ھو القاھر فوق عبادہ" کے الفاظ بہت ہی موزوں ہیں۔

پس بندوں کے عارضی اقتدار کے ٹھاٹھ باٹھ سے مرعوب ہونے والوں کو

اپنی توجہ اس اصل مختار کار کی طرف منعطف کرنی چاہیے جس نے "تلک الایام نداولھا بین الناس" کا دعویٰ کیا ہے۔ اس سے معاملہ درست کرنا چاہیئے اور اس کے قوانین کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہیئے، پھر بندوں کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو دینِ حق کی تحریک کا راستہ روکنے کے لئے تمہارے آڑے آسکے!

خدا کے دین سے آزاد جو اقتدار بھی پایا جاتا ہے، اس کے وارث خدا کے قوانین کے لحاظ سے اہلِ حق کے مقابلے میں نہایت گھٹیا، نہایت بودی اور ناپائیدار پوزیشن رکھتے ہیں۔ ان کے شان و شوکت کے سارے اسباب اور مظاہرہ قوت کے جملہ وسائل خود ان کے لئے عذاب بنا دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ اہلِ نفاق کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔

فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیوۃ الدنیا	(اے نبی!) ان کے مال اور اولاد تم کو مرعوب نہ کریں! اللہ صرف یہ ارادہ رکھتا ہے کہ ان کے ذریعے انہیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے!

ایسے ہی اسلامی تحریک کی مزاحمت کرنے والے کفار کے متعلق فرمایا کہ:-

لا یغرنک تقلب الذین کفروا فی البلاد۔ متاع قلیل! ــــ ثم ماوٰھم جھنم و بئس المھاد۔	تم کو بستیوں میں ان لوگوں کی چلت پھرت دھوکے میں نہ ڈال دے جنہوں نے انکار کی روش اختیار کی ہے ــ یہ استفادہ قلیل، ہے! پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت ہی بُری منزل گاہ ہے!

اس قسم کی آیات کا منشا یہ واضح کرنا ہے کہ دنیا میں انسانی طاقتوں کی چمک دمک اور ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر یہ سمجھنا کہ براہِ راست اختیار و اقتدار ان کو مل گیا، یا ان کی اجازت کے بغیر (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کوئی تبدیلی پیدا کرنے والا نہیں، یا ان کی قوتیں مشیت کے فیصلوں کے آگے بند باندھ سکتی ہیں، غلط ہے! اقوامِ حق کے تقاضے پورے کرنے والا گروہ جب آگے بڑھتا ہے تو پہاڑ جیسی طاقتیں بھی اس کے سامنے نہیں جم سکتیں!

خدا کی اطاعت میں جو فرد اور جو گروہ کام کر رہا ہے اور جس کا نصب العین رضائے الٰہی ہو اور جو نصرتِ خداوندی کو حاصل کرنے کے لئے تقاضے پورے کر رہا ہو، اس کی نگاہ تو اتنی بلند ہونی چاہئے کہ وہ مقامِ عبدیت سے جب نیچے کی طرف جھانکے تو اسے فراعنہ اور نماردہ چیونٹیوں کی طرح اور تنکوں کی طرح بے وزن معلوم ہوں! اتنے علوِّ نگاہ کے بغیر خدا کے دین کو غالب کرنے کا بیڑا نہیں اٹھایا جا سکتا!

پس لوگوں کو چاہئے کہ وہ اگر واقعی اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے حق میں ہیں تو تھڑدلے پن کو ختم کر دیں اور چھوٹے اقتداروں کی مرعوبیت سے باہر نکلیں، اور مایوس ہو کر بیٹھنے کے بجائے اللہ کے ان کم سے کم مطالبات کو پورا کریں جو ایک انقلابِ حق کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں!

حق اور باطل

قرآن میں حق اور باطل کی آویزش کے سلسلے میں مختلف مواقع پر حسب ذیل آیات وارد ہوئی ہیں

(۱) وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ۝ لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا لَاتَّخَذْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا إِنْ كُنَّا فَاعِلِينَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۝ (الانبیاء)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے، اسے کھیل تماشے کی حیثیت سے پیدا نہیں کیا۔ اگر ہم ایسا چاہتے کہ اسے سامان تفریح بنائیں تو ہم یقیناً (بغیر کسی یگانہ نظر کے) اسے ایسا ہی بنا لیتے۔ بشرطیکہ ہم یہی کرنے والے ہوتے! لیکن (ہم نے ایسا نہیں کیا ہے) بلکہ (کائنات کو بڑے محکم اصول حکمت کے ساتھ بنایا ہے: جس کے مطابق) ہم حق کو باطل سے ٹکراتے ہیں، پھر وہ (حق)

اس (باطل) کا سر کچل دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔

(۲) وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

اور کہہ دو کہ (دیکھو) حق آپہنچا اور باطل میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ بلاشبہ باطل تو ہے ہی بھاگنے والا۔

(۳) أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۔ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے مثال دی ہے کہ پاکیزہ اصول ایک ایسے پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ خوب اچھی طرح (زمین میں) اتری ہوئی ہو اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں، اور جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لا رہا ہو۔ اور (دوسری طرف) ناپاک اصول کی مثال اس ناپاک درخت کی سی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے (بس ایک ہلکے جھٹکے میں) اکھاڑ لیا جائے اس کے لئے کچھ بھی پائداری نہیں ہے۔

(۴) أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً

اللہ نے بادل سے پانی برسایا تو ندی نالے اپنے اپنے مقدور بھر (پانی لے کر) بہ نکلے، پھر وہ سیل اپنے اوپر پھولا ہوا جھاگ اٹھا لیتا ہے۔ اور اسی طرح زیور اور دوسرے سامان ضرورت بنانے کے لئے آگ میں جو (دھات) پگھلاتے ہیں اس پر بھی جھاگ آجاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اللہ حق اور باطل (کی مثال) بیان

وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (الرعد) کرتا ہے ---- تو پھر جہاں تک جھاگ کا تعلق ہے وہ تو سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اور جو پانی کہ نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہے وہ زمین میں باقی رہتا ہے۔

ان آیات کا منشا بالکل واضح ہے۔ ان میں ایک حقیقت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ دنیا کا نظام ایسے اصولوں پر بنایا گیا ہے کہ اس میں حق اور باطل دونوں قوتیں بالکل الگ الگ اور متمیز ہو کر باہم ٹکراتی ہیں، دوسری حقیقت یہ واضح کی گئی ہے کہ فتح اور پائداری اور استقلال و استقرار تمام تر حق، راستی، نیکی اور خیر کے لیے ہے۔ بخلاف اس کے باطل، جھوٹ، بدی اور شر کے لئے شکست، ناپائداری، عدم استقلال اور عدم استقرار مقدر ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی مستقل قدر اگر ہے تو حق ہی میں ہے۔ باطل کی ساری قدر نمائشی ہے۔

یہ آیات جس ماحول میں نازل ہوئی تھیں اس میں حق اور باطل کے درمیان عملاً ایک سخت درجے کی کشمکش ہو رہی تھی، اور عین اس کے درمیان حامیانِ حق کو یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ پورا انتظامِ کائنات حق ہی کے لئے سازگار ہے، باطل کی عارضی نشوونما اگر ہوتی بھی ہے تو فطرتِ عالم کے کلّی تقاضے بہرحال اس کے خلاف ہوتے ہیں، پس تم حامیانِ باطل کے کرّوفر سے مرعوب ہوئے بغیر جدوجہد جاری رکھو، آخر کار یہ بازی تمہارے ہی ہاتھ رہے گی۔ چنانچہ ان آیات سے اسلامیانِ عرب نے وہ جذبۂ یقین صحیح طریق سے اخذ کیا۔ جس کے کارفرما ہو جانے کے بعد وہ نہ اس واقعہ سے ہراساں ہوتے کہ مشرکینِ عرب ہی نہیں، بلکہ گردوپیش کی تمام اقوام باطل کی بنیادوں پر زندگی استوار کئے ہوئے ہیں اور مٹھی بھر لوگ حق

کے علمبردار بن کر نکل رہے ہیں، اور نہ وہ اس سوال سے پریشان ہوئے کہ وہ نظام حق جو کئی صدیوں سے معرضِ تعطل میں ہے آخر وہ آج کیسے غالب آ سکتا ہے چنانچہ ان کی جدوجہد کے نتائج نے ان پر عملاً ثابت کر دیا کہ قرآن نے حق و باطل کی کشمکش کا جو فلسفہ پیش کیا تھا وہ ایک اٹل فلسفہ تھا۔

وہ فلسفہ آج بھی اٹل ہے، اور آج بھی ہم اس سے جذبۂ صادق اخذ کرنے کے ضرورت مند ہیں۔ کیونکہ ہم بھی حق و باطل کی کشمکش کے طوفان میں کھڑے ہیں۔

لیکن ان آیات کے صحیح مفہوم کو نہ پا سکنے کی وجہ سے بعض اصحاب کو سخت غلط فہمی ہوتی ہے۔ چنانچہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ اسلام اور اس کے اصولوں کو از روئے استدلال پوری طرح حق ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتے، تو پھر وہ اپنے قلق انقلابی عدمِ اطمینان کو اس دلیل سے ظاہر کرتے ہیں کہ اگر نیکی درحقیقت کوئی مستقل قدر رکھتی ہے اور فطرتِ انسانی سے اسے خصوصی مناسبت ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ نیکی کم ہے اور بدی کا زور ہے، سچائی پر کاربند ہونے والوں کی تعداد قلیل ہے اور جھوٹ کو اختیار کرنے والوں کی بھاری اکثریت ہے! —— اور پھر یہ کہ اگر اسلام نظامِ حق تھا تو آخر وہ چلا کے روز؟ کل تیس ہی سال! پھر آئندہ کے لئے اس سے کیا توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

یہ سوال مسلمان کہلانے والے بعض خاص اقسام کے مخالفین نظامِ اسلامی کی طرف سے بار بار اٹھایا جاتا ہے۔ اور ملکوں کو تو چھوڑیئے، خود اس پاکستان میں، جو قائم ہی اسی عزم کے اعلان کے ساتھ ہوا تھا کہ یہاں اسلامی نظامِ حیات رائج کیا جائے گا۔ شروع میں جب نظامِ اسلامی کا مطالبہ ابھرا تو یہ سوال زور شور سے سامنے

آیا۔ اور اگرچہ درمیان میں کچھ دنوں کے لئے یہ دب گیا تھا۔ مگر اب جب کہ عملاً اسلامی دستور کی تدوین کا مسئلہ سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ اس سوال کی گونج پھر سنائی دے رہی ہے۔ جب اسلام کے گھر میں اس کی غربت کا یہ حال ہو تو دوسرے مقامات سے جو کچھ بھی سننے میں آئے اسے تھوڑا ہی سمجھئے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس سوال پر تفصیل کے ساتھ غور کیا جائے۔

آیات مذکورہ کا مقصد نزول یہ تھا کہ مسلمان جس حق پر عقل و وجدان کے لحاظ سے ایمان لا چکے تھے اس کے لیے کشمکش کرتے وقت یہ یقین رکھیں کہ کامیابی ہے ہی حق کے لئے اور اس یقین کی وجہ سے ان کا عزم اور ولولہ تازہ رہے۔ لیکن پیش نظر سوال کو ان آیات کے اصل منشاء کے ٹھیک خلاف استعمال کیا جا رہا ہے اور اس لئے استعمال کیا جا رہا ہے کہ آج جو لوگ عقل و وجدان کے لحاظ سے اسلام پر ایمان لا کر اس کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہیں کم از کم ان کے عزم کو متزلزل کر دیا جائے اور غیر شعوری طور پر وہ اسلام کے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا ہو جائیں کہ اس میں کوئی نہ کوئی کمزوری ایسی موجود ہے کہ یہ اول تو اپنے غلبے کے لئے سخت ترین بلکہ ناقابل عمل جدوجہد چاہتا ہے، اور پھر اگر اسے غلبہ ملے بھی تو اس میں زوال و اختلال بہت جلد نمودار ہو جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ سوال جس سطحی طریق سے اٹھایا جاتا ہے، اسی سطحی انداز میں اسے سنا بھی جاتا ہے، پھر نہایت سطحی نگاہ سے اس سوال کی روشنی میں انسانی تاریخ و تمدن کو دیکھا جاتا ہے، اور علیٰ ہذا القیاس بالکل سطحی تفکر کے ساتھ اس سے ایک نتیجہ برآمد کر لیا جاتا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال کے جواب میں ان تمام

ضروری امور کو نمایاں کر دیں جن پر اچھی طرح نظر نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سوال کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں:۔

ایک یہ کہ کیا حق ناکام ہے اور باطل کامیاب؟

دوسرے یہ کہ نظامِ حق صرف تیس سال کیوں چلا؟

(ا)

کیا حق ناکام ہے اور باطل کامیاب؟

ایک اصولی نکتہ اس سوال کے جواب میں جو بات اوّل قدم پر جان لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ حق کی ناکامی اور باطل کی کامیابی اصلاً کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔ کامیابی اور ناکامی کا تعلق خود انسان سے ہے۔ اگر بالفرض سارے انسان مل کر حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تو پھر بھی حق ناکام نہیں ہوتا، ناکام وہ انسان ہی ہوتے ہیں جنہوں نے حق کو قبول کرنے سے گریز کیا اور اس کے فوائد سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے۔ سچائی ایک اصول ہے اور اگر وہ اصول حق ہے تو خواہ اسے ساری دنیا قبول کر لے، یا کوئی ایک متنفس بھی اختیار نہ کرے وہ بہرحال ایک اصول حق ہی رہے گا۔ جیسے صفائی اور طہارت ایک ایسا طبّی اصول ہے جو بجائے خود حق ہے، اسے کوئی مانے تو بھی یہ حق ہے اور کوئی ایک متنفس بھی اس پر عمل پیرا نہ ہو تو بھی یہ حق ہی رہے گا۔ کامیاب ہم ان انسانوں کو سمجھیں گے جو اس اصولِ حق کو اپنائیں۔ پھر روشنی کی مثال لی جا سکتی ہے کہ ایک شخص روشنی کو پسند نہیں کرتا

اور وہ آنکھیں بند کر کے چلتا ہے تو اس کے نتیجے میں ٹھوکر وہی خود کھائے گا اور ناکام بھی وہی ہوگا۔ روشنی کی ناکامی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ روشنی کو نہ کسی خاص منزل پر پہنچنا ہے، نہ پاؤں چلنا ہے، نہ ٹھوکریں کھانے کا کوئی خطرہ درپیش ہے، اور نہ کامیابی و ناکامی کے درمیان وہ معلق ہے۔ اسے کوئی پوری طرح گل بھی کردے تو بھی ناکام وہ خود ہوگا۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر آگے چلیے۔

حق کی گرانی اور باطل کی ارزانی

یہ تو آپ کو معلوم ہے ہی کہ جسے اندھیرا پسند ہو اسے کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑتا، لیکن جو کوئی روشنی چاہے اسے دیئے، تیل، بتی اور چراغ دان کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی صحت بگاڑنا چاہیں تو یہ کام ہر لحاظ سے آسان ہے، لیکن بگڑی ہوئی صحت کو بنانا ہو یا اچھی صحت کو بحال رکھنا ہو تو تازہ ہوا، ورزش، غسل اور صفائی، غذا کی درستی، سونے جاگنے اور کام کی باقاعدگی اور جذبات و اخلاق کی نگہداشت کے لئے خاص طور پر فکر کرنی ہوگی۔ زیادہ آسانی سے یہ بات یوں بھی جا سکتی ہے کہ اگر ایک پہاڑ کی اونچی چوٹی سے نیچے لڑھکنا ہو تو اس "مقصد جلیل" کے لئے سوائے اس کے اور کچھ نہ کرنا پڑے گا کہ آپ ایک دفعہ لڑھکنے کے لئے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیں، بخلاف اس کے اگر آپ نیچے سے اس چوٹی تک پہنچنا چاہیں تو آپ کو کشش زمین کے خلاف زور لگانا پڑے گا، قدم تھکیں گے، دم پھولے گا، اعصاب پر بار پڑے گا، دوران خون تیز ہوگا، قلب زور سے دھڑکے گا، پسینہ آئے گا، تب کہیں جا کر آپ چوٹی پر پہنچیں گے۔ یہی معاملہ نیکی اور بدی اور حق اور باطل کے بارے میں پیش آتا ہے۔ آپ کو سیرت بد مطلوب ہو تو کسی بڑی محنت کی ضرورت نہ ہوگی، لیکن سیرت نیک

کی تعمیر میں بڑی مشقت کرنا ہوگی اور پھر اس کی حفاظت کا انتظام کرنا ہوگا۔ آپ بدنامی کی متاع خریدنا چاہیں تو کوئی بڑی قیمت صرف نہیں ہوتی، لیکن نیک نامی اور عزت و آبرو کی جنس پر عمر بھر کی کمائی کھپانی پڑتی ہے۔ آپ اپنی کھیتی میں اگر جھاڑ جھنکاڑ اگانا چاہیں تو نہ ہل چلانا ضروری، نہ سراون پھیرنا ضروری، نہ پانی اور کھاد دینا ضروری، نہ باڑ لگانا اور نلائی کرنا ضروری، بلکہ یہ "قیمتی فصل" خود بخود نشوونما پاتی رہے گی۔ اس کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ آپ کھیتی کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ لیکن اگر آپ کوئی باغ اور چمن لگانا چاہیں، یا غلے اور دوسری قیمتی اجناس کی فصل اٹھانا چاہیں تو اس کے لئے زمین جوتیں گے، بوئیں گے، پانی اور کھاد دیں گے، نلائی کریں گے، باڑ لگائیں گے، تب کہیں جا کر مدعا حاصل ہوگا۔ حق کے لیے مشقت ضروری ہے اور باطل بغیر مشقت کے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ خیر پر بہت بڑی قیمت صرف ہوتی ہے اور شر کوڑیوں کے مول، بلکہ مفت لٹایا جا رہا ہے۔ اخلاقی صفائی اور طہارت کے لئے بڑا انتظام ضروری ہے، لیکن اخلاقی نجاست کے لئے صرف تغافل و تساہل کافی ہے۔

اب فرض کیجئے کہ ایک شخص اچھی فصل لینے کے لئے محنت کرنے سے کتراتا ہے، اور زمین کو بنجر چھوڑ دیتا ہے، تو ناکامی اس کی ہوئی یا اچھی فصل کی؟ ایک شخص حفظان صحت کی فکر نہیں کرتا اور بیمار پڑتا ہے تو ناکامی صحت کے اصول کی ہوئی یا بیمار پڑنے والے کی؟ ایک شخص حق اور راستی کی دولت اور نیکی اور خوش خلقی کی متاع بیش بہا کو خریدنے کے لئے محنت کی قیمت صرف کرنے پر تیار نہیں ہوتا تو ناکامی حق اور نیکی کی نہ ہوگی، خود خریدار کی ہوگی۔

کثرت و قلت کا معیار یہ بات کہ حق قیمتی ہے اور باطل ارزاں ہے یا نیکی کے لئے محنت کی ضرورت ہے اور بدی کے لئے تن آسانی سے زیادہ کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، اس سے قطع نظر کر کے لوگ جب اس امر واقعہ کو دیکھتے ہیں کہ اہل حق کم ہیں اور بندگان باطل کی کثرت پائی جاتی ہے، اور نیکی پر کاربند ہونے والوں کا تناسب بدی میں مبتلا ہونے والوں سے زیادہ نہیں ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ یہ حق کیسا حق ہوا اور یہ نیکی کیسی نیکی ہوئی جسے قبول کرنے والے ہمیشہ اقلیت میں رہتے ہیں اور اکثریت باطل کے خدمت گزاروں اور بدی کے مسلک کے علمبرداروں کی ہوتی ہے۔

مگر اس کا کیا علاج کہ نظام فطرت تمام تر اس طرز پر مبنی ہے کہ اس میں جو چیز قیمتی ہے وہی کم بھی ہوتی ہے اور اس سے حصہ پانے والے خوش نصیب لوگ بھی ہمیشہ کم ہوتے ہیں، لیکن دوسری طرف جو چیز جتنی گھٹیا ہے وہ اتنی ہی زیادہ بھی ہوتی ہے اور اس سے دامن بھرنے والوں کی ہمیشہ اکثریت ہوا کرتی ہے لیکن کیا گھٹیا چیز کی کثرت اسے قیمتی بنا سکتی ہے اور قیمتی چیز کی قلت و گرانی اسے گھٹیا بنا سکتی ہے؟ یقیناً نہیں!

خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں اونٹ کٹارا، بھٹ کٹیا اور جھاڑ جس کثرت سے اگتے ہیں اس کے مقابلے میں یاسمین و گلاب اور لالہ و نرگس ہمیشہ کم ہوتے ہیں یہاں بھوسے کے انبار کے انبار پائے جاتے ہیں لیکن سنبل و ریحان کا جمال کمیاب ہے یہاں سنگ ریزوں کی بے پناہ اکثریت ہے لیکن ہیرے اور جواہر انتہائی اقلیت رکھتے ہیں۔ یہاں پیتل، تانبے اور ٹین کی بڑی بڑی مقداریں ہر روز کانوں

سے برآمد ہو رہی ہیں، لیکن سونا بہت تھوڑی مقدار میں نکلتا ہے۔ یہاں سمندر کی ہر موج سینکڑوں خزف ریزے اچھالتی رہتی ہے، لیکن وہ صدف جس سے موتی برآمد ہو، شاذونادر ہی ہاتھ آتا ہے۔ یہاں جب دودھ کو بلویا جاتا ہے تو چھاچھ کی بہت بڑی مقدار حاصل ہوتی ہے لیکن مکھن جو اس سے نکلتا ہے، مقدار کے لحاظ سے چھاچھ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہاں جنگلوں میں ہزارہا ہرن پھلانگتے پھرتے ہیں لیکن مشک ختن جن کے نافوں سے حاصل ہوتی ہے وہ قلیل التعداد ہیں۔ یہاں یاوہ گوئی کے نمونے دن رات سڑکوں اور بازاروں اور مجلسوں میں سامنے آتے رہتے ہیں لیکن ادب و شعر کے حسین و جمیل نمونوں کا تناسب بہت ہی کم رہتا ہے۔ یہاں بیماری جیسی نامطلوب شے عام ہے لیکن معیاری صحت جیسی جنس مطلوب کم ہی لوگوں کو حاصل ہے۔ لیکن آخر اس سے نتیجہ یہ کیسے نکل آئے گا کہ یاسمین و گلاب، سنبل و ریحان، سونے، موتی، جواہرات، مکھن، آہوئے ختن، ادب و شعر اور صحت کے لئے ناکامی ہے، کیونکہ وہ مقدار اور تعداد کے لحاظ سے کم ہیں۔ اور دوسری طرف اونٹ کٹارے، بھیٹ کٹیلے، بھوسے، تانبے، پیتل، ٹین، خزف، چھاچھ، آہوئے بے نافہ، یاوہ گوئی اور بیماریوں کے لئے کامیابی ہے، کیونکہ وہ تعداد و مقدار کے لحاظ سے پیش پیش ہیں؟

یہ نہ بھولیے کہ قیمتی چیز کی کم مقدار گھٹیا چیز کی زیادہ مقدار کو خرید سکتی ہے جب دونوں متقابلاً ایک ہی منڈی میں سامنے رکھی جائیں تو حق اور خیر کی اقلیت باطل اور شر کی اکثریت سے زیادہ قیمت پائے گی۔ یہی مدعا ہے اس آیت کا کہ

لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ ردی چیز اور پاکیزہ چیز دونوں برابر نہیں ہو سکتیں

وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ! چاہے تمہیں ردّی چیز کی کثرت کتنی ہی بھلی کیوں نہ معلوم ہوتی ہو۔

فطرت نے ہر گھٹیا چیز کو اس لئے عام کیا ہے کہ اس کی قیمت گرا دے اور اسے ذلت کے مقام پر رکھے، اور اس نے ہر اعلیٰ چیز کو اس لئے کم کر رکھا ہے کہ اس کی قدر بڑھے اور گراں بہا ہو اور وہ تمام اہل عزم کی نگاہوں میں عزت حاصل کرے کیا آپ چاہتے ہیں کہ فطرت اس ترتیب کو الٹ دیتی اور اس کی مارکیٹ میں سونا ارزاں ہوتا اور ٹین اور لوہا گراں بہا ہوتا؟ وہ یاسمین و گلاب کو ہر طرف اگاتی پھرتی اور اور جھاڑ جھنکاڑ اگانے کے لئے محنت و مشقت کا مطالبہ کرتی؟ ادب و شعر کی صلاحیت اس کے ہاں سے ہر کس و ناکس کو ارزانی ہوتی اور یا وہ گوئی کا آرٹ پیدا کرنے کے لئے اعلیٰ درجے کے مخصوص دماغ کم تعداد میں فراہم کئے جاتے؟ صحت و تندرستی کے لئے کسی اہتمام کی ضرورت نہ ہوتی، بلکہ محنت و اہتمام کی ضرورت بیمار ہونے کے لئے پڑتی؟ تعمیر مفت میں ہوتی اور تخریب کے لئے انسان کو قوتیں صرف کرنی پڑتیں؟ آدمی روشنی بہم پہنچانے کے لئے کسی ساز و سامان کا منت کش نہ ہوتا بلکہ اسے چراغوں اور بجلی کے قمقموں کی جگہ الٹے ایسے آلات کی احتیاج ہوتی جو اندھیرا پھیلا سکیں؟ بلندی کی طرف لپکنے کے لئے کوئی جسمانی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی، بلکہ پستی کی طرف لڑھکنے کے لئے زور لگانا پڑتا؟ نیک بننے کے لئے کسی طرح کے تکلف کی حاجت نہ ہوتی۔ بلکہ الٹا بد اخلاق بننے کے لئے لٹریچر، تعلیم، تبلیغ، جماعت بندی اور نظام ہائے حکومت کے قیام سے مدد لینی پڑتی؟ حق پر چلنے کے لئے انسان کسی تکلیف اٹھانے کا ذمہ دار نہ ہوتا اور نہ انبیاء و کتب کا سلسلہ جاری کرنا پڑتا۔ بلکہ یہ سب،

کچھ ہوتا تو فروغ باطل کے لئے ہوتا؟ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ آدمی کو جنت تو ملتی مفت ہیں، البتہ جو شخص دوزخ میں جانے کا خواہش مند ہوتا اس کو خاص طور پر ریاضتیں کرنی پڑتیں! ذرا موجودہ نظام فطرت کی ترتیب کو الٹ کر غور تو فرمائیے کہ کس طرح کا نقشہ مترتب ہوتا ہے۔

اس نظام فطرت کے اندر عالم انسانی میں بھی اعلیٰ خدمات انجام دینے کی صلاحیتیں رکھنے والے کم ہوتے ہیں اور معمولی قسم کے افراد زیادہ ہوتے ہیں۔ اہل حکمت، موجدین، معلمین، مصلحین، ہنرور، مقرر، ادیب، شاعر، لیڈر اور اس طرح کے افراد کی تعداد کبھی بھی عامیوں سے زائد تو کجا برابر بھی نہیں ہوا کرتی۔ ان مناصب پر آنے کے لئے یہاں غیر معمولی فطری صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں، ہاں اکتسابی لحاظ سے بھی محنتیں اور ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن عامی بننے کے لئے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ ٹھیک یہی صورت حق کے اصولوں پر جمنے، نیکی کو مشعل راہ بنانے اور اعلیٰ سیرت تعمیر کرنے والوں کی بھی ہے کہ انہیں کچھ تو فطری طور پر سلامتی طبع کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اکتسابی طور پر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہی بات تھی جسے علامہ اقبال نے یوں پیش کیا کہ:۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پس حق پر جمنے والوں اور نیکی پر کاربند رہنے والوں کی کمی یہ معنیٰ نہیں رکھتی کہ حق اور نیکی ناکام قوت ہے، اور نہ باطل اور بدی کی راہ پر چلنے والوں کی کثرت اس کی دلیل ہے کہ باطل اور بدی کامیاب قوت ہے۔ صحیح طرز استدلال یہ ہے کہ کامیاب وہ لوگ ہیں جو حق کی رفعتوں کی طرف بڑھنے کے لئے ضروری محنت کر سکیں، اور

ناکام وہ لوگ ہیں جو حق کی منزل بلند کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ کر سکے اور باطل کے گڑھوں میں سہولت پسندی کی وجہ سے پڑے رہ گئے۔ زیادہ لوگ اگر گڑھے میں پڑے رہیں تو گڑھا پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں سے بلند نہیں قرار دیا جا سکتا، اور اگر کم لوگ چوٹی پر پہنچے ہوں تو چوٹی گڑھے سے پست نہ ہو جائے گی۔

برائی بھلائی کے روپ میں

فرض کیجئے کہ "لپٹن چائے" بہت ہی کامیاب اور مقبول ہو جائے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک دوسری فرم جو لپٹن کے درجے کی چائے فراہم نہیں کر سکتی، بلکہ وہ اپنی چائے کو گھٹیا پاتی ہے، اگر میدان میں آنا چاہے تو کونسی چال چلے گی؟ ——— وہ یہ کرے گی کہ اپنے ہاں کی چائے کا نام لپٹن سے ملتا جلتا رکھے گی، ٹریڈ مارک اس کے مشابہ بنائے گی، لیبل بھی اسی کے انداز کا بنائے گی، اور کوشش کرے گی کہ بہت سے لوگ محض فریب نظر کی وجہ سے اس کا مال خرید لیں۔ اب آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ان طریقوں کو اختیار کر کے یہ نئی فرم خود اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ واقعی لپٹن کی چائے بہت ہی اعلیٰ درجے کی چائے ہے۔ اور پھر وہ اپنا کاروبار جتنا پھیلائے گی، درحقیقت اتنا ہی زیادہ خود لپٹن کی چائے کے لئے میدان ہموار کرے گی۔ اسی طرح جو صراف پیتل کی انگوٹھی پر سونے کا ملمع کر کے بازار میں پیش کرتا ہے۔ وہ خود سونے کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہے۔

بالکل ایسے ہی اگر آپ انسانی تاریخ تمدن اور تاریخ اخلاق کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ برائی اور باطل جب بھی کبھی میدان میں لائے گئے ہیں حق اور نیکی کے روپ میں لائے گئے ہیں۔ گناہ کو ہمیشہ کامیاب ہونے کے لئے صواب کا

جامہ آراستہ کرنا پڑا ہے، اور شر کو فروغ حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ خیر کی نقل اتارنی پڑی ہے۔ باطل اور بدی کے اس طریق کار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہر باطل اور بدی اور نظام فاسد اور ان کے علمبرداروں نے اس بات کا خود اعتراف کر کے اپنے مساعی شروع کی ہیں کہ قدر و قیمت اگر ہے تو حق اور خیر کے لئے ہے، اور کامیابی اگر حاصل ہو سکتی ہے تو راستی اور نیکی اور نظام صالح ہی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

آپ نے ہر جھوٹے کو دیکھا ہو گا کہ وہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرتا ہے لیکن کسی سچے کو بھی آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرے؟ آپ نے ہر دعوت شر دینے والے کو خیر کی علمبرداری کا اعلان کرتے ہوئے پایا ہو گا۔ لیکن کبھی آپ نے ایسا بھی منظر دیکھا کہ کوئی دعوت خیر دینے والا شر کی علمبرداری کا اعلان کر رہا ہو؟ آپ نے ہر خادم باطل کو اپنے برسرحق ہونے کے دلائل دیتے ہوئے ملاحظہ فرمایا ہو گا، لیکن کبھی کسی صاحب حق کو یہ استدلال کرتے دیکھا ہے کہ میں خادم باطل ہوں؟ آپ نے غیر اسلامی نظاموں کے قیام کی جدوجہد کرنے والوں کو بار بار دیکھا ہو گا کہ وہ اپنے آپ کو عین حامل اسلام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن کیا کبھی آپ نے اسلامی نظام کے کسی داعی کو بھی غیر اسلامی نظام کے خادم کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرتے دیکھا ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ پیتل پر لوگ سونے کا ملمع کر کے لاتے ہیں لیکن سونے پر کسی صراف نے پیتل کا ملمع کبھی نہیں کیا؟ کیا وجہ ہے کہ گھٹیا مال بیچنے والے لوگ اعلیٰ مال بنانے والوں کی نقل کرتے ہیں، لیکن اعلیٰ مال بنانے والے نقلی مال بیچنے والوں کی نقل نہیں کرتے؟

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ دراصل فطرت کے نظام میں اور انسانیت کے بازار میں اصل کامیابی حق اور نیکی ہی کے لئے مقدر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باطل اور برائی کے سوداگر جب بھی اپنا مال لاتے ہیں تو اس کو حق اور نیکی کے رنگ میں رنگ کر لاتے ہیں۔ وہ جھوٹ کو لاتے ہیں لیکن سچائی کے لیبل کے ساتھ، وہ ذلت کو لاتے ہیں لیکن عزت کے سائن بورڈ کے ساتھ، وہ شر کو لاتے ہیں لیکن خیر کے ٹریڈ مارک کے ساتھ، وہ مفاد پرستی کو لاتے ہیں لیکن خدمت کا عنوان دے کر، وہ مضرت کو لاتے ہیں لیکن افادیت کا رنگ و روغن چڑھا کر!

نیکی اپنے نام کے ساتھ آتی ہے، بدی کے نام کے ساتھ نہیں آتی، لیکن دوسری طرف بدی کبھی اپنے نام کے ساتھ نہیں آتی، نیکی کے نام کے ساتھ آتی ہے خیر ٹھیک ٹھیک اپنے روپ میں آتا ہے، شر کے روپ میں نہیں آتا، لیکن شر اپنے روپ میں نہیں آتا بلکہ خیر کے روپ میں آتا ہے۔ حق پوری طرح بے نقاب ہو کر نمودار ہوتا ہے، اپنے چہرے پر باطل کی نقاب نہیں ڈالتا، لیکن باطل کبھی بے نقاب ہو کر آنے کی جرأت نہیں، وہ مجبور ہے کہ حق کی نقاب اوڑھ کر آئے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق اور نیکی ہی کے لئے اصل کامیابی ہے وہ خود تو کجا ان کا نام بھی اتنا کامیاب ہے کہ بدی اور باطل بھی اسی نام کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس نام کا سہارا لیے بغیر وہ یکسر ناکام ہیں۔ باطل اور بدی کا حق اور نیکی کے نام یا روپ کو استعمال کرنا خود اس بات کی شہادت ہے کہ بازار حیات میں سارا فروغ حق اور نیکی کے لئے ہے۔

رہی یہ بات کہ حق کے روپ میں جو باطل لایا گیا اس سے کتنے گاہک دھوکا کھا

گئے، نیکی کے لیبل سے جو بدی پیش کی گئی تھی اس سے کتنے خریداروں کو نظر بندی ہو گئی، اس سے حق کی قدر و قیمت اور نیکی کی کامیابی اور مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اگر کسی بازار صرافہ میں ہزاروں گاہک بھی روزانہ ملمع کی ہوئی انگوٹھیاں سونے کے بھاؤ خریدے جائیں تو اس سے سونے کی کامیابی ناکامی سے اور پیتل کی کم قدری قیمت کی گرانی سے نہیں بدل جاتی۔ کامیابی اور ناکامی تو ساری خریداروں کی ہو گی کہ وہ کھرے اور کھوٹے کی تمیز کرنے میں چابک دستی دکھاتے ہیں یا کوتاہی۔

حق اٹل ہے، باطل متغیر ہے

حق —— اس کے جو جو بھی اصول ہیں، وہ از آدم تا ایں دم ایک ہی رہے ہیں لیکن باطل ان اصولوں کے جواب میں کوئی ایسے اصول نہیں لے کے آیا جو شروع سے اب تک ایک ہی رہے ہوں۔ باطل ہر دور میں نئے اصول لے کر اٹھتا ہے، نیا فلسفہ بناتا ہے، نیا استدلال گھڑتا ہے، نیا روپ دھارتا ہے نئی قدریں لے کے آتا ہے اور پھر حق سے مقابلہ کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ شکست کھاتا ہے اور میدان چھوڑ دیتا ہے۔ پھر جا کر از سر نو کچھ اور اصول تلاش کرتا ہے کچھ اور فلسفہ گھڑتا ہے، کچھ اور استدلال تراشتا ہے اور پھر نئے لاؤ لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ پھر شکست کھاتا ہے تو کسی نئے رنگ میں اُبھرتا ہے۔ اس کا کوئی اصول پائدار نہیں، کوئی رنگ پختہ نہیں، کوئی فلسفہ اٹل نہیں، کوئی استدلال ایسا نہیں جو پانچ چھ برس زندہ رکھتا ہو۔

بخلاف اس کے حق ہر دور میں ایک ہی اصول رکھتا ہے، ایک ہی فلسفہ سامنے لاتا ہے، ایک ہی استدلال پیش کرتا ہے، ایک ہی اُس کا روپ

ہوتا ہے، اور باطل کے ہر حملے کے جواب میں وہ اپنے ایک ہی طرح کے قابلِ فسخ ہتھیاروں سے جنگ آزما ہوتا ہے۔ حق کی فرم کے مقابلے میں ہزاروں فرمیں قائم ہوتی ہیں اور ٹوٹ جاتی ہیں، پھر بنتی ہیں، پھر ٹوٹتی ہیں، لیکن وہ فرم بدستور اپنی جگہ جمی رہتی ہے۔

حق نے کہا خدا ایک ہے، لیکن باطل نے اس کے جواب میں کبھی دو خداؤں کا فلسفہ پیش کیا، کبھی تین خداؤں کا، کبھی بے شمار دیوتاؤں کا، کبھی ہمہ اوست کا، کبھی "اندھی قوت" کی خدائی کا، کبھی الحاد و دہریت کا، اور وہ برابر نت نئے فلسفے گھڑتا جا رہا ہے، لیکن حق آج بھی یہی کہتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی خدا ہے۔ حق نے کہا کہ سچائی، دیانت، پاسِ عہد، حفظِ عصمت، احترامِ ملکیت، ہمدردی و اخوت، انسانی جان کا احترام انسانی اخلاق کے بنیادی اصول ہیں۔ باطل نے اس کے جواب میں قسم قسم کے اخلاقی نظریے گھڑے لیکن حق آج بھی اپنے قدیم اصولوں کی بدستور دعوت دیتا ہے اور وہی اصول آج بھی فطرتِ انسانی سے مطابقت رکھتے ہیں۔

باطل کی ناکامی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ آج تک وہ کوئی اٹل اصول انسانیت کے سامنے نہ رکھ سکا، وہ کوئی دعویٰ فطرتِ انسانی سے مستقل طور پر منوا نہ سکا۔ آج ایک چیز پیش کی اور کل خود ہی اس کی تردید کردی، آج ایک نظریہ بنایا اور کل خود ہی اسے توڑ کے پھینک دیا، آج ایک تحریک کھڑی کی اور وہ کل نسیاً منسیا ہوگئی، آج ایک نظام بنایا اور کل اسے خود ہی ناکارہ قرار دے کر فراموشی کے گڑھے میں پھینک دیا۔ باطل تو ایک ایسا مبتدی آرٹسٹ،

ہے جو نمونۂ فن ایک مرتبہ پیش کر دیا وہ پھر ہمیشہ کے لئے انسانی تاریخ کے عجائب گھر کی زینت بن گیا۔

کامیابی آخر وہ ہے یا یہ!

رہا یہ سوال کہ حق کے مشکل اور نازک آرٹ کو آرٹسٹ کم ملے اور باطل کے سہل اور غیر لطیف آرٹ کو آرٹسٹ بہت مل گئے تو اس سے نہ کسی فن لطیف کی قدر و قیمت گھٹتی ہے اور نہ کسی احمقانہ فن کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔ دوامی قدریں رکھنے والے آرٹ کے تھوڑے آرٹسٹ مٹا مٹا کے بنانے اور بنا بنا کے مٹانے والے آرٹسٹوں کے بڑے سے بڑے لشکر پر بھی بھاری رہیں گے۔

حق قائم بالذات ہے، باطل طفیلی ہے

آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ کسی کاشتکار نے پیازی یا گوکھرووں کی فصل بوئی ہو، یا کوئی کھیت اسی طرح کی کسی فصل کو حاصل کرنے کے لئے جوتا اور سیراب کیا گیا ہو، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ آپ کارآمد فصلیں بوتے ہیں اور ان کی اوٹ میں زمین کی زرخیزی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ غیر مطلوب قسم کی بوٹیاں اور گھاس پھونس بھی اگ آتی ہے۔ محنتی کسان ان کا استیصال کرنے کے لئے گوڑائی اور نلائی کرتا رہتا ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ طفیلی پودے مطلوبہ فصل کے حصے کی غذا اڑا کر پل جاتے ہیں۔ پھر آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ تنہا آکاس بیل کہیں اگی ہوئی پائی جائے، اس کی نہ جڑ ہوتی ہے، نہ زمین براہ راست اسے کوئی غذا دینے پر تیار ہوتی ہے، بلکہ ہمیشہ آپ دیکھیں گے کہ آکاس بیل کہیں دوسرے درخت یا جھاڑی کے طفیل پرورش پاتی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ حق اور باطل کا ہے باطل جہاں بھی پایا جاتا ہے کسی حق کے

سہارے سے پایا جاتا ہے۔ خالص باطل دنیا میں کہیں بھی وجود نہیں رکھتا، انسانی فطرت کی کھیتی میں وہ اگر اگتا ہے تو حق کی اوٹ میں اگتا ہے، اور اس کے حصے کی غذا کے بل پر پلتا ہے۔ یہ اکاس بیل کی طرح دوسرے درختوں اور پودوں کے اوپر پھیلتا، اور پھولتا اور پھلتا ہے۔

دنیا میں ہر برائی کسی نیکی کا سہارا لے کر جیتی ہے اور ہر گناہ کو کسی صواب کی اوٹ لینی پڑتی ہے۔ آج تک جتنے نظام ہائے باطل پیش کئے گئے ہیں اور دنیا میں قائم ہو سکے ہیں ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو خالص باطل اور خالص برائیوں پر مشتمل ہو، بلکہ باطل اور برائی جب بھی چلی ہے تو اس حق اور نیکی کے بل پر چلی ہے جس کا کچھ نہ کچھ جزو ہر نظام باطل میں شامل رہتا ہے تمام نظام ہائے باطل خالص باطل ہونے کے بجائے حق و باطل کے مرکبات ہوتے ہیں اور ان کی معقولیت، ان کا قیام، اور ان کا استحکام اور ان کا پھیلاؤ حق کی اس مقدار کے اوپر منحصر ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ جی جاتے ہیں۔ نظام سرمایہ داری میں بھی باطل موجود ہے اور نظام اشتراکی میں بھی باطل کا ایک بڑا جزو شامل ہے، لیکن حق کی ایک مقدار اس کے ساتھ بھی ہے اور ایک اس کے ساتھ بھی ہے، اور یہی حق کی مقدار ہے جس کے سہارے دونوں کے باطل جی رہے ہیں۔ اس کے پاس بھی بعض بھلائیاں ہیں جن میں انسانیت کے لئے اپیل موجود ہے، اور اس کے پاس بھی کچھ خوبیاں ہیں جن میں فطرت آدم کے لئے کشش ہے۔ یہ دونوں جب بھی بلاتے ہیں تو اپنے بھلائی کے پہلو سامنے لاکر بلاتے ہیں اور لوگ اگر انہیں قبول کرتے ہیں تو ان کی ان بھلائیوں ہی کے لئے قبول کرتے ہیں۔ ان کی برائیاں تو ان بھلائیوں کے اوپر آکاس بیل کی طرح لپٹی ہوئی ہیں کہ ان کو قبول

کیجئے تو از خود ہاتھ آئیں گی۔

جب کوئی نظام باطل حق کی کم سے کم مطلوبہ مقدار کو بھی کھو بیٹھتا ہے تو پھر اس کا پنپنا محال ہو جاتا ہے اور خالص باطل کے لئے تو دنیا میں کوئی چانس ہی نہیں۔

تاریخ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کسی نظام باطل کے قیام و بقا کا انحصار بھی اس کے جزوِ حق پر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی کامیابی دراصل حق کی کامیابی ہی کا نتیجہ ہے۔ ماضی ہو یا حال ہر اصول اور فلسفہ اور نظام اپنے جزوِ حق کی وجہ سے مقبول اور قیام پذیر ہوتا ہے۔

حق و باطل کے مرکبات کا تصادم

تاریخ اصولوں، فلسفوں اور نظاموں کے تصادم کی جولانگاہ ہے۔ اس تصادم میں کامیابی اور ناکامی جس اصول پر ہوتی ہے وہ خود گواہی دیتا ہے کہ کامیاب، حق ہے اور باطل بہرحال ناکام ہے۔

یہ تو واضح ہے ہی کہ خالص باطل کے لئے دنیائے انسانیت میں کوئی جگہ نہیں۔ حق و باطل کے مرکبات پائے جاتے ہیں۔ ان مرکبات میں تصادم ہوتا ہے اور ہر تصادم میں بازی اس اصول، فلسفے اور نظام کے ہاتھ رہتی ہے جس میں باطل کا تناسب کم اور حق کا تناسب زیادہ ہو۔ ۵ فی صدی حق اور ۱۰ فی صدی حق رکھنے والے اصول و نظام کے درمیان اگر ٹکر ہو گی تو ۱۰ فی صدی حق رکھنے والا نظام میدان مارے گا۔ وہ ساری توڑ پھوڑ جو ذیل کی آیت کی رو سے ہوتی ہے اسی اصول پر ہوتی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ   اگر اللہ تعالیٰ لوگوں میں سے بعض کو بعض

مِنۡ بَعۡضٍ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ کے ذریعہ ہٹانا نہ جاتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔

پھر قانون تصادم کے تحت قرآن کا فلسفہ یہ بتاتا ہے کہ مرکبات حق و باطل میں سے کوئی بھی جب خالص حق کے سامنے آتا ہے تو اس کے لئے آخر کار لازماً شکست مقدر ہوتی ہے۔ جن آیات کو اس مضمون کے آغاز میں درج کیا گیا ہے ان میں بھی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جب بھی کوئی گروہ خالص حق کو لے کر اٹھتا ہے اور اس کے لئے کما حقہٗ جدوجہد کرتا ہے تو آخر کار کامیابی اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ اَلۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ (انجام کار اہل تقویٰ کے لئے ہے)

خالص حق کے علمبرداروں کی کمی کیوں؟ اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب حق انسانی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے، جب نظام کائنات پوری طرح سازگار اسی کے لئے ہے، جب حقیقی اور پائدار کامیابی بھی اسی کے لئے مقدر ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کے علمبردار اقلیت میں رہتے ہیں؟ اس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے تاہم اس کی ہم مزید وضاحت کر دینا چاہتے ہیں۔

صفائی انسانی فطرت کے مطابق بھی ہے اور صفائی میں پوری پوری افادیت بھی ہے، لیکن پھر بھی صفائی کے تقاضے پورا کرنے والوں کی تعداد کم ہے، اور صفائی کی نمائش کی اوٹ میں ہر طرح کی غلاظتوں کو چھپا چھپا کر رکھنے والوں کی اکثریت ہے۔ صحت ہر شخص کو محبوب ہے اور بیماری کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا، لیکن وہ لوگ جو حفظان صحت کے اصولوں پر پوری طرح کاربند ہوں اور بیماری سے بچنے کی تدابیر اختیار کریں۔ بلحاظ تناسب اقلیت میں رہتے ہیں۔ جو صورت معاملہ یہاں ہے وہی

حق کے اختیار کرنے میں بھی ہے۔

انسان میں ایک طرف بھلائی اور فائدے کی خواہش موجود ہے اور دوسری طرف اس میں سہولت پسندی اور آرام طلبی کا رجحان بھی کارفرما ہے۔ بھلائی اور فائدے پر محنت صرف ہوتی ہے اور محنت صرف کرنے میں آرام طلبی کا رجحان مانع ہوتا ہے۔ ان دونوں رجحانات کی کشمکش کے تحت آدمی کو عجیب قسم کے احوال پیش آتے ہیں۔ وہ کبھی قریب کے چھوٹے فائدے کو دور کرکے بڑے فوائد پر ترجیح دیتا ہے، وہ کسی فوری مشقت سے بچنے کے لئے بعد کی تکلیف کو گوارا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، وہ تھوڑی محنت کرکے تھوڑا سا فائدہ حاصل کرنے کو اس سے زیادہ پسند کرنے لگتا ہے کہ زیادہ محنت کرکے زیادہ بڑا فائدہ حاصل کرے۔

اب چونکہ حق یا باطل کو قبول کرنے پر انسان کو فطری جبریت میں مبتلا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ آزادی سے خود انتخاب کرے۔ اسی وجہ سے خالص حق کی گراں بہا دولت کو حاصل کرنے کے لئے محنت وایثار کی بھاری قیمت ادا کرنے والے مرداں جری کم ہوتے ہیں، اور حق و باطل کے سستے مرکبات کے لئے محنت وایثار کی تھوڑی پونجی صرف کرنے والے زیادہ نکلتے ہیں۔ جیسے سستے مال کے گاہک ہمیشہ زیادہ پائے جاتے ہیں۔

اگر انسانوں کو آزادی دی گئی ہے کہ وہ حق و باطل میں سے خود کسی ایک کو انتخاب کریں اور ساری زندگی اس کی خدمت میں صرف کردیں تو ظاہر بات ہے کہ اس آزادی کے تحت یہ واقعہ ہونا کچھ بھی بعید نہیں کہ ایک بڑی اکثریت خالص حق سے اعراض کرے، پھر وہ کسی غلط اصول اور باطل نظام کی علمبردار بنے، وہ اس کے

لئے دعوت پھیلائے ، وہ اس کے لئے منظم ہو، وہ اس کے لئے ذرائع ووسائل جمع کرے، وہ اس کے لئے لڑائیاں لڑے، وہ اس کے لئے لٹریچر اور نظامِ تعلیم فراہم کرے، وہ اس کے سامنے ساری دنیا کی گردن جھکانے میں مصروف ہو جائے۔ یہاں تک کہ اس کا غلبہ عالمگیر ہو اور وہ تاریخ کے ایک طویل دور پر چھاجائے۔

ایسا ہی ایک دور ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں ، اور اس میں باطل کا غلبہ دیکھ کر بظاہر اتنی مرعوبیت طاری ہوتی ہے کہ غلبۂ حق کے امکان سے مایوسی ہوتی ہے حالانکہ یہ دوسرا امکان بھی اسی طرح موجود ہے!

باطل کے غلبے کے لئے اس کے حامیوں کی بہت بڑی اکثریت جتنا کام کرتی ہے ، وہی کام حق کے حامیوں کی نسبتاً بہت کم تعداد سرانجام دے سکتی ہے اور اہلِ حق کا ایک مختصر گروہ اگر معیاری درجے کا ہو تو وہ ساری انسانیت کی زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے سکتا ہے۔ یہ معیاری حق پرستی وہ فرق ہے جو ادھر کی کثرت اور ادھر کی قلت کا توازن (Balance) برابر کر دیتا ہے۔

(۲)

نظامِ حق صرف تیس ہی سال کیوں چلا؟

دوسرا سوال جو اسلام کے نظامِ صالح کے قلیل مدت تک چلنے کے بارے میں اٹھایا جاتا ہے اور جس کے اندر دراصل یہ استدلال چھپا ہوتا ہے کہ جب ایک نظام اپنے آپ کو زیادہ دیر تک زندہ رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تو آخر اس کے لئے بیش بہا قربانیاں کیوں دی جائیں، اور اس کے بجائے کیوں نہ کسی دوسرے نظام

کو اختیار لیا جائے ــــــ اپنے جواب میں متعدد ضروری تصریح چاہتا ہے ہم ان تصریحات کو نمبروار درج کرتے ہیں :-

تصریح اول اگر کسی نظام یا اصول کو قبول کرنے اور اسے عملاً برپا کرنے کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لئے شرطِ اول یہ ہوتی کہ اس کا ماضی میں دیر تک چلنا ثابت کر دیا جائے تو شاید نہ دینِ جمہوریت کو کوئی کارکن ملتا اور نہ دینِ اشتراکیت کو۔ ان دونوں نظاموں میں سے کسی ایک کو بھی ماضی کی تاریخ میں قدم جمانے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ان کے علمبرداروں نے اپنے لئے صرف اتنی بات کافی سمجھی کہ ان کا عقلی اطمینان ہو جائے۔ جب ان کے دلوں نے گواہی دی کہ یہ اصول و نظام برحق ہے اور افادیت اسی میں ہے تو پھر انہوں نے اس کے لئے بازی لگادی۔ وہ احمق ہوتے، اگر عقلی اطمینان کے بعد، اور دل کے ٹھک جانے کے بعد پھر یہ سوچنے بیٹھ جاتے کہ جب پہلے ہزاروں انسانی نسلیں گزر گئیں اور کسی کو اس اصول و نظام کو قائم کرنے کی ہمت نہ ہوئی تو آج ہم یہ حرکت کس امید پر کرنے لگے ہیں؟

ان دونوں رائج الوقت نظاموں کے بخلاف اسلامی نظام کے علمبرداروں کے لیے تو عملی تحریک کا دوہرا سامان موجود ہے۔ وہ اپنے لئے عقلی اطمینان کے پورے وجوہ بھی اسلام میں پاتے ہیں، اور پھر وہ تاریخ سے یہ شہادت بھی پاتے ہیں کہ یہ نظام پہلے بھی قائم رہا ہے اور اپنی معیاری شکل میں تیس سال تک ماضی قریب میں چل چکا ہے، جب کہ وسائلِ تمدن موجودہ دور سے بہت کم تھے۔

تعجب ہے کہ جن نظاموں کا کوئی ماضی نہ تھا انہیں جب کارکن مل گئے تو وہ نہ صرف قائم ہوئے بلکہ ساری دنیا پر ان کے اثرات پھیل گئے۔ لیکن جس

نظام کا ایک مضبوط ماضی موجود ہے اس کے کارکن تذبذب میں مبتلا ہیں۔

تصریح دوم | یہ سمجھنا کہ اسلام دنیا میں صرف ایک بار برپا ہوا اور وہ بھی تیس سال کے لئے، قرآن اور تاریخ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اگرچہ قرآن نے پوری تاریخ رسالت نہیں بیان کی ہے مگر پھر بھی جو کچھ اس نے بیان فرمایا ہے اس سے اتنی بات تو بہرحال ثابت ہوتی ہے کہ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے اندر اسلامی نظام کو قائم کیا، پھر یوسف علیہ السلام کے ذریعہ پر مصر میں قائم ہوا، اور دیر تک اس کے اثرات قائم رہے پھر حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام نے اسے برپا کیا اور ایک مدت تک کیسے بڑی وسعتوں کے ساتھ چلایا ——— اور پھر قیاس کر لیجئے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں نہ معلوم کتنے انبیاء و صلحا مختلف خطّوں کے اندر ایسے گزرے ہوں گے جنہوں نے اسی نظام کو بار بار برپا کیا ہوگا۔ (قرآن میں صرف ان اقوام کے انبیا اور ان ملکوں کی دینی تاریخ کا تذکرہ ہے جن سے عرب براہ راست متعارف تھے) پھر آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہی نظام حق اپنی معیاری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اس پر نہ معلوم لوگ کیسے کہہ دیتے ہیں کہ اسلامی نظام دنیا میں صرف تیس سال چل کے ختم ہو گیا؟ اسلامی نظام تو بار بار اپنے آپ کو دوہراتا چلا آرہا ہے! بخلاف اس کے کوئی غیر اسلامی نظام ایسا نہیں جو مٹ مٹ کر پھر قائم ہوا ہو۔

تصریح سوم | صرف تیس سال کا وہ مفہوم بھی غلط ہے جو معترض حضرات لیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ کی شہادت

کے ساتھ اسلامی نظام بھی بالکل شہید ہو گیا اور اس کی پوری عمارت پیوند زمین ہو گئی۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں، اصل صورت حالات جو کچھ تھی وہ یہ تھی کہ پورے اسلامی نظام میں سے ایک "اصول انتخاب" ساقط کر دیا گیا باقی سب کچھ جوں کا توں رہا، قانون وہی تھا، اقامت عبادات کا نظم وہی تھا، جہاد فی سبیل اللہ کی سرگرمیاں اسی طرح رہیں، معاشرتی نظم وہی رہا، عوامی اخلاق کی بنیاد اس اسلام ہی پر تھی، نظام تعلیم اسی طرح تھا۔ بلاشبہ معیاری نظام کو جب ہم سامنے رکھتے ہیں تو اصولاً ہم یہی رائے قائم کرتے ہیں کہ نظام بدل گیا، لیکن یہ تبدیلی کلّی نہ تھی، بلکہ پہلے بگاڑ نے اس قلعے میں گھسنے کا صرف ایک چور دروازہ بنا لیا تھا۔ پھر باقی تبدیلی بہت ہی تدریجی طریق سے واقع ہوئی۔ ایک عمارت میں سے آہستہ آہستہ ایک ایک اینٹ بدلی جاتی رہی اور بہت دیر تک بعد جا کر اس عمارت کا بیشتر حصہ متغیر ہوا۔

اصل میں سارا بگاڑ شاہی محل اور دربار خلافت کے اندر بپا ہوا لیکن عوامی زندگی بہ حیثیت مجموعی اسی صالح نقشے پر استوار رہی جیسے دورِ سعادت میں جما دیا گیا تھا۔ یہ حالت حالات کے فرق کے ساتھ کم و بیش سات آٹھ سو سال تک جاری رہی۔ بالکل آخری دو چار صدیاں ایسی تھیں جب کہ عوام میں اخلاقی انحطاط پھیلا، معیشت معاشرت میں مفاسد گھسے اور سوسائٹی اسلامی بنیادوں سے اکھڑنے لگی، اور انہی صدیوں میں امت کا سفینہ زوال کی موجوں کا شکار ہوا۔ جب تک نظام حق کی اصل قدریں زندگی میں غالب رہیں مسلمان ترقی کرتے گئے، اگرچہ ان کے سلاطین و امرا بگڑتے چلے جا رہے تھے لیکن جب نظام حق

کی قدریں کمزور پڑ گئیں تو پھر زوال غالب آگیا۔

یہ اسی تیس سال کے معیاری دور کا کرشمہ تھا کہ اس کی پیدا کردہ اخلاقی قوت ملت اسلامیہ کو کئی صدیوں تک ترقی کی راہ پر دوڑاتی چلی گئی اور تاریخ میں ان کو ایک لمبا دورِ اقبال عطا کیا گیا۔ اس تیس سال کی پیدا کردہ قوت جب گھٹنے لگی اور اس کی کمی کو پورا کرنے کا کوئی اہتمام نہ کیا گیا تو مسلمانوں کے تمدن کی گاڑی پہلے سست رفتار ہوئی، پھر دھیمی ہوتے ہوتے بالکل رک گئی۔

اس ہزار سال کے دور کو لوگ جب "صرف تیس سال" کے الفاظ میں سمیٹ کر سامنے لاتے ہیں تو ناواقف آدمی کو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

تصریح چہارم | اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس کے علمبرداروں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جب اسے بحیثیت نظام کے قائم کر دیا، تو چاہے وہ بقول معترضین صرف تیس سال چلا ہو ——— بہرحال اپنی پوری معیاری شان کے ساتھ چلا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اور مسلمان عوام سب کے سب اس بات پر پوری طرح مطمئن تھے کہ جو کام ان کو کرنا تھا انہوں نے اسے کماحقہٗ انجام دے دیا اور ان کو نہ کوئی معذرت کرنی پڑی، نہ کوئی حسرت لے کر رخصت ہوئے۔ انہیں جیسی زندگی مطلوب تھی، اسے عملاً سو فی صدی معیار پر قائم کر کے دکھایا۔

لیکن آج جن نظاموں سے مرعوب ہو کر "صرف تیس سال" کا سوال اٹھاتے ہیں، انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ یہ جمہوریت اور یہ اشتراکیت تو اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق اب تک زمین کے اوپر ایک لمحے کے لئے بھی قائم نہیں ہوئیں۔

جمہوریت کے تمام علما اس پر متفق ہیں کہ معیاری جمہوریت ابھی تک صرف کتابی اصولوں میں تو پائی جاتی ہے، سطح ارض پر کہیں بھی نافذ نہیں ہے برنارڈ شا کے الفاظ میں ابھی بمشکل یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت کے لئے ترقی کا وقت آیا ہے ہنڈرک وان لون اپنی تاریخ عالم (Pocket History of the World) کے آخر میں کیا خوب کہتا ہے "کہ لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ ابھی ہم درجنوں غلط پگڈنڈیوں کو اختیار کریں گے، تب کہیں جاکر شاید صحیح سمت سفر پا سکیں۔"

مارکسزم کے متعلق بھی یہ بالکل واضح ہے اس کے مومنین خود کہتے ہیں کہ ابھی ہم عبوری دور (Transitional Period) سے گزر رہے ہیں۔ معیاری حالت جو ان کے پیش نظر ہے، اس میں پہنچنے کے بعد ایک تو ریاست کا وجود ختم ہو جائے گا جسے آج ایک ناگزیر برائی (Necessary) کی حیثیت سے اختیار کیا گیا ہے اور دوسری تبدیلی یہ آئے گی کہ ہر شخص صرف اپنی قوت و صلاحیت کے مطابق کام کرے گا اور اپنی ضروریات کے مطابق بدلہ پائے گا۔ اس معیاری حالت اور آج کی حالت کے درمیان نہ معلوم کتنی صدیوں کا وقفہ حائل ہے۔ اصل سرخ جنت مستقبل کے بہت ہی بعید گوشوں میں مستور ہے۔

پس جن نظاموں سے آج ہمیں سابقہ ہے، ان میں سے کوئی بھی اپنی معیاری شکل میں ابھی ایک منٹ کے لئے بھی برپا نہیں ہوا، بلکہ ان کے علمبردار ابھی ادھ کچرے نظام لئے چل رہے ہیں۔ بخلاف ان کے اسلام اگر اپنے کارکنوں کو ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے لئے بلاتا ہے تو انہیں ماضی میں اپنے پیش کردہ نظام کو تیس سال تک معیاری شکل میں چلتا ہوا دکھاتا ہے کوئی دوسرا نظام

ایسا ہے جو تیس سال نہ سہی، صرف ایک ہی سال کے لئے اپنے اصولوں کا صد فی صد عملی نفاذ تاریخ انسانی میں دکھا دے۔

تصریح پنجم دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو ایک مرتبہ مٹ جائے تو اس کے احیاء کا جذبہ عوام میں برقرار رہے، یا اس میں اصولی تبدیلیاں پیدا کر دی جائیں تو ان تبدیلیوں کے خلاف جدوجہد کر کے بنیادی اصولوں کو دوبارہ تازہ کرنے کی فکر کی جائے۔

جن ملکوں میں پاپائیت تھی، وہ جب مٹ گئی تو کوئی نہ تھا جو اس کے احیاء کا خواہش مند ہو۔ جاگیر دارانہ نظام جہاں جہاں مٹا وہاں پھر اس کی تجدید کرنے کے لئے کبھی کوئی تحریک نہ اٹھی۔ سرمایہ داری مٹتی ہے تو کوئی اس کے تن مردہ میں دوبارہ جان ڈالنے کے لئے کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ غیر اسلامی نظاموں کے علمبردار اپنے ماضی کو کراہیت سے دیکھتے ہیں، اور اپنی سابق کارگزاریوں کے لئے معذرتیں پیش کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے اسلامی نظام کے علمبرداروں کے لئے ان کا ماضی قابلِ فخر اور زندگی بخش رہا ہے اور اسی ماضی کے احیاء کو مستقبل کی فلاح و بہبود کے لئے ہمیشہ پسند کرتے رہے ہیں اور حق تیس سال تک محدود سہی لیکن بہر حال وہ ایک ایسا مقدس دور ہے کہ اس میں کسی کو کوئی شرمناک چیز نہیں ملتی، اس دور کے کسی واقعہ پر معذرت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی؛ اور ہم اس دور کے واقعات کو نہ تو "سبق آموز غلطیاں" قرار دیتے ہیں، نہ ان غلطیوں سے بچ نکلنے کا نام ترقی رکھتے ہیں۔

جمہوری ممالک میں نظام زندگی متغیر ہے، لیکن لوگ اسے ترقی قرار دیتے

ہیں اور پچھلے طریقوں کو نادانی کے تجربات سمجھتے ہیں۔ "حاضر" کو بدلنے کی سعی تو ہوتی ہے لیکن "سابق" کے احیاء کے لئے جدوجہد کرنے کی رجعت پسندانہ حرکت کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خود کمیونزم کے نظام میں اُس سے بہت بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی چلی جا رہی ہیں جیسی تبدیلی اسلامی نظام کے اندر حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں واقع ہوئی تھی۔ بلاتشبیہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لینن اور ٹراٹسکی کا اختلاف اس اختلاف سے کم زوردار نہ تھا جو اسلامی تاریخ میں حضرت امیر معاویہؓ کے طرزِ عمل سے امام حسینؓ کو ہوا تھا۔ جس طرح ہمارے ہاں تاریخ کی رو امام حسینؓ کو شہید کرتی ہوئی آگے نکل گئی، اسی طرح روس میں اشتراکی تاریخ کی موجوں نے ٹراٹسکی کو اٹھا کے ایک خزف ریزے کی طرح پرے پھینک دیا۔ وہاں بھی نظام میں اصولاً تغیر آیا، اور یہاں بھی آیا لیکن دونوں طرف ایک جیسے واقعات کے لئے احساس مختلف ہیں۔ واقعۂ کربلا کے ظہور پر ہماری تاریخ نے جو موڑ مڑا تھا ہم اس کو غلط کہتے ہیں لیکن روسی تاریخ نے جو موڑ مڑا تھا اس تاریخ کے بنانے والے اس کو ترقی کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ ورنہ اگر اصل واقعات کو دیکھا جائے تو لینن جس نظام کو لے کر چلا تھا اسے قائم کرتے ہوئے اسے متعدد اصولوں کو بدلنا پڑا اور پھر اسٹالن نے اسے مسخ کر دیا۔ لینن نے کولکس کی بغاوت کا سامنا کرتے ہوئے ایک نئی زرعی پالیسی اختیار کی، پھر انٹرنیشنلزم سے نیشنلزم کی طرف ساری پالیسی کو پسپا ہونا پڑا، پھر مذہب دشمنی میں نرمی پیدا کرنی پڑی، پھر انفرادی املاک کے بارے میں ابتدائی اصولوں میں خاصی تحریف کی گئی، پھر مغربی امپیریلزم کے جواب میں امپیریلزم کے کٹر دشمن بن کے اٹھنے والوں کو خود امپیریلزم کا علَم اٹھانا پڑا۔ یہ ساری "بدعات" واقع ہوئیں لیکن یہ ترقی کی

شاہراہ کے لئے سنگِ میل قرار پائیں۔

بخلاف اس کے اسلام کے معیاری نظام میں اس طرح کی جو تبدیلیاں کی گئیں، ان کے خلاف مسلمانوں میں نفرت نمودار ہوتی رہی، مصلحان ان کے خلاف ذہنوں کو تیار کرتے رہے، ان پر بندگانِ حق نے احتجاج کرنے کا حق ادا کیا، اور جہاں کسی اصلاح پسند کو موقع ملا، اس نے اصل معیاری نظام کے اصولوں کو از سرِ نو برپا کرنے کی جدوجہد کی، ای جدوجہد کی بہت سی مثالیں علمی و فکری تاریخ میں بھی موجود ہیں اور سیاسی تاریخ میں بھی۔ معیاری نظام کے احیا کی کامیاب ترین مثال حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں ملتی ہے، لیکن آپ کے علاوہ بہت سے ایسے اکابر کے کارنامے بھی ناقابل فراموش ہیں جو اگر کل کے کل نظام کا احیا نہ کر سکے تو کم سے کم اس کے جن اجزا کی تجدید کرنا ان کے بس میں تھا ان کو انہوں نے دوبارہ قائم کیا۔ تجدید و احیا کی یہ اسپرٹ ملتِ اسلامیہ میں بدستور کام کر رہی ہے اور اسی اسپرٹ کے زندہ ہونے کی وجہ سے ہم نظامِ اسلامی کی قدروں سے وابستہ ہیں اور ان کو زندگی میں عملاً کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں۔

تصریح ششم | ایک پاکباز سوسائٹی، ایک صالح نظامِ حکومت اور ایک بااخلاق تہذیب و معاشرت اگر چند روز کے لئے بھی صفحۂ ہستی پر جلوہ افروز ہو تو وہ اپنے مٹ جانے سے پہلے انسانی تاریخ پر گہرا اثر ڈال جاتی ہے۔

آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آج اگر مثلاً پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو ——— اور بالفرض تیس ہی سال چل کر ختم ہو جائے ——— تو بس وہ ایک حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی اور تاریخِ انسانی اور انسانیت کے نوعی ذہن و اخلاق پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ تمدنِ انسانی کے نوامیس

سے قطع نظر کر کے سوچتے ہیں۔ دن چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو جائے، اور چھوٹے سے چھوٹے دن میں آفتاب کے سامنے کتنے ہی ہلکے بادلے ابر چھائے رہیں، لیکن سورج کے طلوع کے چند فطری اثرات نباتات، جمادات اور حیوانات پر لازماً پڑتے ہیں، یہاں تک کہ بعد میں لمبی رات کی تاریکی اور ٹھنڈک بھی اگر آ کے مسلط ہوتی ہے تو بھی وہ دنیا سے سورج کے طبعی اثرات کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح نظام حق کا ظہور چاہے کتنے ہی قلیل وقت کے لئے ہو، اور بعض وجوہ سے چاہے وہ ناقص ہی کیوں نہ رہ جائے، پھر بھی اس کے اثرات انسانی زندگی پر پڑتے ہیں — اور ان اثرات کو بعد میں تسلطِ باطل بھی پوری طرح ملیامیٹ نہیں کر سکتا۔

آپ نیکی اور حق کے اجتماعی نظام کو الگ رکھ کر حق اور نیکی کے سپاہیوں کے انفرادی کارناموں پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ فرزندانِ انسانیت کے اچھے کارنامے ہی وہ نور ہیں جن سے ہمارا ایوانِ تاریخ روشن ہے۔ انہی کارناموں سے ہمارے ادبیات کی رگوں میں گرم گرم جذبات کا خون رواں دواں ہے، انہی کارناموں سے ہمارے افکار غذا حاصل کرتے ہیں انہی سے ہماری انقلابی تحریکیں سرگرمی اخذ کرتی ہیں اور انہی سے ہم آج بھی خیر کا سبق لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زرّیں کارناموں کو سامنے رکھیے اور سوچیے کہ کیا ان بہی خواہانِ انسانیت کی خدمات حق نسیاً منسیا ہو گئی ہیں اور تاریخ پر ان کا کوئی اثر باقی نہیں ہے؟ —— نہیں ایسا نہیں ہے حق اور نیکی کی راہ میں جینا تو جینا اس راہ میں مرنا بھی عالم انسانی کے لئے ہزار در ہزار زندگیاں پیش کش کرتا ہے جس پاکیزہ مقصد کے لئے ایک مرتبہ

کوئی انسانی جان بھینٹ چڑھتی ہے، اس کی قیمت پہلے سے بڑھ جاتی ہے، اور اس کے فداکاری دکھانے والے عشاق پہلے سے زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ میدان میں آنے لگتے ہیں۔ ایک وقت میں نیکی کے لئے جو بیج بویا جاتا ہے، وہ پھر بار بار پھوٹتا رہتا ہے ہر انسانی ایثار جو حق کے لئے خاص ہو، ایک ایسا ققنس ہوتا ہے جو بار بار اپنی راکھ سے پیدا ہوتا رہتا ہے اور اپنے نغمۂ آتشیں سے فضا کو گرم کرتا رہتا ہے۔

جب انفرادی کارناموں کا اثر اتنا دوررس ہو تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نظام حق کے ظہور کا اثر کہاں تک پہنچتا ہوگا۔ چنانچہ عرب میں جو اسلامی نظام تہذیب وسیاست برپا ہوا تھا، اس نے اپنے حلقۂ اثر میں آنے والوں پر بعض ایسے فکری واخلاقی اثرات ڈالے ہیں جو نسلاً بعد نسل آج تک کسی نہ کسی درجے میں برقرار ہیں۔ دوسری طرف اس نے اپنے مخالفین تک کے تہذیب و تمدن کا رخ بدل کے رکھ دیا۔ جن لوگوں کو علم وتحقیق سے کچھ بھی دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ مغرب میں نشاۃ ثانیہ (Renaissamee) کا ظہور جس نے فکری آزادی کے دور کا یورپ میں افتتاح کیا۔ براہ راست اسلام کے اثرات کا ردعمل تھا۔ اسی طرح مغربی اقوام کو فکری اور طبعی علوم کے خزانوں کی ساری کنجیاں ان عربوں سے ہاتھ آئیں جو اسلام کے علمبردار تھے۔ پھر مغرب کی سیاسی فکر کے ارتقاء پر اور اس کے تاریخی پس منظر پر اگر آپ گہری نگاہ ڈالیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ جمہوری نظام سیاست بھی ملت اسلامیہ کی مخصوص فکر کا ایک بالواسطہ نتیجہ ہے۔ افلاطون کی نظری جمہوریت درحقیقت مغربی جمہوریت کو ظہور میں لانے کی محرک نہیں ہوئی

بلکہ جمہوریت کی عملی روح یورپ نے عربوں سے لی اور اسے مادہ پرستی کے قالب میں لاکر بر سرِ عمل کیا۔ یہ اخوت و مساوات اور عدل وغیرہ کے جو تصورات موجودہ دور میں ابھر رہے ہیں، یہ دراصل اسلام ہی کے فکری عطیات کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں اسی طرح مغربی فلسفہ جو بدقسمتی سے خدا پرستی کے بجائے الحاد کی راہ پر چل نکلا اس کے اندر اسلامی فلسفہ کے بے شمار اثرات گندھے ہوئے ہیں اور آج غلط افکار سے ترکیب پاکر اتنے مسخ ہو گئے ہیں کہ ان کو پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس قانون اور بین الاقوامی مسائل میں جدید دنیا نے اسلام سے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔ یہی حال ادبیات کا ہے۔

اگر اسلامی نظام تیس سال کے لئے برپا نہ ہوا ہوتا تو اس کے یہ سارے نتائج کہاں سے آتے؟ —— پھر تو دنیا کا نقشہ دوسرا ہوتا۔ فلسفہ، سیاست، قانون، بین الاقوامیات اور مختلف علوم و ادبیات کا طرزِ نشو و نما کوئی اور ہوتا۔

پس محض تیس سال کہہ کر نظامِ حق کی قدر و قیمت گرا کر دکھانے کی جو کوشش کی جاتی ہے، وہ نہایت درجہ لغو کوشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامِ حق اگر ایک دن کے لئے بھی بپا ہو سکے —— اور پورا نہیں آدھا پونا ہی بپا ہو سکے تو بھی آئندہ چند صدیوں کے لئے دنیا کے علم پر، دنیا کی سیاست پر، دنیا کے ادب پر، دنیا کے قانون پر ایسے مفید اثرات چھوڑ جائے گا کہ ان اثرات کے پیشِ نظر اسے ایک دن کے لئے بپا کرنے میں اگر ہزاروں جانیں صرف ہو جائیں تو بھی سودا مہنگا نہیں۔ انسانیت کے لئے بجائے خود یہ چیز بہت بڑے درجے کا احسان ہے کہ اس کے سامنے زندگی کا ایک معیاری نقشہ عملاً پیش کر دیا جائے

اور اگر یہ نقشہ زیادہ دیر تک قائم نہ رکھا جا سکے تو اس کی ایک جھلک دکھا دینا بھی انتہائی خیر کا وسیلہ ہو سکتا ہے۔ آج آپ دیکھتے ہیں کہ ادب میں خیالی نقشے Utopia پیش کر کے انسان کو فکری و اخلاقی ارتقا کے لئے مصنوعی طور پر تحریک دلائی جاتی ہے، لیکن اگر خیالی نقشوں کو پیش کرنے کے بجائے ایسا ہو کہ ایک واقعی منظر ساری دنیا کو دکھایا جا سکے تو وہ ارتقا کی تحریک دلانے میں کتنا مؤثر ہو سکتا ہے۔

وہ نظام حق جس کی تحقیر کرنے کے لئے بعض اصحاب کہتے ہیں کہ "صرف تیس سال" چلا تھا، کبھی انہوں نے ٹھنڈے دل سے اس کی نوعیت اور اس کے معیار پر بھی غور کیا ہے؟ اس نظام نے ہر لحاظ سے جو حیرت انگیز معجزے دکھلائے ہیں، کیا کبھی اس کا مذاق اڑانے والوں نے ان معجزوں کی لامثالیت کا بھی اندازہ کیا؟

یہ ایسا نظام تھا۔

جو تقریباً" ایک غیر خونی انقلاب کے ذریعے برپا ہوا۔ پورے عرب میں اس کے قیام کے لئے چند ہزار سے زیادہ جانیں صرف نہیں ہوئیں۔

جو سی، آئی، ڈی، قانونی تحکم، تشدد اور سازش کاریوں کے بغیر چلا ہے۔ جس نے بیشمار انسانوں کی زندگیوں کا پورا نقشہ یکسر پلٹ کے دکھا دیا، ان کو جاہل سے عالم، بلکہ معلم، ان کو بے اخلاق سے با اخلاق، بلکہ نگران اخلاق ان کو فتنہ انگیزی سے امن پسند بلکہ نگہبانِ امن، اور ان کو بے تنظم سے منظم بلکہ ماہر ترین بنا دیا۔

جس کے تحت جرائم کا اوسط اتنا کم رہا ہے کہ آج کی مہذب کہلانے والی اقوام

میں سے کوئی اپنے جرائم کی تعداد اتنی گھٹا نہیں سکی۔
جس کی عدالتوں میں گنتی کے مقدمات پیش ہوئے۔
جس کے حکمرانوں کا معیار زندگی ہر لحاظ سے عوام کے برابر رہا۔
جس کے علمبرداروں نے قلت تعداد اور بے سروسامانی میں بھی بڑی سے بڑی طاقتوں سے ٹکرا کے ان کا زور توڑ کر رکھ دیا۔
جس کی فوجوں نے میدان جنگ میں ٹھوس اخلاق کا مظاہرہ کیا اور اپنے دشمنوں پر بھی احسانات کئے۔
جس نے اپنے اصولوں کے بارے میں کبھی سودا بازی Compromise کی روش اختیار نہیں کی۔
جس نے جماعت کی فکری وحدت کو ایسی مستحکم بنیادوں پر اٹھایا کہ نہ کوئی عصبیت اسے توڑ سکی اور نہ سیاسی تفرقہ نمودار ہوا۔
اور — جس کے خلاف بطور ردعمل نیچے سے کوئی انقلابی (Reactionary) تحریک نہیں پیدا ہوئی۔
اور — جس میں روزمرہ کی زندگی اعلیٰ انسانی اخلاق کے مظاہرے سے لبریز تھی اور گھٹیا اخلاق کے نمونے تقریباً ناپید تھے۔

یہ معیاری نظام جس کی کوئی مثال کسی غیر اسلامی فکر کے علمبرداروں کی طرف سے آج تک سامنے نہیں آسکی، اگر تیس سال تک چلا تو آخر اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔ نوع انسانی کے سامنے زندگی کا ایک معیاری نمونہ اتنی دیر تک رکھا گیا کہ وہ اسے ہر پہلو سے خوب اچھی طرح دیکھ لے، اور پھر اس کی نقل اتارنے

کے لئے جدوجہد کرتی رہے ۔ بجائے اس کے کہ کوئی خیالی نقشہ (Utopia) ہمارے سامنے رہے ، آج ماضی ایک "امر واقعہ" کو ہمارے سامنے لئے کھڑا ہے اور ہم ایک روشن مستقبل کی تعمیر اسے سامنے رکھ کر کر سکتے ہیں ۔

بالفرض اگر دوبارہ یہی صورت پیش آئے کہ اس طرح کا صالح نظام صرف تیس سال کے لئے رونما ہو تو اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ انسانیت کی فلاح کی منزل آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں تازہ ہو جائے گی ۔ ایک لمبی رات سے پہلے اگر ایک چھوٹا دن بھی دنیا کو نصیب ہو جائے تو آفتاب حق کے طلوع کی برکات دن گزر جانے کے بعد بھی برابر محسوس کی جا سکیں گی ۔

اصول پسندی کا تقاضا ان تصریحات کو ایک طرف رکھ کر خوب سوچیے کہ کسی اصول و نظام کے قبول یا رد کرنے کے بارے میں ایک سلیم الطبع آدمی کا طرز فکر کیا ہونا چاہئے ؟

آپ صفائی کے اصول کو ہر لحاظ سے پرکھ کر حق پاتے ہیں ، لیکن فرض کیجئے کہ آپ ایک ایسے ماحول میں رہتے ہیں جو سخت گندہ ماحول ہے ۔ آپ کی سوسائٹی کا ہر شخص گندگی پھیلانے میں سرگرم ہے اور سوسائٹی ایک نظام غلاظت چلا رہی ہے ۔ فرض کیجئے آپ اپنے ماحول کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور اس سے آپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول پر آج سے پچاس سال پہلے صرف ایک ہفتہ ایسا آیا تھا جب کہ یہاں ہر طرف صفائی ستھرائی تھی ، ہوا میں تعفن نہ تھا ، کریہ مناظر نہ تھے ، بیماریاں نہ تھیں ، بلکہ پاکیزگی کا دور دورہ تھا لیکن یہ حالت تھوڑے دنوں رہ کر ختم ہو گئی اور پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی ۔ یا آپ کو تاریخ میں ایک دن بھی ایسا

نہیں ملتا۔ اب آپ کا رویہ کیا ہوگا؟
کیا محض اس وجہ سے کہ سابق تاریخ میں صفائی کا دور بڑا مختصر سا گزرا تھا، یا سرے سے کوئی دور ایسا آیا ہی نہ تھا، اور چونکہ آج تمام لوگ غلاظت پسند ہیں اور بظاہر پائداری نظام غلاظت ہی میں محسوس ہوتی ہے، آپ اپنے بارے میں یہ فیصلہ کریں گے کہ آپ کو بھی غلاظت پسند اور نظام غلاظت کا سچا خادم بن جانا چاہئے؟ —— نہیں اگر آپ کے اندر خودی زندہ ہوگی تو آپ یوں سوچیں گے کہ غلاظت بہرحال انسانیت کے لئے غلط اور مضر ہے اور صفائی کا اصول و نظام اس کے لئے برحق اور مفید ہے، اس لئے میرا فرض یہ ہے کہ نظام غلاظت کے خلاف لڑنے اور اصول صفائی کو عملاً قائم کرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگادوں۔
آپ اصول پسندوں کی طرح سوچیں گے کہ اصول صفائی کے تحت گزرنے والا ایک ہی دن اگر پوری زندگی کی جدوجہد کے معاوضے میں حاصل ہو تو بھی یہ غلاظت کے نظام کے تحت سو سال جینے سے زیادہ قیمتی ہوگا۔ بلکہ آپ یہ عزم لے کے اٹھیں گے کہ صفائی کا نظام قائم کرنے کے لئے غلاظت سے لڑتے ہوئے اگر ساری زندگی ختم ہو جائے اور عملاً اس مہم میں ایک منٹ کے لئے بھی کامیابی حاصل نہ ہو تو بھی با اصول آدمی کا طرز عمل یہی ہو سکتا ہے۔ اور جو لوگ اس ایمان اور اس طرز فکر کے ساتھ اٹھتے ہیں، بازی انہی کے ہاتھ رہتی ہے۔
بالکل اسی طرح اسلام کے اصول اور نظام کو معقول طریق سے جانچیے اس کے برحق ہونے پر غور کیجئے، اس کے افادی نتائج کا اندازہ کیجئے، پھر اگر آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ یہی اصول و نظام حق ہے، یہی مطابق فطرت ہے، یہی مفید انسانیت

ہے تو اس کے بعد آپ کا طرزِ عمل اس کے سوا کچھ اور ہونا ہی نہ چاہئے کہ آپ اپنی ساری قوتیں اس اصول و نظام کو برپا کرنے کے لئے صرف کر دیں۔ اگر آپ کی کوششوں سے اسلام دوبارہ تیس ہی سال چلے گا تو بھی اس تیس سال کے عرصے میں وہ خیر و برکت کے اتنے تحائف دنیا کو دے کر رخصت ہو گا کہ اس میں بگاڑ کے دوبارہ آنے میں ایک لمبی مدت صرف ہو گی۔

یہ جو ضرب المثل ہے کہ لومڑی کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی زیادہ اچھی ہوتی ہے، اس کو اگر آپ یوں بدل لیں تو اچھا ہو کہ نظامِ حق کے تحت ایک دن جینا نظامِ باطل کے تحت ہزار سال جینے سے زیادہ بہتر ہے۔ بلکہ آپ اس سے بھی آگے بڑھیں اور یہ نظریہ سامنے رکھیں کہ غیر اسلامی نظام کے تحت امن چین سے پڑے رہنے سے وہ موت اچھی جو اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد میں نصیب ہو!

مسئلہ تقدیر کا الٹا استعمال

جہاں علم اور اختیار آیا مجھیے کہ ذمہ داریوں کے پہاڑ ساتھ آئے۔ جہاں انتخاب کا حق ملا وہاں فوراً بھلے اور برے کا سوال پیدا ہو گا، اور برے کا سوال پیدا ہوا تو جزا و سزا کا مسئلہ نمودار ہو گا۔ جسے قوت فیصلہ مل گئی وہ امتحان میں پڑ گیا اور جو امتحان میں پڑا اس کی ناکامی اور کامیابی کا دارومدار خود اس کی مساعی پر ہے۔

لیکن حضرت انسان کا حال یہ ہے کہ علم اور اختیار تو لے لیا لیکن ذمہ داریوں سے اب کتراتے ہیں۔ امتحان میں تو پڑ گئے لیکن محنت کرنے سے یہ کہہ کر گریز کرتے ہیں کہ اگر ممتحن نے چاہا تو پاس کر دے گا، اور اگر کوئی پرچہ خراب کر بیٹھیں تو ارشاد فرمائیں گے کہ ممتحن نے تو ہمارے فیل کرنے کا فیصلہ کر ہی رکھا ہے، ہمارا کیا قصور! اسی لئے قرآن میں یہ بات کہی گئی ہے کہ آدمی کو صلاحیتیں تو وہ دی گئیں کہ یہ امانت

خلافت کو اٹھانے والا بنا، لیکن اب خواہش پرستیوں اور آرام پسندیوں کے طفیل اس امانتِ گراں بہا کی ذمہ داریوں سے گریزمی ہے، سو یہ رویہ بڑا ہی ظالمانہ اور جاہلانہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی عظیم الشان سلطنت کے دستور و آئین کے جو پہلو انسان پر بذریعہ وحی و الہام واضح کئے ہیں ان میں سے ایک پہلو تقدیر کا ہے۔ آخر یہ سلطنت بے چلائے نہیں چل رہی ہے بلکہ اس کے لئے کوئی منصوبہ بندیاں ہیں، کوئی نقشہ ہائے کار ہیں، کوئی پروگرام ہیں، کچھ قواعد و ضوابط ہیں، اسباب اور نتائج کا ایک سسٹم ہے، موجودات کا کوئی ریکارڈ ہے، حوادث کے لئے کوئی اوقات ہیں، حرکت ہے تو اس کے پیچھے مقاصد ہیں، عمل ہے تو اس کے پیچھے علم ہے، قوانین ہیں تو اس کے پیچھے حکمت ہے، تخریب و تعمیر ہے تو اس کے پیچھے کچھ مصالح ہیں اور تصادم و کشمکش ہے تو اس کے پیچھے کوئی اصول ہیں۔ ان ساری حقیقتوں کو جب سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ذرّے ذرّے کی کوئی تقدیر ہے اور تقدیر کے بغیر ہم موجودات میں سے کسی ایک کا بھی تصور نہیں کرسکتے۔ خَلَقَ، فَقَدَّرَ، فَهَدٰی وہ روشن حقیقت ہے کہ جدھر نظر دوڑاؤ ادھر ہی اس کے ثبوت بکھرے پڑے ہیں، خلق ہے تو قدر ہے، قدر ہے تو ہدایت ہے۔

اگر خالق کو خالق ماننے کے بعد تقدیر ساز اور ہادی نہ مانا جائے تو ایک ایسے ناقص خالق کا تصور حاصل ہوتا ہے کہ پھر اسے خالق ماننا مشکل ہو جاتا ہے۔ جو خلق کرے اور اندھا دھند کرے، جس کے سامنے کوئی اسکیم نہ ہو، جو

قوتوں کی تقسیم کے لئے کوئی خاص پیمانہ رکھتا ہو، جس کی عنایتوں اور جس کی قربانیوں کے لئے کوئی خاص اصول نہ ہو، جو اوقات کی تحدید نہ کرے، جو خزانوں کا احاطہ نہ رکھتا ہو، جو مخلوق کے علم سے کورا ہو وہ ایک ذہنی بُت تو ہو سکتا ہے، خدا نہیں ہو سکتا۔

لیکن اسی تقدیری نظام کی حد بندیوں کے اندر اُس کی تقدیر نے ہی انسان کو خلافت کا مقام دیتے ہوئے علم و اختیار سے نوازا ہے۔ اس کے لئے قدم قدم پر دوراہے بنا دیے ہیں، وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ! اسے خیر و شر کی قوت تمیز بھی دی ہے اور الہام کی روشنی بھی دی ہے کہ وہ جدھر قدم بڑھائے علم کے ساتھ بڑھائے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا۔ پھر اسے آزادی دی ہے کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ جی چاہے تو ایمان کا راستہ اختیار کرے اور جی چاہے تو کفر کی راہ پسند کرے۔

انسانی زندگی کی حالت کائنات میں ویسی ہی ہے جیسی کسی ریاست میں ایک نیم خود مختار (Autonomous) صوبائی یونٹ کی ہو۔ اس خود مختاری کی حدود جہاں تک وسیع ہیں وہاں تک آدمی جو چاہے کر گذرے، لیکن کچھ دور جا کر یہ حدود ختم ہو جاتی ہیں اور جبریت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس سرحد کے باہر آدمی چاہے جو بھی جتن کرے وہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہاں بروئے دستور جو محدود آزادی اسے حاصل ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔

جبر و اختیار کی دو حیثیتوں کے اس طرح جمع ہو جانے سے کوتہ نظر لوگ ہمیشہ بڑی الجھنوں میں پڑے ہیں۔ جس کسی نے اپنے اختیار کا غیر معمولی مطالعہ کیا

اس کی نگاہ سے جبر کا پہلو اوجھل ہو گیا، اور جس نے جبریت کا راز پا لیا اس کی نگاہ اختیار سے ہٹ گئی۔ پھر بارہا ایسا ہوا ہے کہ جبریت کے مظاہر کو لوگوں نے اختیار کے مظاہر سے ٹکرانے کی کوشش کی ہے اور ایک پہلو کے ماننے والوں نے دوسرے پہلو کی نفی کو لازم قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ پورا نظام جبریت اُس اختیار کی نفی نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے، جسے ہم روزمرہ زندگی میں محسوس کرتے ہیں اور جس کو صراحتہً اللہ نے اپنے انبیاء کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اسی طرح ہمارا پورا دائرہ اختیارات اُس نظام جبریت کو باطل نہیں کرسکتا جسے مانے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں اور جسے خود اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے۔

لیکن جہاں تک محض اختیار کے دعوے کا تعلق ہے اسے لے کر جو بھی اُٹھے اسے جبریت کی لہروں کے چند ہی تھپیڑے اصل حقیقت سے آشنا کر دیں گے، بخلاف اس کے جب لوگ محض جبریت کے مدعی بنتے ہیں تو اس چکر سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جبریتِ تام اور اختیار کی کلی نفی کی طرف بالعموم وہ لوگ جاتے ہیں جو بہ حیثیتِ انسان اپنی فطری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام رہتے ہیں اور جن کے لئے اپنی خواہشات اور میلانات کی غلامی سے نکلنا بڑا شاق ہوتا ہے۔

ذمہ داریوں سے گریز کرنے والوں کو جتنی اچھی پناہ گاہ جبریت کے فلسفے میں حاصل ہوتی ہے اتنی کسی اور طرح حاصل نہیں ہوتی۔

چنانچہ اقامتِ دین کی دعوت کے علمبرداروں کو اس کا خوب اچھی طرح اندازہ

ہوگا کہ اس دعوت کے راستے میں فلسفۂ جبریت بعض اوقات بری طرح روک بنتا ہے اور یہ خواص سے لے کر عامیوں تک یکساں سرایت کئے ہوئے ہے۔ آپ لوگوں سے کہیے کہ غلبۂ دین کے لئے کچھ کرو تو جواب ملے گا کہ یہ سب کچھ تو اللہ کے بس میں ہے، جب تک اس نے دین کی مخالف طاقتوں کو سرفرازی دے رکھی ہے، کون ہے جو اس سرفرازی کو پستی سے بدل سکے۔ اور جب تبدیلی کا وہ وقت آئے گا تو خود بخود اس کے سامان ہو جائیں گے! وہی بات کہ ؎

تن بہ تقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

بڑے بڑے مجرموں سے بات کیجئے تو وہ فوراً اپنی ذمہ داری "قسمت" کے سر ڈال دیں گے۔ ان کے خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو خلاصہ یہ نکلے گا کہ ہم از خود تو جرم کرنا نہیں چاہتے بلکہ نیک بن کر رہنے ہی کو پسند کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ نے ہمیں بالکل مجبور کر دیا ہے کہ ہم جرم کریں، لہٰذا اصلاح کا اگر ہم ارادہ بھی کریں اور اس کے لئے سعی بھی کریں تو رائیگاں ہے۔ جیسا کہ حافظ نے کہا تھا ؎

در کوئے نیک نامی ما را گذر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

یعنی انسانی زندگی کے نیم مختار (Autonomous) صوبے کا حکمراں صوبے کا نظم و نسق ٹھیک سے نہیں چلاتا۔ الٹے تلوّن میں وقت گذارتا ہے،

عیاشیاں کرتا ہے، دشمنوں کی مدافعت کا سامان نہیں کرتا، رعایا کی خبرگیری کا حق ادا نہیں کرتا، لیکن جب پوچھتے ہیں کہ تاج و تخت کی گراں بار ذمہ داریاں سر لے کر یہ کیا حال بنا رکھا ہے جناب نے؟ تو ارشاد ہوگا کہ دراصل یہ سب کچھ جو میں کر رہا ہوں یہ مرکزی حکومت کے خفیہ اثرات کے تحت کر رہا ہوں، میرا تو کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ بھلا کہاں بادشاہ سلامت اور کہاں مجھ جیسا ایک ناچیز وائسرائے! اختیار تو بادشاہ کا ہے، وائسرائے تو بس یونہی آلۂ کار ہوتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس طرح کی باتیں ہمیشہ اونچے درجے کی دینی و اخلاقی ذمہ داریوں کی دعوت کے جواب میں تو کہی جاتی ہیں، لیکن اپنی دن رات کی زندگی میں کوئی بھی جبریت کے فلسفے پر تکیہ نہیں کرتا۔ ہمارے ایک دوست، اس دعوت کے جواب میں کہ اپنی زندگی بدلیے، فرمانے لگے کہ اس میں ہمارا کیا اختیار، یہ تو خدا کی طرف سے ازل کے دن لکھا گیا تھا۔ اس پر ان سے عرض کیا گیا کہ آپ کا بچہ جب بیمار ہو جاتا ہے تو آپ رات کو سردی میں گرم بستر چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں، بہتر سے بہتر ڈاکٹر کو تلاش کر کے لاتے ہیں اور بہتر سے بہتر دوائیں اپنا مال خرچ کر کے حاصل کرتے ہیں، پھر تیمارداری میں اپنا آرام قربان کرتے ہیں —— اس سارے سلسلہ میں تو آپ کو کبھی فلسفۂ جبریت یاد نہیں آتا اور کبھی آپ یوں نہیں سوچتے کہ بیماری اور صحت تو خدا نے پہلے ہی لکھ دی ہے پھر ہم کیوں علاج کے چکر میں پڑیں، مگر بس جہاں خدا کے دین کا کوئی مطالبہ سامنے آیا تو آپ نے جبریت کے

فلسفہ کو عذر میں پیش کر دیا۔ اگر آپ بے روزگار ہو جائیں تو در در جا کر روزگار تلاش کریں، سفارشیں لے کے دفتروں میں گھومیں، ایک ایک کی منت سماجت کریں، ادھر ادھر سے معلومات حاصل کریں۔ گھر میں آٹا ختم ہو جائے تو کہیں سے ادھار لے کر بھی آٹا خرید لائیں۔ کوئی آپ کی عزتِ نفس پر حملہ کر دے تو دماغ اور زبان اور ہاتھ پاؤں کی ساری قوتیں انتقام میں لگا دیں۔ کوئی آپ کا مال مار کھائے تو اس کے خلاف مقدمہ لڑنے کے لئے اپنی سی جو کچھ کر سکتے ہوں کر گذریں۔ ان معاملات میں تو کبھی تقدیر کا سوال پیدا نہ ہو۔ لیکن بات جب خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت کی آئے اور حمایتِ دین کے لئے آپ کو پکارا جائے تو آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ روزِ اول سے یہ معاملات طے ہو چکے، اب سوچنا کیسا اور کوشش کیسی؟ یا دونوں طرف جبریت کے آگے سر جھکائیے، یا دونوں طرف سعی کا حق ادا کیجئے۔ یہ کیا کہ اپنی خواہشات ہوں تو آپ ہمہ تن اختیار بن جائیں اور خدا اور رسول کا حکم سامنے آئے تو جبریت کی پناہ گاہ میں جا چھپیں! براہِ کرم اس فریبِ نفس سے نکلیے!

یہ سن کر وہ بالکل لاجواب ہو گئے۔

تقدیر جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داریوں کا دوسرا نام ہے، اور شریعت بندوں کی ذمہ داریوں کی وضاحت ہے اور یہ وضاحت بھی خود اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔ لیکن وہ بندے عجیب بندے ہوتے ہیں جو اپنی ذمہ داریوں سے تو بھاگتے ہیں لیکن خدا کی ذمہ داریوں پر بحث کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی ساری ذمہ داریاں بھی اٹھا کر خدا کے سر ڈال دیں تاکہ ان کے سر کوئی ذمہ داری باقی نہ رہے۔

مسئلہ تقدیر کے بیان کا مقصد | قرآن میں مسئلہ تقدیر کے جو پہلو بے نقاب کئے گئے

ہیں وہ محض اسرار بیانی کے طور پر نہیں کئے گئے ہیں، بلکہ ان کا ایک مقصد ہے اور ان کا مقصد وہی ہے جو پورے قرآن کا مقصد ہے ——— یعنی بندوں کو اللہ پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت پر آمادہ کرنا!

آپ ذرا غور و فکر سے کام لیں تو یہ بات باور کرنے کے لئے آپ کی عقل ہرگز تیار نہ ہوگی کہ جس قرآن کا مدعا ایمان و اطاعت پر آمادہ کرنا ہو وہ کچھ ایسے نکتے بھی بیان کرے گا جو ایمان سے فرار میں مدد دینے والے ہوں یا جن سے طاعت کا رجحان ہی ختم ہو جائے اور جذبات ہی سرد پڑ جائیں۔ پس جبریت مطلقہ کے قائلین جس طرز پر اپنے من گھڑت فلسفے کو طاعت سے گریز کرنے کے لئے دلیل بناتے ہیں وہ قرآنی منشا کے بالکل خلاف ہونا چاہئے۔ یہ جبریت محضہ کی دلیل تو تمام انبیاء کی بعثت اور تمام کتب آسمانی کے نزول اور تمام ہجرتوں اور تمام جہادوں اور شہادتوں اور مالی و جانی قربانیوں کو جو دین کی راہ میں کی گئیں بالکل بیکار اور فضول بنا کے رکھ دیتی ہے۔ جب اللہ بالجبر لوگوں سے نیکی اور بدی کرا رہا ہو تو دعوت حق کے کیا معنی! کفر و دین، فسق و تقویٰ اور معروف و منکر کی تقسیم کا کیا مطلب؟ انبیاء کو کھڑا کرنے کا کیا فائدہ؟ اور کتابیں نازل کرنے کا کیا مقصد؟ یہ فلسفہ تو گویا اللہ میاں پر بہتان باندھتا ہے کہ نعوذ باللہ، وہ تضاد کار اور لایعنی کام کرنے والے ہیں۔

پس لازم ہے کہ قرآن کا فلسفۂ تقدیر سراسر طاعت و تقویٰ کی طرف لے جانے والا ہو، نہ کہ اس سے فرار کے چور دروازے کھولنے والا۔ آپ ان سارے مقامات کا جائزہ لیں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات اپنی مشیت، اپنی جباری و قہاری، اپنے تسلط اور غیر محدود علم و قدرت کا ذکر کیا ہے آپ دیکھیں گے کہ جہاں کہیں

جبریت کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں یا تو لوگوں کو کسی معصیت سے ہٹانا مطلوب ہے یا کسی طاعت کی طرف بلانا مطلوب ہے۔

قرآن میں تقدیر کا بیان شریعت سے بے نیاز ہونے کے لئے نہیں بلکہ شریعت کا پابند بنانے کے لئے آیا ہے خدا کی مشیت کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس کی رضا کی پیروی چھوڑ دینے کے لئے اور شیطان کا دامن تھام لینے کے لئے لوگوں کو ایک دلیل مل جائے بلکہ اس لئے کیا گیا کہ انسان اللہ کی رضا کے پیچھے چلنے ہی کو اپنے لئے لازم سمجھے۔ وہاں منشا یہ ہے کہ لوگ بدی سے مضبوط ہو کر لڑ سکیں اور یہاں اثر یہ لیا گیا کہ الٹا مجاہدین بدی کے سامنے ہتھیار ڈال کے پڑے ہیں! کیسا دلچسپ ماجرا ہے کہ قرآن نے فلسفۂ تقدیر کو جس مدعا کے لئے استعمال کیا ہے دنیا اس کے بالکل الٹ استعمال کرتی ہے۔

آئیے ذرا قرآن کو ملاحظہ کیجئے:

ذکر تقدیر برائے عزم صمیم

سورۂ انعام میں نبی صلعم کی زبان سے یہ اعلان کرایا جاتا ہے کہ:-

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط قُلْ لَّا اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ۝

اے محمدؐ! اعلان کر دیجئے کہ مجھے اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ کہہ دیجئے کہ میں تمہاری خواہشوں کی پیروی نہیں کر سکتا۔ اگر میں ایسا کرتا تو (راہِ حق سے) بھٹک گیا ہوتا اور میں ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوتا۔

قل انی علی بینة من ربی وکذبتم بہ ط ما عندی ما تستعجلون بہ ط ان الحکم الا للہ ط یقص الحق وھو خیر الفاصلین قل لو ان عندی ما تستعجلون بہ لقضی الامر بینی وبینکم ط واللہ اعلم بالظلمین۔

کہہ دیجئے کہ میں اپنے آقا کی طرف سے ایک روشن دلیل پر قائم ہوں لیکن تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ میرے بس میں وہ کچھ (یعنی عذاب) ہے ہی نہیں جس کے لئے تم جلد بازی کر رہے ہو۔ اللہ کے سوا کسی اور کو فیصلہ دینے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ حق کو بیان کر دیتا ہے اور (پھر جو نہ مانے اس کے لئے) وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دیجئے کہ اگر میرے بس میں وہ کچھ ہوتا جس کے لئے تم جلد بازی کر رہے ہو تو میرے تمہارے درمیان اس جھگڑے کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا ط —— اور اللہ خود ظالموں کو (اور ان کے لئے عذاب بھیجنے کے موقع کو) خوب جاننے والا ہے۔

یہ اعلان اپنے ماحول میں طوفان کی ایک لہر سے کم نہ ہوگا۔ مخالفین حق کی کثیر تعداد کے سامنے اس دو ٹوک طریق سے اپنے عزم کو کہہ دینا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا تھا اور اس کے نتائج جو ممکن تھے وہ ایک ایک سامنے تھے۔ اس موقع پر نظام تقدیر کی طرف کچھ اشارات یوں کئے گئے:-

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو ط ویعلم ما فی البر والبحر ط وما تسقط من ورقة الا یعلمھا ولا حبة فی

اور غیب (کے خزانہ ہائے اسرار) کی کنجیاں اسی کے قبضے میں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں۔ اور جو کچھ بحر و بر میں ہے اس کو وہ جانتا ہے، اور کوئی پتہ تک بغیر اس کے نہیں

ظُلُمٰتِ الارض ولا رطب ولا یابسٍ الا فی کتابٍ مبین۔ (الانعام۔ رکوع ۷) — مگر تاکہ اسے اس کا علم ہو۔ اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ایسا ہے اور نہ کوئی خشک و تر ایسا ہے کہ جو ایک صاف صاف لکھی ہوئی کتاب میں (درج) نہ ہو۔

اللہ کی قدرت اور اس کی صفات کا یہ بیان محض برائے وزن بیت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرف اپنے اندر کفار کے لئے دھمکی لئے ہوئے ہے، دوسری طرف اس میں اللہ کے آگے جھکنے کی دعوت مخفی ہے، اور تیسری طرف اس کا منشا نبی صلعم اور مومنین کے اس عزم کی پشت پناہی کرنا ہے جسے اوپر کی آیات میں مخالفین حق کے سامنے کھول کے رکھ دیا گیا ہے، یہ نکتہ اس اعلان کے نتیجے میں نمودار ہونے والے حوادث میں نبی صلعم اور آپ کے پیروؤں کے لئے بہترین سامان استقامت ہے۔

ذکر تقدیر برائے استقامت

خدا کو رب مان لینا یوں تو سستا کھیل ہے لیکن جب خدا کو رب ماننے سے مصنوعی رب بگڑتے ہیں تو پھر قدم جما کے کھڑا ہونا ہر آدمی کا کام نہیں رہتا۔ قرآن میں اہل ایمان کو آزمائشوں کے مقابلے میں درس استقامت دیتے ہوئے بھی تقدیر کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔

مثلاً سورۂ عنکبوت کا موضوع ہی آزمائش میں استقامت کی تعلیم ہے۔ آغاز کلام یوں ہوتا ہے کہ:- احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون ہ ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا

ولیعلمن الکٰذبین ٥ (۲-۳) پھر آگے چلیے تو آتا ہے۔ ومن الناس من یقول
اٰمنا باللہ فاذا اُوذی فی اللہ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللہ (۱۰)

اس سلسلۂ بیان میں تقدیر کی حقیقتیں یوں بے نقاب کی جاتی ہیں :-

(۱) کل نفس ذائقۃ الموت ثم الینا ترجعون ٥ (۵۷) — (ہر جان (کی تقدیر یہ ہے کہ وہ) موت کا مزہ چکھنے والی ہے، پھر تم (حساب کے لئے) ہمارے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

(۲) وکاین من دابۃ لا تحمل رزقھا ج اللہ یرزقھا وایاکم ج وھو السمیع العلیم (۶۰) — اور کتنے ہی جاندار (تمہارے سامنے) ہیں کہ اپنا رزق (اپنی پیٹھ پر) لادے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان سب کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی! اور وہ تمہارے (مطالبوں کو) سننے والا اور (تمہاری ضروریات کو) جاننے والا ہے۔

(۳) اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ ویقدر لہ ج ان اللہ بکل شیءٍ علیم ٥ (۶۲) — اللہ اپنے بندوں میں سے جس کسی کے لئے چاہتا ہے رزق کو وسیع کر دیتا ہے اور (چاہتا ہے تو) سکیڑ دیتا ہے۔ اور یقیناً وہ (رزق کے اس نظام سے تعلق رکھنے والی) ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

یہاں اس بیان کا صاف مقصد یہ ہے کہ موت سے خوف کھانا چھوڑ دو، یہ تو آنی ہے، فکر کرو تو اس کی کہ موت کے بعد خدا کے سامنے حساب کے لئے پیش ہو گے تو اُس وقت کیا ان لوگوں میں شامل ہونا چاہتے ہو جو موت سے ڈر کر حق سے ہٹ گئے یا ان لوگوں میں جنہوں نے حق کے لئے متاعِ جان بھی بازی میں لگا دی؟ دوسری بات یہ سمجھائی گئی کہ یہ کاوش کرنا بھی چھوڑ دو۔ کہ گھر بار اور روزگار

تم سے چھوٹ جائیں گے۔ ان سارے حالات کے باوجود اللہ تم کو رزق دینے والا ہے جس طرح وہ تمہارے سامنے ہر جاندار کو دے رہا ہے۔ یہ اسی کے اختیار میں ہے کہ کسی کو کم دے اور کسی کو زیادہ دے۔ پس تم رزق کی تنگی کے اندیشے سے حق سے انحراف نہ کرنا۔

اب دیکھ لیجئے کہ یہاں تقدیر کا بیان صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ اہل ایمان حق کی حمایت و نصرت اور استقامت کی ذمہ داریوں میں کوتاہی نہ کریں۔

بالکل اسی مقصد کے لئے مسئلہ تقدیر ایک دوسرے موقع پر بھی بیان ہوا ہے۔ وہاں بھی ایک چیلنج کے انداز میں نبی صلعم سے دینِ توحید پر عزم صمیم کا اظہار کرایا جاتا ہے کہ قل یاایھا الناس ان کنتم فی شك من دینی فلا اعبد الذین تعبدون من دون اللہ ولکن اعبد اللہ الذی یتوفکم ج وامرت ان اکون من المومنین ۝ پھر یہ حکم اور تنبیہ کی کہ ، واقم وجهك للدین حنیفا ج ولا تکونن من المشرکین ۝ ولا تدع من دون اللہ ما لا ینفعك ولا یضرك ج فان فعلت فانك اذاً من الظالمین ۝

ذرا محسوس کیجئے کہ یہ مقام کیا ہے؟ حکم ہوا ہے کہ صاف صاف کہہ دو کہ اگر کسی کو پہلے کوئی شبہ تھا تو وہ آج سُن لے کہ میں اللہ کے سوا تمہارے معبودوں کی عبادت کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوں۔ پھر مطالبہ ہے کہ دین کی طرف یکسوئی کے ساتھ رُخ کر لو!

یہ کہتے ہوئے آنے والی آزمائشوں کے بارے میں اطمینان دلایا کہ اللہ کے سوا جو طاقتیں بھی ہیں وہ "لا ینفعك" اور "لا یضرك" کے درجے میں ہیں۔ پھر

مثبت طور پر اپنے کامل اختیارات کو اللہ نے بیان فرمایا کہ:-

وان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو ، وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ

اگر وہ (اللہ) تم کو کوئی نقصان پہنچائے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں کہ جو اس سے نجات دلا سکے، اور اگر وہ تمہارے لئے کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو پھر اس کے فضل کو روکنے والا بھی کوئی نہیں -

یہ ہے درس عزم و ثبات اور یہ ہے وعظ استقامت! ——— لیکن یاروں نے اس سے بزدلی، جمود، بے حسی اور بے ہمتی کے جواز کے لئے طرح طرح کے نکتے نکال لئے!

حق کی طرف پیشقدمی کا درس

سورۃ الحدید میں جو آیت مغفرت ربی اور ارض و سما جیسی وسیع جنت کی طرف پیش قدمی کرنے کا درس بجاتی ہے اسے ملاحظہ کیجئے۔ فرمایا "سابقوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا کعرض السماء والارض"۔ اور پھر متصلاً نظام تقدیر کا ذکر کیا تاکہ ان وادیوں میں پیشقدمی کرنے والوں کو جو مہالک خوفزدہ کر سکتے ہیں ان کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سب کچھ اللہ کے بس میں ہیں اور وہ بہرحال اپنی طرف آنے والوں کا خود پاسبان ہے۔ کیا ہی تسکین بخش الفاظ ہیں:-

ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتب من قبل ان نبرأھا ان ذالک علی اللہ یسیر

کوئی مصیبت ایسی نہیں کہ جو تم کو زمین میں پہنچے یا خود تمہاری جانوں کو پہنچے، مگر وہ اس سے قبل کہ وجود میں آئے ہمارے نوشتہ میں لکھی ہوئی ہوگی، اور یہ صورت دکھ ایک شے

کے وجود میں لانے سے قبل اس کی تقدیر کا پورا پورا علم اللہ کو ہو، اللہ کے لئے بہت ہی آسان ہے'۔

لیجئے، یہاں اس حقیقتِ تقدیر کی وضاحت کا مقصد بھی سن لیجئے:۔

لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتٰکم ۔ (یہ وضاحت اس لئے ہے) اگر تم جو کچھ ہاتھ سے جائے اس پر افسوس نہ کرو اور جو کچھ تمہیں حاصل ہو اس پر اکڑ نہ جاؤ۔

بس یہ الفاظ ہیں جو حقیقتِ تقدیر کے قرآن میں بیان کئے جانے کا مقصد واضح کرتے ہیں (آل عمران میں بھی یہی بات دہرائی گئی ہے)۔ تعلیم یہ دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی جنت، رضا کی طرف جو لوگ اقدام کرنے کا فیصلہ کریں اُن کے لئے لازم ہے کہ وہ اطاعت کے مقامات سے گذرتے ہوئے ہر نقصان کے غم سے اور ہر فائدے پر اکڑنے سے پاک رہیں۔ ورنہ نقصانات کے افسوس میں اگر وہ گھر گئے یا فوائد کے نشے میں آ گئے تو طاعت کا دامن چھوٹ جائے گا۔ اس مقامِ استقامت و حیثیت پر جمانے کے لئے مسلمانوں کو تقدیر کے چہرے سے نقاب اٹھا کر اس کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے کہ نفع و نقصان اللہ کی طرف سے ہیں، ایک منصوبے کے تحت ہیں، ایک حکمت کی بنیاد پر ہیں، اٹل ہیں، اور حق پر چلو یا باطل پر ان وادیوں سے ہو کر نکلے بغیر تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں۔

احکامِ جہاد اور مسئلہ تقدیر

جہاد کے لئے جو خطبات قرآن میں نازل ہوئے ہیں ان میں سے کوئی ایسا نہیں کہ جس میں جہاد کے احکام کے ساتھ ساتھ حقائقِ تقدیر نہ بیان ہو رہے ہوں۔ یہ محض اس لئے کہ جہاد کی قربانی پر

اطمینانِ قلب کے ساتھ آمادہ کرنے میں ان حقائق کا علم ممد ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ النسا میں جہاں فرمایا کہ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ ۔۔۔۔ الخ۔ وہاں دلوں کا چور پکڑا کہ تم شاید موت سے ڈرتے ہو تو سن لو کہ:۔

أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ — تم جہاں بھی ہو، اپنے وقت مقررہ پر موت
وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ — تم کو آ لے گی، اگرچہ تم مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ پناہ لئے ہوئے ہو۔

دیکھ لیجئے کہ موت کے اٹل تقدیر ہونے کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ موت کا خوف دل سے الگ رکھ کے مسلمان فریضۂ جہاد پر کمربستہ ہو جائیں۔

اسی سلسلۂ کلام میں نفاق زدہ لوگوں کی ایک بیماری اور پکڑی کہ وہ اطاعت رسولؐ میں اس لئے کوتاہ ہو رہے تھے کہ رسول پر پورا پورا اعتماد نہ تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ إِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِ اللهِ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِكَ ط یعنی کوئی اچھی صورت پیش آئی تو کہا کہ یہ تو اللہ کا کرم ہے اور کوئی تکلیف پہنچی تو رسول پر الزام رکھ دیا کہ اس کی تدبیر ہی ایسی تھی۔ ہماری رائے پر کام کیا جاتا تو یہ نہ ہوتا۔ ان کو جواب دلوایا گیا کہ "كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللهِ" سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے! بھلائی ہو یا برائی اُس کا وقوع اللہ کی مشیت ہی کے تحت ہوتا ہے۔

لیکن پھر ایک دوسرے پہلو سے اسی حقیقت کی جھلک یوں دکھائی کہ "جو بھی بھلائی تم کو پہنچتی ہے وہ تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، لیکن جو کوئی برائی تم کو ملتی ہے تو وہ تمہارے اپنے نفس کے فساد کا نتیجہ ہوتی ہے۔" اللہ اسے تمہاری طرف پلٹا دیتا ہے۔

اس نظامِ تقدیر کو بیان کرنے سے سارا مقصد یہ تھا کہ "اطاعتِ رسول" کے بغیر اللہ کی اطاعت کے کوئی معنی نہیں۔ مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ۔

اسی طرح آلِ عمران (آیات ۱۴۴ تا ۱۴۸) میں بھی جہاد ہی کے موضوع پر بات کرتے کرتے موت کے مقدر ہونے کو واضح فرمایا ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوۡتَ	اور کسی جان میں یہ تاب نہیں کہ وہ اللہ کے
اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔	حکم کے بغیر مر سکے جو ایک وقت مقرر کے لئے قلمبند کیا گیا ہے۔

آلِ عمران ہی میں جہاد پر بات کرتے ہوئے منافقین کے اس فتنہ کا ذکر ہے کہ وہ اپنے بھائیوں اور دوستوں کے متعلق یہ کہتے پھرتے کہ یہ لوگ اگر ہماری مانتے اور ہماری طرح ذرا پیچھے رہتے تو مارے نہ جاتے۔ اس طرح کی باتیں مسلمانوں میں انتشار پیدا کرتی تھیں، لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں اپنی تقدیر ہی کا راز بیان کیا کہ:۔

قُلۡ لَّوۡ كُنۡتُمۡ فِیۡ بُیُوۡتِكُمۡ	کہدو (اے محمدؐ!) کہ اگر تم اپنے گھروں میں
لَبَرَزَ الَّذِیۡنَ كُتِبَ عَلَیۡهِمُ	بھی رہتے تو وہ لوگ بہر حال اپنی قتل گاہوں
الۡقَتۡلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمۡ	کی طرف نکلتے جن کے لئے قتل مقدر تھا۔

یہ کلمات جہاد سے جی چرانے والوں کے فلسفہ کے جواب میں کہہ کر جہاد کا جذبہ رکھنے والوں کی ہمت بندھائی جا رہی ہے۔ تقدیر کا بیان یہاں بھی معصیت سے روکنے اور طاعت پر ابھارنے کے لئے ہے۔

یہی گروہِ منافقین پھر زد پہ آتا ہے۔ اس گروہ کا حال یہ تھا کہ مسلمانوں پر مصیبت

پڑنے تو خوش، اور ان کو کامیابی ہو تو مغموم! جنگ احد میں جب مسلمانوں کو زک پہنچی تو یہ لوگ بغلیں بجاتے پھرتے تھے کہ دیکھو، ہم عقل مند تھے، میدانِ جنگ میں نہ گئے، اور تم بیوقوف تھے، موت کے منہ میں چلے گئے۔ مسلمانوں میں ان کی ان باتوں کا جو ردِ عمل پیدا ہوسکتا تھا اس کو صحیح رُخ پر ڈالنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی صلعم سے یہ جوابی کلمہ کہلوایا کہ:

لَّن يُصِيبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَنَآ هُوَ مَوْلَىٰنَا ۚ وَعَلَى ٱللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ ٱلْمُؤْمِنُونَ ۝

ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا بجز اس کے کہ اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہو۔ وہ ہمارا کارساز ہے اور چاہیئے کہ اہلِ ایمان اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

اس جواب میں طمانیت، مضبوطی، استقامت اور توکل کی کیسی زوردار روح کام کر رہی ہے۔ لیکن کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس سے اُلٹا اپنے لئے بے اطمینانی، تذبذب، ڈھل مل یقینی اور مایوسی اخذ کریں۔

پھر کچھ اور کمزوریاں ہیں جو میدانِ جہاد میں اثر دکھاتی ہیں۔ ان کی طرف "منکم من یرید الدنیا" کہہ کر اشارہ کیا اور میدانِ احد میں اس کمزوری کا مزہ چکھایا۔ پھر اس واقعہ کا ذکر یوں کیا کہ:

اذ تصعدون ولا تلوٗن علیٰ احدٍ والرسول یدعوکم فی اُخریٰکم فاثابکم غمًّا بغمٍّ لکیلا تحزنوا علیٰ ما فاتکم ولا

ذرا یاد کرو وہ موقع جب تم (آگے ہی آگے) چڑھے جارہے تھے اور کسی کو پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے، حالانکہ رسول تم کو پیچھے سے پکار رہا تھا، چنانچہ (رسول کو) دُکھ دینے کے بدلے

ما اصابکم — میں تم کو بھی دُکھ پہنچا ——— (یہ توضیح اس لئے ہے کہ) نہ تو اُس پر جو ہاتھ سے جانے اور نہ اُس پر جو پیش آئے کوئی ملال کرو!

یعنی اللہ کی اطاعت کرنے والے کو تو نہ مالِ غنیمت کے ہاتھ سے جانے کی پروا ہونی چاہیئے اور نہ موت کی نہ زخم لگنے کی، لیکن تم میں چونکہ دنیا پرستی کام کر رہی تھی اس لئے تم تھوڑی دیر کے لئے ابتلا میں آ گئے۔

اسی سلسلے میں یہ بتایا کہ خدا کی نافرمانی اور رسول کی ناراضی کے ساتھ الٹی سیدھی تدبیروں سے جنگ آزمائی کرنا کس کام کا، اور اپنی کثرت پر اترانا چہ معنی، جبکہ فتح کا فیصلہ دراصل اللہ کی تقدیر سے ہوتا ہے۔ فرمایا:-

ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم، وان یخذلکم فمن ذالذی ینصرکم من بعدہٖ؛ وعلی اللہ فلیتوکل المومنون۔	اللہ اگر تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تم کو بے یار و مددگار چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد وہ کون ہے جو تمہاری مدد کرے۔ اور چاہئے کہ ایمان والے اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

آلِ عمران ہی کی بڑی مشہور آیت (۲۶-۲۷) جو جبریت کا خزانہ نکات بن کے رہ گئی ہے، وہ بھی دراصل جہاد اور معرکہ ہائے کفر و دین ہی کے لئے مومنین کے جذبات کی آبیاری کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ	کہو کہ اے ہمارے اللہ! تو ہی سلطنت کا والی ہے، تو اپنے دستِ خیر و برکت سے جسے چاہے مُلک کی باگ ڈور سونپ دے

مَنْ تَشَآءُ ؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝

اور جس سے چاہے ملک کی باگ ڈور سلب کرے، جسے چاہے غلبہ دے اور جسے چاہے ذلیل کردے، تیرے ہاتھ ہی سب بھلائی ہے بلاشبہ تو ہر بات پہ قدرت رکھتا ہے۔ تو رات کو دن میں پروتا ہے دن کو رات میں پروتا ہے اور زندہ کو مردہ میں سے برآمد کرتا ہے اور مردہ کو زندہ میں سے، اور تو جسے چاہے بے حساب روزی عطا کرتا ہے۔

اس آیت میں اہلِ ایمان کو جس حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تمہارے دشمن اور حق کے مخالفین چاہے کتنے ہی دبدبے اور طنطنے دکھائیں، کتنی ہی قہاریوں کا مظاہرہ کریں، کیسے ہی جبار بنیں، قوت اور سازوسامان پر کبر دکھائیں، اس دنیا کے نظم پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اصل اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور وہ جب ایک نئی اُبھرتی ہوئی اور بظاہر کمزور سی قوت کو اقتدار دینا چاہے تو اُس کا راستہ کوئی روک نہیں سکتا اور وہ جس بڑی سے بڑی قوت سے تسلط کا منصب واپس لینے کا فیصلہ کرلے، پھر اس کا کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ وہ غلبہ رکھنے والوں کو مسندِ نخوت سے نیچے پٹخ دے یا ان کے پیروں میں روندے جانے والوں کو اٹھا کر عزت کے تخت پر بٹھا دے، کسی کا دانت پیسنا حائل نہیں ہو سکتا۔ وہ مایوسی اور شیبت کی تاریکیوں میں سے امیدوں اور کامرانیوں کی صبح کو ابھار کے لاتا ہے اور کفر و شرک کی شبِ تیرہ کے شکم سے ایمان و اسلام کا سورج برآمد کرتا ہے۔ اور پھر وہی ہے جو متکبرین کے کبر اور مترفین کی عیاشیوں اور ظالمین کے ظلم و ستم

کے دن کو نامرادی کی رات میں بدل دیتا ہے۔ وہ عالم جسمانی میں بھی اور روحانی ور اخلاقی دنیا میں بھی مردوں کے اندر سے زندگی کا طوفان اٹھا دے تو، اور اگر ایسے ں وہ زندوں کو مردوں میں بدل دے تو، کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔ اور پھر وہی ہے کہ کسی سے مادی و روحانی رزق سلب کرے اور کسی پر اپنے رزق کے دروازے ھول دے تو آڑے آنے والا کوئی نہیں۔

یہ آیت اپنے مفہوم کے لحاظ سے قطعی طور پر آیتِ انقلاب ہے، یہ مشیت کے نظامِ تغیر کو واضح کرتی ہے اور وہی بات کہتی ہے جسے حضرت عیسٰی نے کہا کہ کتنے ہی گے ہیں کہ جو پیچھے ہو جائیں گے اور کتنے ہی پیچھے ہیں کہ جو آگے آجائیں گے۔ مگر ساتھ کے ساتھ یہ آیت اس غلط فہمی کو بھی دور کرتی ہے کہ تغیرات کا تقدیری نظام کوئی غیر حکیمانہ نظام نہیں ہے کہ تقدیر اندھے کی لاٹھی کی طرح حرکت کرے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دستِ تیسیر کے ذریعے ہو رہا ہے اور ہر تغیر کے پیچھے حکمت و مصلحت موجود ہے اور ہر الٹ پھیر کے لئے قوانین ہیں۔ اس آیت میں بِيَدِكَ الْخَيْرُ کے الفاظ ہی اصل سرچشمۂ تسلی ہیں کہ خدا تعالیٰ جب سارے تغیرات خیر کے لئے کر رہا ہے تو پھر وہ لوگ جو ایک نظامِ خیر و فلاح کے لئے معرضِ کشمکش میں ہوں ان کو مطمئن ہونا چاہئے کہ تبدیلی آئے گی تو ان کے ہی حق میں آئے گی۔

اس آیتِ انقلاب کا اصل منشا کشمکش اور جہاد کے مراحل میں مومنین کو ثبات عطا کرنا تھا۔ لیکن دنیا نے اسے بھی جبریت کے سرد خانے COLD STORAGE میں رکھ کر ٹھنڈا کر دیا ہے۔

اس آیت سے کچھ اوپر یہی حقیقت ایک اور انداز میں واضح کی گئی ہے: یہ

نصیحت کرتے ہوئے کہ اگر تم پر ذرا کچھ آنچ آگئی ہے تو اس کی وجہ سے نہ تو ڈھیلے پڑو اور نہ ملول ہو کے پڑ رہو، جہاں تم کو گزند پہنچا ہے وہاں دوسروں کو بھی پہنچنے گزند پہنچ چکا ہے، فوراً نظام تقدیر کا ایک گوشہ بے نقاب کر دیا کہ :-

وتلک الایام نداولہا بین الناس - اور ان (برے اور بھلے) ایام کو ہم اسی طرح لوگوں کے درمیان گردش دیتے ہیں -

مطلب یہ کہ نفع و نقصان، کامیابی و ناکامی، مایوسی و امید، فتح و شکست کے حوادث کا تو ایک چکر ہے جسے قدرتِ الٰہی برابر گھما رہی ہے کہ کبھی تاریک رُخ سامنے آجاتا ہے اور کبھی روشن رُخ، کبھی دن ہے کبھی رات، کبھی اپنی بن آتی ہے کبھی مخالف کی، اور جن کو اپنا راستہ بنانا ہوتا ہے وہ حوادث کے اسی الٹ پھیر کے درمیان سے بنا لے جاتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی یہ توضیح بھی کر دی گئی ہے کہ گردشِ تقدیر کا ایک اصول یہ ہے کہ کفار کے مقابلے میں غلبہ اہلِ ایمان ہی کو ملتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں اہل ایمان ہوں۔ مسلمانوں میں یقین و طمانیت پیدا کرنے کے لئے اس سے زیادہ واضح اور کونسے الفاظ ہوں گے۔

پھر یہ بھی کہہ دیا کہ اسی گردشِ ایام کی کٹھالی میں پڑ کر تو وہ ایمان والے نکھر سکتے ہیں کہ جن کو اللہ منصبِ شہادت کے لئے منتخب فرماتا ہے۔ اس اشارے میں خود یہ دعوت شامل ہے کہ منصبِ شہادت کے قابل بنو اور آزمائش آئے تو کھرے بن کر نکلو۔

یہ آیت جدوجہد میں زیادہ مضبوطی کی دعوت دے رہی ہے، مگر یہی آیات ہیں کہ جن کا موقع و محل نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ ان کو جمود و ملال ہی پیدا کرنے کے لئے

استعمال کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں قصۂ طالوت کے اندر ایک حقیقتِ تقدیر یہ بھی واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نظامِ مشیت نہ بناتا جس میں بگڑ جانے والوں کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے دوسرے بہتر لوگ اٹھائے جاتے رہیں تو ساری زمین اخلاقی فساد سے بھر جاتی۔ یہاں پھر اشارا اخذ ہوتا ہے کہ دشمنانِ حق کا جو تسلط آج تم دیکھتے ہو اسے تہ و بالا کرنے ہی کے لئے تو نظامِ تقدیر کے تحت تم میدان میں آرہے ہو۔ پھر جھجک کیسی! ہمت سے کام لو اور ٹکرا جاؤ!

تحریکِ انفاق کے لئے بیانِ تقدیر

انفاق بھی طاعتِ الٰہی کا ایک بڑا شعبہ ہے۔ چنانچہ رزق کا نظامِ تقدیر بالعموم ان مواقع پر واضح کیا گیا ہے جہاں انفاق کی ترغیب دلانا مطلوب تھا۔ مگر کتنی عجب بات ہے کہ رزق کے نظامِ تقدیر کو زر پرست بخیلوں نے انفاق سے گریز کے لئے دلیل بنا لیا ہے! سورۂ یٰسین میں دیکھئے:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔

اور جب ان (کفار) سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے انفاق کرو تو یہ کفر کرنے والے ایمان والوں کو یہ جواب دیتے ہیں کہ کیا ان لوگوں کو ہم کھلائیں جن کو اگر اللہ نے کھلانا چاہا ہوتا تو خود کھلاتا۔ تم لوگ تو نہایت واضح گمراہی میں مبتلا ہو!

دیکھئے طاعت سے بچنے کے لئے کس شاندار طریق سے مسئلہ تقدیر (جبریت)

کو آڑ بنا لیا گیا تھا یعنی ذمہ داریاں اٹھا کے کفار نے خدا کے سر ڈال دیں۔ خدا کا تقدیر رزق کا نظام تو تفاوت کے ساتھ رزق دیتا ہے تاکہ آزمائش کا مقام پیدا ہو اور جہاں کچھ لوگوں کے لئے صبر و کسب لازم آئے وہاں دوسروں کے لئے شکر و انفاق واجب ٹھہرے۔ لیکن جب اُن سے مطالبہ ہوا کہ انفاق کرو تو وہ فرماتے ہیں کہ خدا خود ہی غریبوں کی دست گیری، یتیموں کی کفالت اور مساکین کی چارہ گری کیوں نہیں کرلیتا؟ جب اس نے ان کو غریب و مجبور بنایا ہے تو ہم کیوں بیچ میں مداخلت کریں۔

بات یہیں تک نہ رہی، بلکہ جب اللہ کے نام پر انفاق کا مطالبہ ہوتا تو کفار طنزاً کہتے کہ لو بھائی دیکھنا خدا غریب ہو گیا ہے اور اب ہم ہی غنی رہ گئے ہیں کہ اس کی کچھ مالی مدد کریں۔

لیکن قرآن تقدیر رزق کو بیان کرتا ہی ترغیب انفاق کے لئے ہے مثلاً سورہٴ بقرہ میں جہاں مطالبہ کیا کہ اللہ کو قرض حسنہ دو، یعنی اس کی راہ میں مال خرچ کرو تو ساتھ ہی یہ فرمایا کہ:۔

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ — اور اللہ ہی (روزی کو) تنگ اور فراخ کرنے والا ہے۔

یعنی نفاق میں اس اندیشے سے کوتاہی نہ کرو کہ تمہارے حصّے کا رزق کم ہو جائے گا اور تم بھوکوں مرو گے، نہیں جو اللہ انفاق کا حکم دے رہا ہے، روزی کو تنگ اور فراخ کرنے کے اختیارات بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ پس بخیل نہ بنو!

یہی بات سورہٴ بنی اسرائیل میں کہی۔ جہاں یہ فرمایا کہ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ وہاں ساتھ ہی

یہ بھی واضح کر دیا کہ:۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ۔

یقیناً تیرا آقا اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے روزی کو وسیع یا محدود کرتا ہے۔ بیشک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے۔

یہاں بھی رزق کے نظامِ تقدیری کو اسی لئے بیان کیا کہ نہ اپنے اخراجات میں مسرف بنو، نہ حق کی راہ میں صرف کرتے ہوئے بخیل بنو، بلکہ اعتدال سے چلو کہ اپنی ضرورتیں بھی پوری ہوں اور دین کی تحریک بھی چلے۔ اور انفاق کرتے ہوئے یہ یقین رکھو کہ رزق دینے والا مالک تمہاری ضروریات سے باخبر اور تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے اور رزق کی فراخی و تنگی کرنے کے سارے مینج اس کے ہاتھ میں ہیں۔ "اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا" میں بالکل نمایاں طور پر شفقت اور کارسازی اور کفالت کی یقین دہانی موجود ہے۔

قتلِ اولاد کی ممانعت اور تقدیرِ رزق

سورۂ بنی اسرائیل میں اور دوسری جگہ بھی اہلِ عرب کو قتلِ اولاد سے روکا گیا ہے عرب میں اولاد (خصوصاً بیٹیوں) کو جن وجوہ سے قتل کیا جاتا تھا ان میں سے ایک بڑی وجہ مفلسی کا ڈر بھی تھا۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ کنبے کے افراد اگر بڑھ گئے (اور لڑکیاں بیچاری کماؤ تو ہوتی ہی نہیں) تو تنگ حالی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے بچوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اس سے روکا اور اس کی اصل وجہ پر بھی گرفت کی۔

وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ

اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے

خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ؛ قتل نہ کرو ہم ان کو رزق دینے والے ہیں اور خود تم کو بھی!

یہاں دیکھئے کہ ایک شدید گھناؤنی معصیت سے روکنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اطمینان دلایا ہے کہ رزق پہنچانا ہمارا کام ہے اور خوش حالی اور غریبی مقدر کرنے کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں ہیں کنبے کے افراد بڑھ جانے سے ضروری نہیں کہ خوش حالی کا خاتمہ ہو جائے اور ان کی افزائش کو روک دینے سے ضروری نہیں کہ افلاس سے بچا جا سکے۔ لہذا اس معصیت سے باز آجاؤ اور اپنی الٹی سیدھی تدبیروں سے اپنی تقدیر بنانے کی کوشش نہ کرو۔

اسی اصول پر لونڈیوں سے عزل کرنے کے بارے میں نبی صلعم نے ممانعت فرمائی اور وہاں بھی نظام تقدیر ہی کو طاعت پر آمادہ کرنے کا ذریعہ بنایا۔ فرمایا کہ تم کچھ بھی کرو جس جان کا پیدا ہونا مقدر ہے اسے کوئی تدبیر پیدا ہونے سے روک نہیں سکتی!

ہدایت و ضلالت اور تقدیر ہدایت و ضلالت بھی تقدیر کی بحثوں کا ایک بڑا موضوع رہا ہے۔ اس موضوع کو سب سے پہلے شیطان نے چھیڑا تھا۔ وہ حکم سجدہ کی تعمیل سے دیدہ و دانستہ خود انکار کرتا ہے لیکن اپنی ذمہ داری کو سر سے اتار کر خدا تعالیٰ پر ڈالنے کے لئے کہتا ہے کہ "رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ" اس کا مدعا یہ تھا کہ میں تو طاعت ہی کرنا چاہتا تھا لیکن تیری مشیت نے ایسے حالات میرے لئے پیدا کر دیئے کہ میں بغاوت پر بالکل مجبور ہو گیا۔ سرکشی میں نے کی نہیں۔ مجھ سے کرائی گئی ہے۔ کفر مجھے پسند نہ تھا، مجھ پر ٹھونسا گیا ہے۔ اپنے ان الفاظ کی روشنی میں شیطان فلسفۂ جبریت محضہ کا سب سے پہلا بانی ہے۔ مجبرین اور ضالین کی یہ خوشنما پناہ گاہ۔

اسی کی بنائی ہوئی ہے۔

اسی شیطان کے شاگرد وہ بھی تھے جنہوں نے نبی صلعم کی دعوت ایمان و طاعت کے جواب میں یہ کہا تھا کہ:-

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ط

اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرتے اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو اپنے لئے حرام ٹھیراتے!

یعنی ہمارا شرک اور خدا کے مقابلے میں ہماری شریعت سازیاں کچھ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ ہم خود سوچ سمجھ کر اس چکر میں پڑے ہیں، بلکہ خدا نے خود ہم سے یہی چاہا ہے اور ہم کٹھ پتلیوں کی طرح یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ بخلاف اس کے اگر وہ چاہتا کہ ہم یہ کچھ نہ کریں تو وہ ہمیں باز رکھ سکتا تھا۔ ہم بتوں کے سامنے سر جھکانا چاہتے اور وہ ہماری گردنیں پکڑ لیتا، ہم کسی حلال شے کو حرام کہنے کا ارادہ کرتے اور وہ ہماری زبان کو باندھ دیتا۔ بھلا اس کی عظیم الشان طاقت کے مقابلے میں ہماری کیا بساط تھی کہ ہم اس کی مرضی کے خلاف کسی اور طرف قدم بڑھا سکتے۔

ان کلمات کے ذریعے ان لوگوں نے اپنے علم و اختیار کی، اپنے منصب خلافت کی، اپنی انسانیت کی، اپنے ارادہ و انتخاب کی، اپنی قوت تمیز کی کلی نفی کر دی اور سرے سے ذمہ داری کی کوئی بنیاد ہی گویا نہ چھوڑی کہ اس بنیاد پر ان کو دعوت دین دی جا سکے۔

بھلا ان سے کوئی پوچھتا کہ اگر تم کسی جنگل میں بھٹک جاؤ تو کیا وہاں بھی اسی پوزیشن

کو اختیار کرو گے کہ نہ کسی سے راستہ پوچھو، نہ غلط راستے کو چھوڑ کر دوسری طرف مڑو، بلکہ اگر کوئی بطورِ احسان تم کو بتائے بھی کہ یہ راستہ تو چیتوں کے بھٹ کی طرف جاتا ہے، شہر کو جانے والا راستہ اُدھر سے ہو کے گیا ہے تو تم اسے یہ جواب دو کہ اگر اللہ چاہتا کہ ہم اُس راستے پر چلیں تو وہ ہمیں خود ہی چلا دیتا، اب تو اُس نے ادھر ہی چلا دیا ہے لہٰذا اِدھر ہی چلیں گے، چاہے آگے چیتوں کے بھٹ ہوں یا آگ کے گڑھے؟

مگر نہیں، تقدیر کا یہ جاہلانہ تصور روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنے کے لئے تھوڑی ہے۔ یہ تو صرف ایمان و اخلاق اور قلب و روح کی دنیا میں کام دیتا ہے۔

ایک اور جگہ تقدیر کے اسی استعمال کا تذکرہ یوں ہوا ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۝

اب یہ شرک کرنے والے دعوت الی اللہ کے جواب میں یہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا نہ شرک کرتے اور نہ (مشرکانہ عقاید کے تحت کسی چیز کو حرام ٹھہراتے) ان سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں انہوں نے بھی ایسی ہی باتوں سے دعوتِ حق کو جھٹلایا، یہاں تک کہ ہماری گرفت کا مزہ چکھ کے رہے۔

پوچھئے ان سے کہ کیا تمہارے پاس (اس معاملے میں) واقعی کوئی علم ہے، اگر ہے تو لاؤ ہمارے سامنے۔ تم جن خیالات کے پیچھے چل رہے ہو وہ محض گمان ہیں اور تم محض تیر تکے چلاتے ہو!

تقدیر کا یہ تصور جو ضلالت پر جمے رہنے کی دلیل بن جائے اور جو ہدایت کی طلب

مائل ہونے میں رکاوٹ بنے قرآن اسے ظن و گمان قرار دیتا ہے اور اس طرح کے خیالات کو کہ خدا لوگوں کو جبراً معصیت و ضلالت پر چلاتا ہے اور جسے ہدایت پر لانا ہو اسے زنجیروں میں جکڑ کر زبردستی کھینچ لاتا ہے، خدا کی کتاب میں "تیر تُکّے لڑانے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ سب فضول قیاسات اور لغو فلسفہ طرازیاں ہیں۔ تقدیر کا یہ تصور قرآن کا نہیں، مشرکین کا ہے، خدا کا دیا ہوا نہیں، شیطان کا ایجاد کردہ ہے۔

دراصل دشمنانِ حق جب یہ سنتے تھے کہ ہدایت دینے والا اللہ ہے تو وہ پوری بات نہ سمجھنے کی وجہ سے طنزاً اس طرح کے نکتے نکال کر دعوتِ حق کی مدافعت کرتے تھے۔ ان کا کہنا اصل میں یہ تھا کہ ایک طرف تو تم لوگ کہتے ہو کہ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ، تو پھر تم ہمیں کس بنیاد پر یہ الزام دیتے ہو کہ ہم ضلالت میں خود پڑے ہیں اور کس بنیاد پر ہمیں بلاتے ہو کہ ہدایت قبول کریں؟ ہدایت وضلالت جب خدا کے اختیار میں ہیں تو ہماری کیا ذمہ داری!

مگر مخالف کم بخت کی نگاہ ہمیشہ حقیقت کے پورے منظر کو دیکھنے سے کتراتی ہے اور ادھورا لے اڑتی ہے، پھر ساری بحثیں اور سارے نتیجے اسی ادھورے منظر پر کھڑے کیے جاتے ہیں۔

لوگوں نے یہ تو سُن لیا کہ خدا ہدایت و ضلالت دیتا ہے، لیکن ان کے کان یہ نہ سن سکے کہ وہ کیا کرنے والوں کو ہدایت دیتا ہے اور کیا کرنے والوں کو ضلالت دیتا ہے۔ اُن تک یہ بات تو پہنچ گئی کہ اللہ کے کرنے کے کام کیا ہیں لیکن یہ نہ پہنچی کہ بندوں کی ذمہ داریاں کہاں تک ہیں۔

قرآن نے خدا کے ہادی و مضل ہونے کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ جا بجا یہ بھی بتایا ہے کہ ہدایت و ضلالت کے دروازے کن لوگوں پر کھلتے ہیں، کن کنجیوں سے کھلتے ہیں اور کونسے افکار و اعمال کے ساتھ ان دروازوں میں کسی کا داخلہ ممکن ہوتا ہے، اور دونوں طرف کیا کیا قوانین کارفرما ہیں۔ ہدایت و ضلالت کی تقدیر میں انسان کا اپنا جو کچھ حصہ ہو سکتا ہے وہ خوب اچھی طرح کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔

ہدایت و ضلالت کی تقدیر قرآن میں تمام تر اسی لئے بیان ہوئی ہے کہ لوگ ضلالت سے بچنے اور ہدایت قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ایک طرف قرآن یہ بتاتا ہے کہ فلاں فلاں آلائشیں دل سے پاک کر دو گے تو اس کے دریچوں سے اللہ کے نور کی شعاعیں داخل ہوں گی اور فلاں فلاں حرکتیں کرو گے تو یہ دل کے دریچوں کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کا موجب ہوں گی۔ ہدایت کا ایک راز یہ ہے کہ مانگو گے تو ملے گا، کھٹکھٹاؤ گے تو دروازے کھلیں گے، اپنے حواس کی کھڑکیاں کھلی رکھو گے تو روشنی اور تازہ ہوا اندر آنے گی، تعصب کے پردے اٹھاؤ گے تو حقیقتیں تمہارے گھر میں داخل ہوں گی، تم خود آگے بڑھو گے تو تمہارا استقبال کیا جائے گا، اپنی آنکھیں کھولو گے تو دیکھو گے اور اپنے کان لگاؤ گے تو سنو گے۔

قانون ہدایت یہ ہے کہ:-

يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝	اللہ اپنے نور اور کتاب کے ذریعے ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی رضا کے پیرو کار ہوں اور سلامتی کے راستوں پر چلیں، اور پھر وہ ان کو اپنے قانون کے تحت مختلف

تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور
صراطِ مستقیم کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے۔

یعنی ہدایت اس کے لئے ہے جو خدا کی رضا کو پیشِ نظر رکھے اور زندگی کے تمام معاملات میں سلامتی کے راستوں کا جویا ہو۔ یہاں تقدیرِ ہدایت بیان کرنے کا اصل مقصود یہی ہے کہ طالبینِ ہدایت کو رضاءِ الٰہی کے اتباع اور سُبُل السلام پر چلنے کا جذبہ نصیب ہو۔ نہ کہ وہ آنکھیں بند کرکے چل نکلیں کہ اللہ خود ہی جدھر چاہے گا لے جائے گا۔

پھر فرمایا:-

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔

اور وہ لوگ کہ جنہوں نے ہمارے لئے جدوجہد کی انہیں ہم زندگی کے ہر میدان میں اپنے راستے بہرحال دکھائیں گے۔

یہ ہے اللہ کا قانون تقدیرِ ہدایت و ضلالت کے بارے میں۔ اس کے بیان کا مدعا یہی ہے کہ لوگ ہدایتِ الٰہی کی طلب میں اس کے راستے میں جدوجہد کی اسپرٹ لے کر اٹھ کھڑے ہوں، اور پھر اللہ پر بھروسہ کریں کہ وہ ان کی راہنمائی کرے گا۔

فلسفۂ تقدیر کا الٹا استعمال

اوپر کی چند مثالوں کو سامنے رکھ کر اگر آپ سوچیں تو پھر یہ حقیقت بہت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ قرآن کا فلسفۂ تقدیر ایمان و عمل اور جدوجہد کا فلسفہ ہے۔ لیکن جو لوگ اسے جمود، معصیت، خواہش پرستی اور بے دینی کے جواز کی دلیل بناتے ہیں دراصل ان کا فلسفۂ تقدیر ہے ہی بالکل دوسرا۔ ان کا نظریہ تقدیر قرآن کے بالکل برعکس ہے ؎

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن، فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

پاکستان اور اخلاقی قوت کی تعمیر

(۱)

تمہید

قرآن نے حیاتِ اجتماعی کے عروج و زوال کا جو فلسفہ ہمیں سکھایا ہے وہ مادہ پرستانہ نظریوں کے خلاف ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ایک قوم کی سرگرمی، جدوجہد، ترقی اور نشوونما ساری کی ساری اصلاً اس کی اخلاقی صحت پر منحصر ہے۔ جب یہ اخلاقی صحت برباد ہو جاتی ہے تو جمود اور زوال کا دور آتا ہے، اور اخلاقی پستی جب انتہا کو پہنچتی ہے تو ایک قوم بالکل ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔ ایک اصولِ حق کی شعوری محبت، ایک پاکیزہ نصب العین کی لگن، احساسِ ذمہ داری، نظم و ضبط، دیانت و راست بازی، مساوات و اخوت، توازن و عدل، وحدت و تعاون وغیرہ کی بیش قیمت اخلاقی قدریں کسی انسانی گروہ میں جتنی زیادہ فروغ پاتی ہیں اس کی سرگرمی

جدوجہد، اس کی رفتارِ پیدائش دولت، اس کی دفاعی قوت کی ترقی اتنی ہی روز افزوں ہوتی ہے، اور دوسری طرف یہ قدریں جتنی کمزور اور مضمحل ہوتی ہیں معاشی اور دفاعی قوت بھی اتنی ہی کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ علم، تہذیب، معاش، دفاع اور بین الاقوامی اثر۔ پانچوں شعبوں میں حیاتِ اجتماعی کی پیش قدمی کا پورا انحصار اخلاقی قدروں کی مضبوطی پر ہے۔ جس قوم کے اخلاق کو گھن لگ رہا ہو اسے چاہے کتنے اچھے دماغ اور عبقری فراہم کر دیجئے، اس کے خزانوں میں چاہے کتنا ہی سونا چاندی بھر دیجئے، اس کے لئے کیسے ہی شاندار میزانیے بنائیے اور منصوبے بندیاں کیجئے۔ اس کے لئے کیسے ہی اعلیٰ درجے کے مشینی اسلحہ خرید لائیے، وہ کبھی بھی زندگی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک اخلاق باختہ قوم کا حال بالکل ایک بخار زدہ مریض کا سا ہوتا ہے کہ آپ اسے زرق برق لباس پہنا کر، اس کے بدن پر چمکیلے ہتھیار سجا کر اور اس کی قوت و عظمت کا پروپیگنڈا کر کے اس کو کسی طرح ایک صحت ور شخص کے برابر نہیں کر سکتے۔ اخلاقی انحطاط اگر اپنا کام کر رہا ہو تو قومی زندگی کے ظاہری پہلو چاہے کتنے ہی شاندار بنا دیے جائیں حقیقی قوت کبھی ہاتھ نہیں آسکتی۔

ہم ایک ایسی قوم ہیں جو ایک طویل دورِ زوال اور پھر ایک روح فرسا زمانۂ غلامی سے گزر کر اپنے موجودہ مقام تک پہنچی ہے۔ تباہیوں اور خستہ حالیوں کی پیچ در پیچ منازل سے گزرتے ہوئے اس قوم نے اپنے اصول، اپنے مقاصد اور اپنی اخلاقی قدریں ضائع کر دی ہیں۔ یہ اپنے موقف سے اکھڑ چکی ہے، اس کا شیرازہ جس ڈور سے باندھا گیا تھا وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ چکی ہے، اور اس کے

قلعہ کی اینٹوں کی درزوں میں سے جوڑ لگانے والا مسالہ نکل چکا ہے۔

ہم جس اخلاقی زوال سے دوچار ہیں اسے اپنی اور دوسروں کی نگاہوں سے چھپانے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں ہم نے اختیار کر رکھی ہیں۔ ہم مریض ہیں، لیکن اپنے مرض کا علاج کرنے کے بجائے ہم نے مرض کے اخفا کے مختلف طریقے ایجاد کر لئے ہیں۔ ہم اپنے اخلاقی زخموں پر ریشمی پردے ڈالے ہوئے ہیں، ہم نے اپنی سیرت کے برص کے داغوں کو برسوں سے ڈھانک رکھا ہے؛ ہم نے اپنے کیرکٹر کے رستے ہوئے ناسوروں پر نمائش کی پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔ ہم اپنی آہوں کو تبسم میں بدل لینے کے فن میں پختہ ہو چکے ہیں۔ ہم اپنی کراہوں کو نعرہ ہائے تکبیر میں بدلنے کا آرٹ خوب اچھی طرح سیکھ چکے ہیں۔ ہمیں اگر کسی طرف سے اپنے مہلک امراض کا احساس ہونے لگتا ہے تو ایسے موقعوں پر ہم خوش خیالیوں کی افیون گھول کر پی لیتے ہیں اور پھر دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر سمجھتے ہیں کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مگر اگر ہم زندہ رہنے کا تہیہ رکھتے ہوں تو اپنی اخلاقی زندگی کا طبی معائنہ کئے بغیر چارہ نہیں۔ اپنے مرض کی صحیح تشخیص ہی صحیح علاج کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

(۲)

پاکستان کا معاشرتی چہرہ

کسی قوم کی اخلاقی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس کی معیشت اور معاشرت کے اہم مسائل اور رسوم پر گہری نظر ڈالی جائے۔ لیکن یہ ایک پیچیدہ اور باریک کام ہے۔ اس کے مقابلہ میں اخلاق کی پیمائش کے لئے ایک

دوسرا طریقہ زیادہ سہل ہے اور وہ یہ ہے کہ سڑکوں، گلیوں، ریلوں اور بسوں میں کسی قوم کی چلتی پھرتی زندگی کی چند جھلکیاں بغور دیکھ لی جائیں۔ اس طائرانہ مطالعہ سے بھی کسی سوسائٹی کی اخلاقی قوت معلوم کی جا سکتی ہے۔

جیسے مرض کی تشخیص کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ طبیب کسی مریض کے خون، پیشاب وغیرہ کا امتحان لیتا ہے، اس کی نبض دیکھتا ہے، اس کی غذا اور اس کے ماحول کا جائزہ لیتا ہے، اس کی چھاتی کو آلۂ صدر بین کے ذریعے دیکھتا ہے اور متعدد سوالات کرنے کے بعد اس کی بیماری کو متعین کرتا ہے۔ اور اس طرز تشخیص کی ضرورت بالعموم اس وقت پڑتی ہے جب علامات نمایاں نہ ہوں لیکن جب علامات مرض بالکل نمایاں ہوں تو طبیب یوں کرتا ہے کہ مریض سامنے آیا اور بس اس کی چال ڈھال، اس کے چہرے کی رنگت، اس کی آنکھوں کا اندازہ، اس کے رخساروں کی ہیئت اس کے تنفس کی رفتار کو دیکھتے ہی کہہ دیتا ہے کہ یہ فلاں مرض کا مریض ہے۔ سوسائٹی کی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے بھی ایک تو اس کے مختلف احوال و کوائف کا گہرا مطالعہ کرنے کا طریق ہے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے چہرے کی ترجمانی سے قیاس کیا جائے اس اصول پر ہم اپنی سوسائٹی کا چہرہ آپ کے سامنے رکھتے ہیں۔

آپ چلتے پھرتے یہ دیکھتے ہیں کہ آپ کی قوم کے لوگ بے ضرورت آوارگی کے عادی ہیں، بلکہ بلاوجہ شور مچانا انہیں پسند ہے، گندی زبان یہ استعمال کرتے ہیں، جذبات پر انہیں قابو نہیں رہتا۔ اور ایک مستقل فکری انتشار ان پر مسلط ہے۔ یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ قوم "مقصودیت" سے محروم ہے، اس کے دماغ میں پراگندگی ہے، اور اس کے افراد میں نہ احساس شرافت ہے، نہ احساس ذمہ داری ہے۔

پھر ذرا ایک اور پہلو کو ملاحظہ فرمائیے۔ ہماری قوم کے گھروں میں کوڑا پڑا رہتا ہے، ڈیوڑھیوں میں بچے پاخانہ پھرتے رہتے ہیں، نالیوں میں رکے ہوئے پانیوں میں کیڑے کلبلاتے رہتے ہیں اور گلیوں میں غلاظت کے ڈھیروں سے تعفن کے بھپکے فضا میں پھیلتے رہتے ہیں۔ لیکن بدرروں اور گلیوں کا کیا سوال۔ یہاں تو آپ دیکھیں گے کہ سبزیں اور پھلوں کے بیوپاری خوردنی کوڑا بیچتے ہیں اور لوگ خریدتے ہیں۔ کبھی غور سے خوانچہ فروشوں کے مال تجارت کو دیکھئے تو بہت سے ایسے مناظر آپ دیکھیں گے کہ پالک، گوبھی، شلغم سڑ چکے ہیں، لیکن بک رہے ہیں، انگور کے دانوں سے "میٹھی پیپ" بہ رہی ہے لیکن اسے خریدا جارہا ہے۔

پھر اپنے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کی زیارت فرمائیے اور ظاہر کے پیچھے جو باطن چھپا ہے اس کو چھوڑ کر صرف ظاہر ہی کو دیکھئے تو مزہ آجائے گا۔ دہی کے کونڈوں پر مکھیاں بھنبھناتی دیکھئے، میزوں پر سالن اور چائے کے داغ دھبے دیکھئے، کونوں اور گوشوں میں ہڈیوں کے "آثار قدیمہ" دیکھئے، دروازے کے سامنے غلیظ دلدل دیکھئے، ہوٹل کے مینیجر اور خدام کے گندے لباس اور ان کی ناہموار صورتیں دیکھئے، صورتیں ہی نہ دیکھئے، ان کی وحشت ناک آوازیں بھی سنئے۔ دیواروں پر ناپاک تصاویر ملاحظہ کیجئے، اور تصاویر پر غبار اور مکڑی کے جالوں کے ذخائر کو تسکین نگاہ بنائیے ——— اور یہ دیکھ دیکھ کر مست ہو جائیے کہ قوم آزاد ہو گئی ہے، پاکستان بن گیا، انگریز و ہندو کا خطرہ ٹل گیا۔ بس کام ختم! یہ ہمارے اندر غلاظت کی جو غیر معمولی برداشت پیدا ہو گئی ہے اور ایک عام بد مذاقی ترقی کر گئی ہے یہ گواہ ہے اس پر کہ ہماری قوم کا ذہن ناپاک اور متعفن ہے اور ہمارے افراد کے فکر و احساس میں سڑاند پیدا ہو چکی ہے۔

پھر بازار میں خرید و فروخت ہوتی دیکھئے اور دوکاندار اور گاہک میں جس طرح معاملہ ہوتا ہے اس پر تنقیدی نظر ڈالئے۔ دکاندار چیز کی قیمت دوگنی بتائے گا، گاہک چوتھائی دینا چاہے گا۔ اور ہوتے ہوتے، کچھ یہ اوپر ہوگا، کچھ وہ نیچے ہوگا اور معاملہ طے ہو جائے گا۔ لیکن چار پیسے کی چیز پر دونوں چار آنے کا وقت صرف کریں گے، چھ آنے کی قوت گویائی استعمال کریں گے، دس آنے کی گرماگرمی دکھائیں گے ——— تب کہیں سودا مکمل ہوگا۔ دکاندار تو خیر پھر شرافت دکھاتا ہے۔ خدا آپ کو تانگے والوں سے بچائے، آپ اگر کسی کے پالے پڑ جائیں تو وہ نفسیاتی مہارت سے یہ اندازہ لگائے گا کہ آپ شہر کے ہیں یا اجنبی! ——— پہلی صورت ہو تو وہ یا تو مقررہ شرح پر کرایہ طلب کرے گا یا پھر ایک دو آنے زیادہ کہہ دے گا۔ لیکن اگر بدقسمتی سے آپ اس کی نگاہ میں اجنبی ٹھہرے۔ تو پھر دگنا تگنا کرایہ طلب کر لینا معمولی بات ہے۔ ہمارے معاملات کا یہ انداز اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ یہاں دیانت امانت اور خدمت کا جذبہ مر چکا ہے، اور ان فضائل کی جگہ غرض پرستی رچ، بس گئی ہے۔

پھر آپ کسی ڈپو پر تشریف لے جائیے، کسی اسٹیشن کے ٹکٹ گھر پہنچئے، کسی بس پر سوار ہونے کے لئے بڑھیے، تو آپ کو ایک ایسی دھکم دھکا کے طوفان میں ہاتھ پاؤں مارنے ہوں گے کہ آپ کی ہڈیاں فریاد کرنے لگیں گی۔ کیونکہ آپ کی قوم کو ایسے مواقع پر قطار بنانا نہیں آتا ——— اس دھکم دھکا میں وقت بھی زیادہ صرف ہوتا ہے، تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ اور مدعا بھی لیسا اوقات حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن نظم کسی طرح گوارا ہی نہیں ہے۔ کسی کو دوسرے کے حقوق کا شعور

نہیں، کوئی اپنے بھائی کے لئے رعایت کرنے پر آمادہ نہیں، مسجد میں وضو کے لئے لوٹا لینا ہو یا بس اور ریل میں سیٹ حاصل کرنی ہو، تو کوئی شریف آدمی اگر تمیز اختیار کرے تو وہ تمیز کو لئے کھڑا رہے، بے تمیزی آگے بڑھ کے اس کا حق مار لے گی، اور اس قسم کے چند تجربات اس شریف آدمی کو بھی تمیز سے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیں گے۔ کیا یہ باتیں ہماری اس اندرونی کمزوری کا اشتہار نہیں ہیں کہ ہمارے اندر ڈسپلن، حقوق کا شعور، دوسروں کے آرام کا پاس اور اجتماعی مفاد کا لحاظ نام کو بھی باقی نہیں ہے؟

اور کتنی ہی دیکھنے اور سوچنے کی چیزیں ہیں ایک سائیکل سوار کی سائیکل خود اس کی اپنی غلطی سے کسی راہ گیر سے ٹکرا جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ اس سے معافی مانگے الٹا اس پر دھونس جمانے گا۔ ایک بے احتیاط آدمی کی ٹھوکر سے کسی خوانچے والے کا خوانچہ گر جاتا ہے تو وہ شرمسار نہ ہوگا، بلکہ الٹا جسے تکلیف پہنچی ہے۔ اسی کو ملامت بھی کرے گا۔ گویا ہمارے معاشرے میں اپنی غلطی کو محسوس کرنے کی صلاحیت ہی مر گئی ہے۔ اور غلطی پر معافی مانگنے کے لئے جس شجاعت کی ضرورت ہوتی ہے اس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

پھر آپ دیکھتے ہیں کہ خود آپ کی بہنیں اور بیٹیاں سینے تان کے، بال سنوار کے، لباس کو مختصر کر کے پیدل اور سائیکل پر گھومنے نکلتی ہیں، لوگ انہیں تکتے ہیں، اشارے کرتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں اور بے حیائی کی وبا زیادہ سے زیادہ پھیلتی ہے۔ آپ کی برقعہ پوش خواتین جاذب نگاہ برقعے پہنتی ہیں، پھر ان میں کچھ رستے نگاہوں کی مداخلت کے لئے چھوڑتی ہیں، پھر ان رخنوں کی وسعت کو دست ناز

کی جنبش سے کبھی کبھی دانستہ پھیلاتی رہتی ہیں تاکہ دیکھنے والے دیکھنے کی ہر چیز کو دیکھ سکیں۔

چنانچہ ان چیزوں نے مردوں کا مزاج بھی ایسا بنا دیا ہے کہ مخلص پردہ دار خواتین تک کے گرد نگاہیں ہجوم کئے رہتی ہیں کہ کب کسی مجبوری کے تحت ہاتھ یا چہرہ یا پاؤں کھلے کہ اسے تاک لیا جائے۔ یہ سب علامات ہیں اس باطنی کمزوری کی کہ ہمارے عوام کے اندر ایمان کے ایک شعبے یعنی حیا نے دم توڑ دیا ہے۔ اسی وجہ سے بے شرمی شہوانیات، عریانی اور نظر بازی میں مسلسل ترقی ہو رہی ہے۔

یہ آپ کی قوم کا ظاہر ہے ——— یہ اس کا چہرہ ہے، جس کی رنگت سیاہی مائل زرد ہو رہی ہے۔ جس پر داغ اور چھائیاں ہیں جس پر میل اور غبار جم رہا ہے جس کی کھال خشک ہو ہو کر پپڑیاں بن گئی ہے۔ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ قوم کی صحت و قوت کس درجہ کی ہے۔ ایک ذہین آدمی اسی ظاہر کی مدد سے باطن کے سارے حالات کو نگاہوں کے سامنے لا سکتا ہے۔ باطن کتنا ہی چھپا ہوا ہو۔ سوسائٹی کا چہرہ اس کی پوری پوری غمازی کر دیتا ہے

اب صحت و قوت کو بحال کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ اس بیمار چہرے پر پوڈر اور غازے مل دیئے جائیں یا خود فریبی اور پراپگنڈے کے ریشمی پردوں سے اسے ڈھانپ دیا جائے، بلکہ سوسائٹی کے امراض پر اندر سے حملہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بدن میں صحت و قوت کے سوتے از سر نو جاری ہو جائیں تو چہرہ خود بخود پر رونق ہو جائے گا۔ اس پر دوبارہ سرخی دوڑنے لگے گی۔ تازگی جھلکنے لگے گی جمال ابلتا نظر آنے لگے گا۔

بیحضرور صحیح ہے کہ مادی طریقوں سے باہر سے پوڈر چھڑکنے کا فریب تدبیر آسان ہے۔ لیکن یہ کوئی علاج نہیں۔ دل بہلاوا ہے۔ حقیقی اصلاح تو اسلامی طریق پر اخلاق کی تعمیر اندر سے کئے بغیر نہیں ہو سکتی، جو اگرچہ مشکل بھی ہے اور دیر طلب بھی لیکن بہرحال مکمل بحالیٔ قوت کی واحد صورت یہی ہے۔

(۴)

اخلاقی حالت کی ذرا گہری تشخیص

عام حالات میں ہماری اخلاقی زندگی کی حالتِ مرض اتنی زیادہ نمایاں نہیں ہوتی کہ ایک عامی کی نگاہ بھی اسے محسوس کرے، بلکہ بسا اوقات بڑے بڑے نباض دھوکے میں پڑے رہتے ہیں۔ بلاشبہ مرض کے جراثیم ہمارے اجتماعی جسم کے رگ و پے میں مستقل چھاؤنیاں ڈالے پڑے ہیں اور برابر جسم کی قوت کو تحلیل کر رہے ہیں، لیکن یہ کچھ اس طرح ہمارے جسم کا جزو بن چکے ہیں کہ ہمیں ان کی خطرناکیوں کا کوئی خاص احساس نہیں ہوتا۔ کون نہیں جانتا کہ خیانت ہمارے نظامِ اجتماعی میں چپے چپے پر اپنے اڈے جمائے بیٹھی ہے، کون نہیں جانتا کہ رشوت کی جونکیں ہمارے ایک ایک ریشے سے خون چوسنے میں مصروف ہیں، کسے نہیں معلوم کہ ضمیر فروشی نے ہر کوچہ و بازار میں نیلام گھر کھول رکھے ہیں، کس کی آنکھوں پر یہ واضح نہیں کہ جاہ طلبی آکاس بیل بنی ہوئی ہمارے شجرۂ ملت پر مسلط ہے!——

یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہے، لیکن ہم اس کا عام حالات میں کوئی احساس نہیں کرتے، بلکہ ان حالات کو بالکل معمولی اور فطری سمجھتے ہیں، اور ان کے اتنے

عادی ہو چکے ہیں کہ انہیں دیکھ کر کبھی کوئی اضطراب نہیں ہوتا۔ پوری قوم جن جونکوں کو اپنا خون پلاتی ہے اور دق کے جن جراثیم کو اپنے پھیپھڑوں کا گوشت اور اپنی ہڈیوں کا گودا کھلاتی ہے اور جن سانپوں اور ناگنوں کو اپنی چھاتیوں کا دودھ پلا پلا کر آستین میں پالتی ہے، ان کی ساری کرم فرمائیوں کے باوجود پھر نیازمندی بھی کرتی ہے۔ یوں اخلاقی مفاسد ہماری زندگی کا لازمہ بن کر چلتے ہیں اور برابر انڈے بچے دیتے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں اس پر کوئی اضطراب نہیں ہوتا۔

ہاں مگر جب کبھی قوم کسی غیر معمولی صورتِ حالات کا سامنا کرتی ہے اور کسی اہم مرحلے سے گزر رہی ہوتی ہے تو اس کی اخلاقی کمزوریاں بالکل کھل کر سامنے آجاتی ہیں اور پھر کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ سکے۔ حوادث کا بے رحم ہاتھ جب ہمارے ظاہر کے سارے خوشنما پردے الٹ کر ہمارے باطن کو بالکل عریاں کر دیتا ہے اور ایک ایک داغ دھبہ بالکل آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو کم سے کم ایک لمحے کے لئے ضرور ہمیں یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ ہم کسی خوفناک مصیبت کا شکار ہو رہے ہیں۔

پہلی آزمائش

١٩٤٧ء میں جب دو قومی تصادم کی غیر معمولی صورتِ حالات پیش آئی تو اس نے ہماری اخلاقی صحت کی پوری حقیقت کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ ہندو مسلم فسادات نے پہلی مرتبہ خوب اچھی طرح اس حقیقت کو نمایاں کر دیا کہ اپنے اصول و اخلاق کے لحاظ سے خدا اور رسول اور قرآن پر ایمان رکھنے والی قوم اپنی حریف قوم سے کسی درجے میں بھی برتر نہیں ہے۔ اس ملت گیر حادثے میں ہماری پستیوں کو اجاگر کرنے والے کارنامے

رہے تھے۔

(۱) جہاں کہیں مسلمان قلیل تعداد میں تھے اور انہوں نے مظالم کا طوفان اُمڈتے دیکھا وہاں کٹ مرنے کا جذبہ پیدا ہونے کے بجائے زیادہ تر ہراس کی لہر تھی جو فضا میں پھیل گئی اور اس ہراس کی لہر نے رہی سہی قوت کو مضمحل کر دیا۔

(۲) جہاں کہیں مسلمانوں نے غیر مسلم اقلیت کو اپنے سامنے بے بس پایا وہاں انہوں نے دوسرے علاقوں کے مظلوم مسلمانوں کا پوری بے دردی سے انتقام لیا، حالانکہ انتقام کی یہ صورت ایک مسلمان قوم کو زیب نہیں دیتی۔

(۳) بوڑھوں اور بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے کی جو ذلیل کارروائی غیر مسلموں نے انجام دی، ٹھیک اسی کو مسلمانوں نے بھی اختیار کیا۔

(۴) اغوا اور زنا اور عورتوں کو ننگا کرنے اور ان کے ساتھ ہر طرح کی بدسلوکی کرنے میں مسلمان بالکل غیر مسلموں کی سطح پر پائے گئے۔

(۵) اس پورے "جہاد" میں امامت قوم کے غنڈوں اور اوباشوں کے ہاتھ میں رہی جن کے لئے ناممکن تھا کہ وہ کسی اخلاقی حد پر جا کر رک سکتے۔

(۶) مسلمانوں کے اندر بعض ایسے "خادم" موجود پائے گئے جنہوں نے اسلحہ کے لئے چندے جمع کر کے کھا لئے اور وہ بھی کہ جنہوں نے قوم کو مصیبت میں گھرے ہوئے پا کر اسلحہ سے کھل کر نفع اندوزی کی۔

(۷) قوم کے سامنے ایسے لیڈروں کو حالات نے بالکل نمایاں کر دیا جو اپنی جانیں ہی نہیں، اپنے مال بلکہ اپنے کتے تک لے کر معاً بھاگ کھڑے ہوئے اور جن عوام کی وہ لیڈری کیا کرتے تھے ان کو عین سیاسی مرگھٹ کے اندر گھرا ہوا

چھوڑ دیا۔

یہ موقع تھا کہ جو لوگ قوم کے خادم ہونے کے یا قوم کی قیادت کے دعویدار تھے یا جن کو قوم نے اقتدار کی کرسیوں پر بٹھا رکھا تھا، وہ اپنی اجتماعی زندگی کے انتہائی خطرناک اخلاقی پہلوؤں کا جائزہ لیتے اور اصلاحِ حال کے لئے طویل منصوبہ بندی کرکے پیشبندی کا کام ہاتھ میں لیتے۔ لیکن ایسے خادم، ایسے لیڈر اور ایسے حکمران کہیں نہ تھے۔ یہ موقع آیا اور گزر گیا۔

دوسری آزمائش پھر غیر مسلموں کے ترکِ وطن سے ایک اور آزمائشی گھڑی نمودار ہوئی۔ پنجاب، سندھ، اور سرحد سے غیر مسلموں کے گروہ گھبراہٹ کی حالت میں نکل نکل کر واہگہ سے پار چلے گئے اور ان کے اموالِ متروکہ ہمارے قومی اخلاق کے لئے کسوٹی بن گئے۔ مالِ مفت کی یہ گنگا بہ رہی تھی تو ہماری قوم کے امیروں اور غریبوں، شریفوں اور رذیلوں، لکھے پڑھوں اور ان پڑھوں میں سے ہر کوئی اس گنگا سے ہاتھ رنگنے کی مسابقت میں شریک تھا۔ بڑے بڑے پارسا تک اپنی پارسائی کا چغہ اتار کر اس حمام میں ننگے ہو گئے۔ اس میکدے کے جب دروازے کھلے تو رند بچارے تو رند تھے شہر کے قاضی و محتسب بھی اپنے اپنے جام تھامے آموجود ہوئے۔ شاید ایک فی صدی، شاید دو فیصدی یا شاید زیادہ سے زیادہ پانچ فی صدی افرادِ قوم ایسے ہوں گے کہ خوانِ یغما کی اس لوٹ سے کوئی حصہ پائے بغیر رہ گئے ہوں۔ اموالِ متروکہ نے تو ہماری قوم کی اخلاقی صحت کو بالکل ناپ کر دکھا دیا کہ یہاں کیا حال ہو چکا ہے۔

تیسری آزمائش پھر ایک تیسری آزمائش مہاجرین کی ایک کثیر تعداد کے وارد

ہونے سے پیدا ہوئی۔ اس آزمائش نے ہمارے داخلی مفاسد کو اور زیادہ کھول کر رکھ دیا۔ اس موقع پر ہمارے اجتماعی جسم کو روگ لگانے والے خطرناک جراثیم جن واقعات کے ذریعے بالکل نمایاں ہو گئے وہ یہ تھے:۔

۱۔ مہاجرین کے کیمپوں کا نظم و نسق چلانے والے کارکنوں نے ہر قسم کی بدعنوانیاں کیں۔ بعض لوگوں نے مہاجرین کے لئے باہر سے آئی ہوئی امدادی اشیاء میں سے اپنا حصہ اڑایا، مہاجرین کے بچوں اور بیماروں کے لئے آنے والے دودھ میں سے "ٹیکس" وصول کیا اور پھر مظلوموں کی عزتِ نفس کو طرح طرح سے کچلا گیا۔

۲۔ نوجوان بے فکروں کے غول کیمپوں میں جا کر کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے بسا اوقات مہاجرین کی بہو بیٹیوں کو تاکتے پھرے ہیں۔

۳۔ بعض جماعتوں کے تحت جن رضاکاروں نے مہاجرین کی خدمت کا کام سنبھالا، انہوں نے قومی فنڈز کو بے تحاشا دودھ کے ڈبوں، بسکٹوں، پیسٹری اور پھلوں پر خرچ کر کے اپنے لئے ایک ہنگامۂ تفریح پیدا کرنے کا اہتمام کیا، درانحالیکہ ان کے کیمپوں کے چاروں طرف نووارد مہاجرین آآ کے مر رہے تھے اور ان کی لاشوں کو اٹھانے تک کا انتظام نہ تھا۔

۴۔ مہاجرین کو مبتلائے مصیبت پا کر ہماری "قومی جونکوں" کی رگِ رشوت ستانی پھڑک اٹھی اور انہوں نے الاٹمنٹوں پر اور کسی جگہ منتقل ہونے کے لئے ذریعۂ سفر مہیا کرنے پر خوب خوب نذرانے وصول کئے، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مہاجرین کے بچوں سے کے جنازے پڑھنے۔ انہیں ضروری مقاصد کے لئے عرضیاں لکھ کر دینے اور ان کو کسی دفتر تک پہنچنے کا راستہ بتانے تک کا

معاوضہ طلب کیا گیا۔

۵۔ خود مہاجرین نے مکان اور زمینیں حاصل کرنے کے لئے بری طرح مسابقت، باہمی حق ماری اور اوچھے پن سے کام لیا، اپنی سابق مالی حالت کے متعلق کھلے کھلے جھوٹ بولے، اپنی جائدادوں اور کاروبار کے متعلق صریحاً غلط بیانات دیئے، اور پھر جو پہلے آ گیا وہ بہتر سے بہتر اور وسیع سے وسیع عمارات پر قبضہ کر کے بعد میں آنے والے کا راستہ روک کر بیٹھ گیا۔

یہ واقعات بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے سے بڑے پیمانے پر نمودار ہوئے، ہمیں وقتی طور پر ان کا بہ شدت احساس ہوا، لیکن ہمارے احساس نے آنکھ جھپکنے کے بعد پھر موندلی اور خواب خرگوش کی حالت پھر قائم ہو گئی۔

چوتھی آزمائش اس کے بعد پنجاب میں سیلاب کی آمد نے ایک مرتبہ پھر ہمیں بتایا کہ ہم کس پانی میں ہیں۔ سیلاب کی آمد پر جو کمزوریاں ابھر کے سامنے آئیں وہ یہ تھیں:۔

۱۔ لاکھوں عوام جب سیلاب بلا کا شکار ہو رہے تھے تو لاہور شہر میں ایک ایسا سنگ دل طبقہ بھی موجود تھا کہ مصیبت زدوں کی مدد کے لئے تو وقت اور مال صرف کرنے پر تیار نہ تھا، لیکن سیلاب کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے اور لوگوں کی بربادی کا تماشا کرنے کے لئے بیوی بچوں تک کو کاروں پر لاد کر گھما رہا تھا۔

۲۔ پھر یہ عبرتناک سماں بھی دیکھا گیا کہ لوگ جانیں بچا کر گھروں سے جب نکل گئے تو چور اچکے میدان میں آ گئے اور سیلاب زدہ گھروں میں گھس کر

سامان نکالنے کی واردات ہونے لگیں۔ اس کے سدّ باب کے لئے حکومت کو خاص فکر کرنی پڑی۔

۳۔ اسی مصیبت کے دوران میں یہ پرانا مرض بھی اور نمایاں ہوگیا کہ سیلاب زدگان کی خدمت کرنے والوں میں اکثریت ان افراد اور ان جماعتوں کی تھی جنہوں نے اگر ایک روپے کا کام کیا تو اس کے ساتھ لازماً دس روپے کا ڈھنڈورہ پیٹنے کا سامان بھی کیا۔ بعض تو ایسے بھی تھے جو یہ ساری تگ و دو بالکل انتخاب کو نشانہ بنا کر رہے تھے اور ان کی مختلف حرکات سے "نیت نیک" بالکل ٹپکی پڑتی تھی۔

۴۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ سیلاب زدگان کی امداد کے لئے جو نقدی اور سامان جمع ہوتے رہے، ان میں خیانت کی گئی۔ پھر خیانت کے عام رواج کی وجہ سے چندے اور سامان دینے والوں کو عام طور پر یہ بھروسہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کا دیا ہوا جو کچھ ہے وہ ٹھیک مستحقین تک پہنچے گا۔

۵۔ حکومت کا یہ کارنامہ بھی یادگار رہے گا کہ اس نے مسلم لیگ کو جو سہولتیں اور مراعات امدادی مہم کے لئے بہم پہنچائیں، دوسری جماعتوں کو نہ صرف یہ کہ ان سے محروم رکھا بلکہ بسا اوقات ان سے کسی طرح کا تعاون کرنے یا ان کی کسی ضرورت کو پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ کرم اتنا ہی ہوتا تو بھی غنیمت تھا: دوسری جماعتوں کے کارکنوں کو ستایا گیا اور ان کی جمع کردہ قربانی کی کھالیں چھینی گئیں یہ ہمارے حکمرانوں کا حال تھا کہ ان کو سیاسی رقابت کے احساس نے ایک مصیبت عام کے لمحے بھی نہ چھوڑا۔

یہ گھڑی بھی آئی اور گزر گئی۔ حالات وہیں رہے جہاں تھے۔

پانچویں آزمائش

ان سارے حوادث میں عبرت کے جو مناظر موجود تھے، ان پر سے اندھوں کی طرح گزر جانے والی قوم کو آخر کار ایک اور آزمائش کی کسوٹی نے پرکھا اور اسے اور زیادہ وضاحت سے بتا دیا کہ تجھ میں کھوٹ کتنا ہے اور کھرے مال کا تناسب کیا ہے۔

یہ آزمائش صوبۂ پنجاب کے انتخابات ۱۹۵۱ء کی آزمائش تھی۔

انتخابات پنجاب نے تو ہماری رہی سہی قلعی بھی کھول دی ہے، اور یہ ایک ایسی ہمہ گیر آزمائش تھی جس نے حکمرانوں، سرکاری کارکنوں، سیاسی لیڈروں، جماعتوں کے رضاکاروں، اخبارات کے ایڈیٹروں، مذہبی رہنماؤں، برادریوں اور محلوں کے چوہدریوں اور صوبے کے عام شہریوں میں سے ہر ایک کے ذہنی، روحانی اور اخلاقی روگ کھول کھول کے سر نگاہ بینا کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ یہاں ہم قوم کے ان سارے عناصر کے اخلاقی مظاہروں کا تذکرہ کرتے ہیں جو انتخابات کے پردہ سیمیں پر پیش کئے گئے۔

(۱) ہمارے حکمرانوں نے اپنے جس اخلاق کو نمونہ بنا کر قوم کے سامنے رکھا اس کے قابل توجہ پہلو یہ ہیں:-

ا ـــــــ ہمارے صوبے (بلکہ مرکز تک) کے حکمرانوں نے حکومت کے عہدوں پر قابض رہتے ہوئے مسلم لیگ کی خاص طور پر سرپرستی کی، اس کے لئے پروپگنڈا کیا، عوام کو اس کے حق میں ووٹ دینے کی تلقین کی، اور اس سلسلے میں جتنا کچھ ظاہر میں ہوا اس سے کئی گنا زیادہ پس پردہ ہوا۔

ب ــــــ انتخابات کے لئے جو قوانین اور ضابطے بنائے گئے اور جو اسکیم وضع کی گئی اس میں خاص طور پر مسلم لیگ کی ضروریات اور اس کی کامیابی کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا۔

ج ــــــ مختلف امیدواروں کے بکسوں کے لئے ایک دوسرے سے کھلم کھلا ممیز رنگ مقرر کرنے کے بجائے دھندلے، مرکب، مغالطہ انگیز اور مشابہ رنگ اختیار کئے گئے اور خاص طور پر جماعت اسلامی کے براؤن بکس کے ساتھ جو سرخ بکس صوبے کے ہر پولنگ بوتھ پر رکھا گیا وہ ووٹروں کے لئے بے حد مغالطہ انگیز تھا اور واقعتہً اس سے جماعت اسلامی کے اندازاً ۵ فیصد ووٹروں کو مغالطہ ہوا۔

صوبے اور ملک کے چوٹی کے مصلحین کا جب یہ حال ہو تو نیچے اس کا جو اثر ہونا چاہئے وہ ظاہر ہے۔

(۲) سرکاری کارکنوں نے اپنے اخلاق کا مظاہرہ یوں کیا:۔

ا ــــــ بعض موقعوں پر کھلم کھلا کسی ایک جماعت (خصوصاً مسلم لیگ، اور اس سے کسی قدر کم درجے پر جناح لیگ) کی جانب داری کی، اس کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لئے واضح طور پر یا اشارۃً ووٹروں سے مطالبہ کیا، بصورتِ دیگر ووٹروں کو پریشان کیا گیا۔

ب ــــــ ووٹرز کے حقوق کی بہم رسانی میں تساہل سے کام لیا، مثلاً بعض مقامات پر ووٹروں سے اپنے نام کے جعلی ووٹ ڈلوائے جانے پر ٹنڈر ووٹ بھروانا چاہا اور ان کو ٹال دیا گیا۔ یا کم سے کم یہ ہوا کہ بعض جگہ کافی زور دار مطالبے کے بعد

ان کو ان کا یہ حق دیا گیا۔

ج ــــــ ملک کی تعلیمی حالت کی پستی کی وجہ سے بہت سے ووٹر پولنگ بوتھ پر حقا بیٹھے کی رہنمائی کے محتاج بن کے سامنے آئے لیکن سرکاری عملے نے ان کی رہنمائی کا حق ادا نہیں کیا۔

د ــــــ جعلی ووٹر بار بار اور بکثرت ووٹ ڈالتے رہے اور اکثر اوقات عملہ ان کی روش پر ہنس کر بات ٹال دیتا رہا اور جانتے بوجھتے ان پر جرح نہ کی گئی، پھر اگر مشکوک یا صریحاً جعلی ووٹروں کا معاملہ پیش کیا گیا تو نوٹس لینے سے گریز کیا گیا۔ پھر اگر مطالبے پر گرفتاریاں کی گئیں تو گرفتار شدگان میں سے اکثر کو چھوڑ دیا گیا اور بہت ہی کم تعداد ایسی تھی جنہیں قانون کے حوالے کیا گیا۔

ر ــــــ کتنے ہی حلقوں میں ووٹروں خصوصاً عورتوں کے ہاتھوں سے ووٹ چھین لئے گئے اور یہ کارروائی سیاسی کارکنوں ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ پولنگ اسٹیشن پر کام کرنے والے عملے نے بھی سرانجام دی ہے۔

س ــــــ عورتوں کے لئے بہت ہی کم مقامات پر پولنگ کے لئے پردے کے تسلی بخش انتظامات سرکاری عملے نے کئے۔ بالعموم فضا بے پردگی کی تھی۔

(۳) انحلقوں اور برادریوں کے چوہدریوں نے انتخابات میں جو پارٹ ادا کیا اس کے دو پہلو خاص تھے:۔

ا ــــــ انتخاب کے قریب آنے پر ہر سربراہ کار اور چوہدری اپنے اپنے ووٹروں کے ریوڑ کو سمیٹ کر منڈی کے چکر لگانے لگا اور اپنی بھیڑوں بکریوں کی گنتی بتا بتا کر باقاعدہ سودے کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بار ہا ایسا ہوا کہ پہلے کسی ریوڑ

کے گڈریے نے ایک طرف معاملہ کیا اور اپنی بھیڑ بکریوں کو ہدایت کی کہ وہ فلاں کو ووٹ دیں، لیکن جب ادھر سے معاملہ بگڑ گیا یا دوسری طرف قیمت زیادہ ملنے لگی تو اسے اپنی امت کے لئے نیا حکم جاری کرنا پڑا۔

ب ـــــــ سربراہ کاروں اور چوہدریوں نے اپنے اپنے حلقہ اثر کے ووٹروں کو جمع کر کے ان پر دباؤ ڈالا اور ان کو دھمکایا کہ اگر ادھر ادھر ہوئے تو عاقبت خراب ہو گی۔ خاص طور پر مالکان زمین نے اپنے مزارعین کی آزادی رائے کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اسی طرح متاجروں نے اپنے اجیروں اور آقاؤں نے اپنے ملازموں کو ہانک کر حسب امیدوار کے حوالے کرنا چاہا، کر دیا۔

۴۔ مختلف جماعتوں اور امیدواروں کے انتخابی کارکن جو اکثر زرخرید تھے ان کی حسب ذیل کارروائیوں کے اثرات قوم کی اخلاقی صحت کے لئے بہت دور رس ثابت ہوں گے:۔

ا ـــــــ یہ چونکہ بیشتر ان پڑھ اور بازاری قسم کے لوگ تھے، بلکہ ان میں اکثریت غنڈوں کی تھی، اس لئے ان کی طرف سے بہت گھٹیا زبان استعمال کی جاتی رہی، بہت ذلیل حرکات سرانجام دی گئیں، ووٹروں کو گھیرنے اور اغوا کرنے کی بری سے بری چالیں چلی گئیں۔

ب ـــــــ یہ لوگ پولنگ اسٹیشنوں پر جعل سازی کے باقاعدہ کارخانے قائم کر کے بیٹھ گئے ـــــــ بعض مقامات پر تو باقاعدہ "میک اپ سیلون" اور "ڈریسنگ روم" بھی بنائے گئے ـــــــ اور پھر قوم کے ہر وو نو جوان میں آسکا غلط بیانی اور جعل سازی کی تعلیم دی۔ ایک ایک نوجوان کو کئی کئی باپوں کی اولاد بننے اور

ایک ایک عورت کو کئی کئی شوہروں کی زوجیت کا شرف حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ درس دئے۔

(۵) ہمارے ووٹروں کی اکثریت نے جس اخلاق کا ثبوت دیا وہ یہ تھا:-

ا ——— کل ووٹروں کا پچھتر فی صدی حصہ وہ تھا جس کو سرے سے انتخاب سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی اور یہ سوال کہ ملک کی باگ ڈور کس کے حوالے کی جانی چاہئے ان کے لئے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ یہ لوگ اپنے کام کاج میں مصروف رہے یا گھروں میں بیٹھے رہے، اور انہی نے جعلی ووٹروں کو موقع دیا کہ وہ بیس بیس مرتبہ جا کے ووٹ دیں اور قلیل التعداد ہونے کے باوجود کثیر التعداد اصلی ووٹروں کی رائے کو بے اثر بنا کے رکھ دیں۔

ب ——— جو لوگ ووٹ دینے کے لئے آئے، ان میں سے بھی بہت سے وہ تھے جو آئے نہیں تھے، لائے گئے تھے اور جنہوں نے ووٹ ڈال کر کسی نہ کسی پر احسان دھرا ہے یا اس کی قیمت وصول کی ہے۔

ج ——— پھر جو بطور خود آئے ان میں بھی کوئی قطعی رائے قائم کر کے آنے والے کم تھے۔ ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ انہوں نے پولنگ اسٹیشن پر جا کر یا تو اپنے آپ کو اس بات کے لئے چھوڑ دیا کہ کوئی آگے بڑھ کے انہیں استعمال کرلے یا پھر انہوں نے رخ ادھر کیا جدھر بھیڑ زیادہ دیکھی۔ بعض کے ضمیر کی پستی کا حال یہ تھا کہ انہوں نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک شخص واقعی اہل اور قابل ہے، اپنا ووٹ ایک نا اہل اور نا قابل کو اس دلیل کے ساتھ دیا کہ اہل اور قابل آدمی کی کامیابی کا چونکہ امکان نہیں لہذا ہمارا ووٹ ضائع جائے گا۔

۲ ـــــــ ہمارے ووٹروں میں سے بے شمار ایسے بھی تھے جو بار بار وعدے کر کے مکر جاتے رہے اور آخر کار جدھر چاہا رُخ کر لیا۔ وعدہ خلافی کے روگ سے بہت کم لوگ بچ سکے ہوں گے۔ یہاں تک کہ ہمارے سامنے ایسی قطعی مثالیں موجود ہیں کہ مسجدوں کے اماموں اور بڑے مذہبی قسم کے لوگوں نے ضمیر اور وعدے کے خلاف رائے دی ہے۔

۳ ـــــــ ووٹروں میں بہت ہی قلیل تعداد ایسی ہو گی جو دباؤ اور دھمکی کا جم کر مقابلہ کر سکی ہو۔ بالعموم لوگوں نے اخلاقی قوت کے انتہائی ضعف کا مظاہرہ کیا ہے۔ حالانکہ ووٹ خفیہ ڈالا جانے والا تھا۔

۴ ـــــــ پھر وہ ہمارے ہی شہری اور قومی بھائی تھے جو بیس بیس، پچیس پچیس کی ٹولیاں بنا کر ایک حلقے کے سارے پولنگ اسٹیشنوں پر گھوم گئے اور اپنے "خریدار" کے ووٹوں کی تعداد میں ہزاروں کا اضافہ کر دکھایا۔ ان لوگوں کی پستیٔ فطرت کا حال یہ تھا کہ انہوں نے فخریہ اس بات کا اظہار کیا کہ ہم نے بارہ یا پندرہ یا بتیس یا اکیاون مرتبہ ووٹ ڈالے ہیں۔

۵ ـــــــ خواتین ووٹروں کی اکثریت ایسی تھی کہ جس کے لئے پولنگ کا ہنگامہ ایک اچھا خاصا میلہ بن گیا تھا، یہ بھڑکیلے لباس پہن کر نکلیں اور شانِ بے پردگی کے ساتھ، بلکہ بسا اوقات فحش حرکات کے ساتھ انہوں نے پولنگ اسٹیشن پر اپنا وقت گزارا۔

پھر یہ بھی اخلاقی انحطاط کا مظاہرہ تھا کہ اکثر زنانہ پولنگ اسٹیشنوں کو چاروں طرف سے تماش بینوں نے گھیرے رکھا تاکہ وہ اپنی ماؤں بہنوں کو آتے

جاتے تاک سکیں۔

(۶) ہمارے اخبار نویس بھی اس کھیل میں اپنا پارٹ ادا کرنے سے کسی طرح قاصر نہیں رہے ملت کے ان ذہنی معلموں نے اخلاق حسنہ کی یہ یہ مثالیں قائم کیں:-

ا ـــــ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو کہ جس نے کسی نہ کسی جاہ طلب فرد یا گروہ سے بالکل ویسا ہی معاملہ نہ کیا ہو جیسے حق مہر لے کر ایک عورت کسی مرد سے نکاح کا معاملہ کرتی ہے۔

ب ـــــ ان حضرات نے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے، غیر موجود حالت کو موجود اور موجود حالت کو غیر موجود کر کے دکھانے کے فن کا "بے پناہ" مظاہرہ کیا ہے۔

ج ـــــ اپنے ممدوحین کی قصیدہ گوئی میں زمین کے قلابے آسمان کے ساتھ ملانے کے ساتھ ساتھ ان سے اختلاف رکھنے والوں پر وہ وہ بہتان تراشے ہیں اور ان کے لئے ایسے ایسے کلمات استہزاء استعمال کئے ہیں کہ ابتذال اور رکاکت کو وجد آ گیا ہوگا۔

(۷) امیدواروں اور انتخاب میں شریک ہونے والی جماعتوں ـــــ خصوصاً مسلم لیگ ـــــ کی پروپگنڈہ مشینری نے قومی ذہن کو بگاڑنے، جھوٹ و بدگوئی کا زہر پھیلانے، الزام تراشی کا رنگ لگانے، غلط فہمیوں کا دھواں چھوڑ کر عوام کے فکر کو پراگندہ کرنے کے لئے جو عظیم الشان اور جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری تاریخ سیاست میں زریں حروف سے منقش ہونی چاہئیں۔

(۸) سیاسی لیڈروں اور امیدواروں نے انتخاب میں جو کھیل کھیلا ہے، وہ ایک اُمسٹ یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حضرات قوم کے سامنے اس دعوے کے ساتھ آئے تھے کہ تمہارے حکمران اور کارفرما بننے کے سب سے زیادہ اہل ہم ہیں، لیکن انہوں نے اس کا ثبوت ذیل کی کارروائیوں سے دیا ہے:۔

ا ـــــــ اوپر جتنے مفاسد کا تذکرہ کیا گیا ہے اُن سب کے اصل محرک اور بانی مبانی اور سرپرست خود یہی حضرات تھے۔ انہوں نے ہر بد اخلاقی کو اپنی انتخابی منصوبہ بندی میں خود شامل کیا، کارکنوں اور ووٹروں کو انہی نے ہر گمراہی کی چھوٹ لگائی اور یہی وہ اصل منبع ضلالت تھے جنہوں نے کرسیاں حاصل کرنے کے جوئے میں پوری قوم کی اخلاقی متاع کو داؤں پر لگا دیا۔

ب ـــــــ پھر یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے پاکستان کے عوام کو کہیں برادری کی عصبیت کا، کہیں پنجابی اور ہندوستانی کی کشمکش کا، اور کہیں امیر اور غریب کے تنافر کا روگ لگانے کی ہر تدبیر اختیار کی۔

(۹) بہ حیثیت مجموعی قوم کی اسلامیت اور اخلاقی حس کا پول پوری طرح کھل گیا ہے کہ اُس کے سامنے جب ایک طرف علم و اخلاق کو دوسری طرف جہل و فسق کو رکھا گیا تو اس نے اپنا اجتماعی ووٹ علم و اخلاق کو نہیں جہل و فسق کو دیا۔

علاوہ بریں بد اخلاقی کے اتنے ہمہ گیر انتخابی ہنگامے کو دیکھ کر ایسے حساس لوگ کہیں نہ ابھرے جو اصلاح کا عَلَم اٹھا کر اُس سیلاب کے سامنے کھڑے ہو جاتے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکتے تو کم سے کم کوئی آنسو ہی بہا دیتے اور کوئی آہ ہی کر دیتے۔ یہ بھی قوم کے اخلاقی حس کے مردہ ہو جانے کی ایک خطرناک علامت ہے۔

موقعِ عبرت اس مرحلے پر ذرا سکون سے حالات پر غور کیجئے۔ انتخابات کے ہنگامے نے ایک بار پھر آپ کا اندرونی اخلاقی حال کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ خدارا اپنے رستے ہوئے ناسوروں، اپنے گندے داغوں، اپنے زہریلے پھوڑوں اور ان سے بہتی ہوئی پیپ سے آنکھیں چرا کر نہ نکل جائیے، اور خود فراموشی کی چنیا بیگم کا سہارا لے کر یا جذباتی پن کی مئے آتشیں کے جام چڑھا کر، یا خوش فکریوں کی معجونِ فلک سیر نوش فرما کر عبرت کے مواقع کو ضائع نہ کر دیجئے۔ ایک مرتبہ مردانہ وار ہمت کر کے اپنا حال ذرا اچھی طرح خود دیکھ لیجئے۔

یہ کمزوریاں، یہ امراض، یہ مفسدات جو آپ نے اپنے اجتماعی نظامِ جسمانی کے اندر پال رکھے ہیں، ان کی پوری پوری تشخیص کر کے ان کے ازالے کی فکر کیجئے، ورنہ یہ داخلی دشمن قوتیں آپ کو ایک دن یا چانک پچھاڑ کے رکھ دیں گی، اور پھر اپنے اوپر ماتم کرنے سے کچھ نہ بنے گا۔

(۴)

قومی قوت کا مرکزی سرچشمہ

قوموں کی قوت بنانے میں بلاشبہ روپیہ کو بھی، آلات و اسلحہ کو بھی، ذرائع و وسائل کو بھی، آب و ہوا اور ماحول کو بھی، زرعی اور معدنی پیداوار کو بھی دخل حاصل ہے۔ مگر اجتماعی قوت کا اصل سرمایہ خود افرادِ انسانی ہی ہوتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی دولت انسان ہیں۔ اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت انسان ہیں۔ یہ طاقت اگر

مطلوبہ معیار پر قائم رہے اور نتیجہ خیز طریقوں سے استعمال ہو رہی ہو تو پھر اسی طاقت کے اندر سے روپے کی طاقت، آلات اور مشینوں کی طاقت، اسلحہ اور بارود کی طاقت، اور دوسری تمام طرح کی مادی طاقتیں رونما ہونے لگتی ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ "انسانی قوت" بازار تاریخ میں قوموں کا اصل زر ہے۔ "یہ اصل زر" جتنا زیادہ ہوتا ہے اور جتنے بہتر طریق سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ "منافع" ہر گردش کے بعد لے کے لوٹتا ہے اور قوم کا خزانہ قوت تیز رفتاری سے بھرنے لگتا ہے۔

وہ قوم زندگی کے کاروبار میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی: جو اصل زر کی فکر کئے بغیر یا اس کی مقدار موجود کو بہتر سے بہتر طریق پر استعمال کرنے کا پروگرام بنائے بغیر کاروبار کے میدان میں آجائے دنیا میں اکثر قوموں کا حال یہی رہا ہے کہ انہوں نے مادی ساز و سامان پر تو براہ راست نگاہ رکھی ہے لیکن مادی قوتوں سے جس انسانی قوت کے بل پر سارا استفادہ کیا جاتا ہے اور جس کی کمی اور بیشی سے مادی قوتوں کی افادیت میں کمی اور بیشی ہوتی ہے۔ اس سے ہمیشہ تغافل برتا ہے۔

قرآن نے اور قرآن سے پہلے کی کتب سماوی نے اسی تغافل سے نوع انسانی کو باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور "مادی قوت" کے مقابلہ میں جو انتہائی اہمیت "انسانی قوت" کو حاصل ہے: اسے دنیا پر نہایت درجہ قوی استدلال کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے تاریخ کے ایک ایک جز کو نگاہوں سے گزار کر قوموں کے عروج و زوال کے مناظر پیش کئے ہیں اور بے شمار شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ جب کبھی قوموں کی "انسانی قوت" زوال پذیر ہو گئی

ہے تو ان کی موت کا راستہ نہ دولت کے انبار روک سکتے ہیں، نہ کوہ پیکر قلعوں کی دیواریں قدرت کے فیصلے کے سامنے ٹھہر سکی ہیں، نہ قصور و محلات تقدیر کے سامنے جم کے کھڑے رہے ہیں، نہ آلات و اسلحہ کو یہ ہمت ہوئی ہے کہ "اجل مسمّٰی" کے ورود کو چند لمحوں کے لئے ملتوی کرا سکیں، اور نہ اسباب عیش و تنعم ہی کا یہ بس تھا کہ وہ محرکات آہ و فغاں کا مقابلہ کر سکیں۔

انسانی قوت سے قحط کو قارون کے خزانوں کے سونے چاندی کے انبار شکست نہیں دے سکتے اس بھوک کا ازالہ مترفین کے باورچی خانوں کی رونق سے نہیں ہو سکتا، اس ضعف کو فراعنہ کے طنطنے چھپا نہیں سکتے، اور اس پیاس کو دودھ کی نہریں بجھا نہیں سکتیں۔

خدا کے نبیوں کا یہ انتباہ سننے والوں نے جب بھی سنا تو اکثر ایسا ہوا کہ سنی ان سنی ایک کر دی گئی۔ کسی قوم نے یہ نرالی بات سن کر اپنے خزانہائے زر و جواہر پر نظر ڈالی، کسی نے اپنے عساکر آہن پوش کو دیکھا، کسی نے اپنے ذرائع و وسائل کی کثرت پر توجہ کی۔ کسی نے اپنے اسباب عیش کے وفور کا مطالعہ کیا ——— اور پھر استکبار کی بلندیوں سے اس انتباہ کا مذاق اڑانے سے زیادہ بہتر جواب کچھ ان کے ذہن میں نہ آسکا۔ آخر کار ان میں سے ہر ایک تاریخ کے قبرستان میں دفن ہو کے رہی، اور "نوح انسانی" کے آثار عبرت میں اضافہ پہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اب بھی قرآن پڑھا جاتا ہے۔ اس میں انبیا کا یہ انتباہ بھی روز ہماری نگاہوں سے گذرتا ہے، اور "انسانی قوت" کی اہمیت پر جو زور اس کتاب نے دیا

ہے، اس سے ہم آگاہ ہیں۔ مگر اس کے باوجود سالہا سال سے ہماری نگاہیں مادی سازو سامان پر مرتکز ہیں۔ اور اپنی "انسانی قوت" کو ترقی دینے، اسے منظم کرنے، اور بہتر طریق پر استعمال کرنے کی کوئی فکر ہم نے نہیں کی۔ اسلام کا پیش کردہ فلسفہ، اس کے اساسی نظریات، اس کی روزمرہ کی عبادات اور اس کے اخلاقی احکام اور اس کا قانونی نظام ہے ہی اس لئے کہ انسانی قوت کو نشوونما دے، اسے منظم کرے، اس میں ترقی کرنے کی صفت کو ابھارے، اور ایسے بہتر سے بہتر طریق سے استعمال کرے کہ از خود زیادہ سے زیادہ مادی اقوات اس کا آلہ کار بنتی چلی جائیں اور ہر قوت کی کم سے کم مقدار زیادہ سے زیادہ افادیت دکھانے لگے۔ اسلام نے اسی انسانی قوت کی صحیح تربیت کر کے دنیا کو یہ معجزے دکھائے ہیں کہ گیارہ سو انتہائی مسلح سپاہیوں کے سامنے ۳۱۳ آدمی اسلحہ کی دردناک کمی کے باوجود قدم جما کے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اس عجیب معرکہ کو جیت کر دکھا دیتے ہیں۔ مدینہ میں فاقہ کشی کرنے والے بدوی ایران کے خوگران تنعم کی بساط الٹ دیتے ہیں اور روم کے قلعوں کی کنجیاں ایک اونچے درجے کی طاقت کے ہاتھوں سے آناً فاناً اس صحرائی قوم کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں جسے اونٹوں کی مہار تھامنے سے بڑا فن کوئی آتا ہی نہ تھا۔

پس ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے، اور ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھتے ہوئے، جبکہ ہمیں ہر قسم کی قوت کو مکمل کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، مادی قوت کے مقابلے میں انسانی قوت کی اہمیت کو سمجھ لینا چاہئے۔ اور یہ طے کر لینا چاہئے کہ آیا دنیا پرست اقوام کی طرح ہمیں خارجی

ں پر زیادہ توجہ صرف کرنی ہے یا خدا پرست قوم کی حیثیت سے اس
ں قوت کو ابھارنا ہے جس کے پوری طرح نمودار ہو جانے پر خارجی قوت کی
یت کم از کم .اگنا بڑھ جاتی ہے۔ انسانی قوت MAN FORCE سے ہم وہ محدود
م مراد نہیں لے رہے جو بالعموم رائج ہے اور جس میں زیادہ تر تعداد افراد کو یا
اص پہلو سے ان کی مہارت فن کو دیکھا جاتا ہے اور بس ان دو باتوں کی بنیاد
لم لگا دیا جاتا ہے کہ فلاں قوم کی انسانی قوت بڑی ہی مضبوط ہے۔
انسانی قوت کا یہ محدود مفہوم موجودہ مادہ پرستانہ فکر نے پیدا کیا ہے، ورنہ اسلامی
اجتماعیات میں اس سے مراد وہ اخلاقی قوت ہے جس کے بغیر آدمی محض اعضاء و جوارح
م اور رگوں اور پٹھوں اور ہڈی گوشت کا ایک تودہ رہ جاتا ہے۔ اور اسے انسان
محترم نام سے موسوم کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ انسانی معاشرہ اور انسانی تمدن
ل قوت نہ کثرت تعداد ہے نہ افراد کے جسموں کا موٹا اور خوش رنگ ہونا ہے،
ل و اسباب کی فراوانی ہے، بلکہ اس کو زندہ و توانا رکھنے والا اصل جوہر کیریکٹر
لیا خوب فرمایا تھا حضرت مسیحؑ نے کہ آدمی روٹی ہی سے نہیں جیتا، بلکہ وہ کلمۃ اللہ
یتا ہے۔ اس جملہ سے ان کی مراد یہ تھی کہ خدا کی طرف سے جن حقائق کا بندوں
م کیا جاتا ہے اور جن قوانین و احکام کا مخاطب بنایا جاتا ہے ان سے افراد اور
ں میں جو کیریکٹر نمودار ہوتا ہے وہ اگر انسانی زندگی سے خارج ہو جائے تو محض
سے جو جسم پلتے ہیں، ان میں تعاون و توافق کی جگہ تصادم و تدافع ہوگا اور وہ ایک
ے کی زندگی ختم کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔ "روٹی" فرد کی زندگی کی تو ضامن ہو سکتی
گر اجتماعی زندگی، تمدن کا نظام اور ریاست کی تشکیل صرف اخلاق پر منحصر ہے

یہ کام روٹی اور روپے سے نہیں ہوتا۔ پس اگر اخلاق نہ رہے اور اجتماعی زندگی نشوونما نہ پاسکے تو پھر اجتماعی زندگی کے بغیر خود افراد انسانی کو بقا مشکل ہے ــــــ اور کسی صنف حیوانی کے افراد شاید فرد فرد ہو کے جی سکتے ــــــ لیکن نوع انسانی کے افراد اجتماعی زندگی کے بغیر نہیں جی سکتے۔ یہی مدعا ہے مسیح علیہ السلام کے اس ارشاد کا کہ انسان کو اپنی بقا کے لئے روٹی کے علاوہ کلمۃ اللہ کی ضرورت ہے!

دنیا کا ہر جماعتی نظام اور ہر اجتماعی ادارہ اس کا محتاج ہے کہ اس کے ارکان و اعضاء میں کیریکٹر پایا جائے، اور ریاست چونکہ اجتماعی اداروں میں سے ایک بہت ہی وسیع اور اہم ادارہ ہے، اس لئے یہ دوسرے اداروں سے کئی گنا زیادہ اس کا مقتضی ہے کہ اس کے افراد کا کیریکٹر مضبوط ہو یہی چیز انسانی قوت ہے۔ اور اسی پر مادی قوتوں کے حصول اور ان کی صحیح افادیت کا دارومدار ہے۔

(۵)

پاکستان اور تعمیر اخلاق

دنیا میں بالعموم یہ ہوتا ہے کہ سیاسی جماعتیں پہلے اپنے افراد کا کیریکٹر اور قوم کی ایک اجتماعی سیرت بناتی ہیں اور پھر بعد میں اس کا موقع انہیں حاصل ہوتا ہے کہ وہ ریاست کا نظام چلائیں۔ ہر ملک میں جب کبھی سیاسی تحریکیں رونما ہوتی ہیں اور جہاں کہیں انقلاب آتے ہیں وہاں ان تحریکوں اور انقلابوں میں حصہ لینے والوں کی از خود ایک تربیت ہوتی ہے۔ ان کو اپنے اصولوں کی وجہ سے طنز و تعریض کا نشانہ بننا پڑتا ہے، ان کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے، ان کی تنظیم کو شکست

دینے کے لئے سازشیں کی جاتی ہیں، مخالفانہ پروپگنڈہ ان کا راستہ روکتا ہے، اعتراضات وشبہات ان پر وار کرتے ہیں، ان کو مال و دولت کی بے بہا قربانیاں دینی ہوتی ہیں، لاٹھیاں اور گولیاں ان کے سر وسینہ کی تواضع کرتی ہیں ضبطیاں اور قرقیاں ان پر مصیبت کی گھٹائیں لے کے آتی ہیں، قید و بند کی مصیبتیں ان کے سکون واطمینان کو تہ و بالا کرتی ہیں، وہ عدالتوں میں مجرموں کے کٹہروں میں کھڑے کئے جاتے ہیں، وہ صلیب کے تختوں پر قدم رکھتے ہیں اور اس طرح کے سینکڑوں "مراحل عشق" کو برسوں عبور کرنے کے بعد وہ ایک ریاست کے کارپرداز بنتے ہیں۔ اس دوران میں ان کے اندر کسی نہ کسی درجہ کا انفرادی اور اجتماعی کیریکٹر نمودار ہوتا ہے وہ فرض شناس ہو جاتے ہیں، ضبطِ نفس سیکھ جاتے ہیں، اطاعت نظم کے ماہر ہو جاتے ہیں، منضبط اقدامات کا فن سیکھ لیتے ہیں، انہیں مال قربان کرنا آجاتا ہے، انہیں بیوی بچوں کی مشکلات پر صبر کرنے کی مشق ہو جاتی ہے، وہ اپنی آرزوں اور خواہشوں کے حق میں سنگدل ہو جاتے ہیں، وہ راتوں کی نیند اور دنوں کے سکون سے بے نیازی پیدا کر لیتے ہیں، وہ جان کی بازی لگانے کا راز جان لیتے ہیں، وہ ہر بڑے سے بڑے خوف کے مقابلے میں ڈٹ کے کھڑے ہو سکتے ہیں، اور بڑے سے بڑے لالچ کے مقابلے میں اپنی خودداری کی حفاظت کرتے ہیں۔ پھر جب ریاست ان کے بس میں آتی ہے تو وہ اس کی حفاظت کے لئے اچھے سپاہی ثابت ہوتے ہیں۔

لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گروہ کو اس قسم کی تیاری کا موقع دیئے بغیر قدرت ریاست چلانے کی ذمہ داری سونپ دیتی ہے، اور یہی صورت ہمیں پیش

ہے۔ ہمیں "منزل لیلیٰ" کے جانی خطرات کو عبور کئے بغیر اور "مجنوں ہاشمی" کی شرطِ اول قدم کو پورا کئے بغیر "منزل لیلیٰ" مل گئی ہے ——— اور یہ ایک طرف مقام شکر ہے تو دوسری طرف یہ مقام تشویش بھی ہے ——— سوال یہ ہے کہ آخر ہم وہ اخلاق اب کہاں سے لائیں گے جو خطرناک مراحل کو عبور کرنے ہی سے بنا کرتا ہے؟ اور یہ اخلاق نہ بنا تو اس ذمہ داری کو کیسے نباہیں گے جو ہمارے سروں پر آپڑی ہے؟

ہماری پڑوس کی ہندوستانی قوم نے معرکۂ آزادی کے لڑنے میں جو ۶۰ سال صرف کئے ہیں اور اس زمانے میں آفات و مصائب کا مقابلہ کیا ہے اس نے اسے ایک اجتماعی کیریکٹر سے مالامال کر دیا ہے ——— اگرچہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے یہ مادہ پرستانہ کیریکٹر زیادہ قابلِ قدر چیز نہیں ہے ——— لیکن ہماری قومی تحریک جس کی عمر نسبتہً بہت تھوڑی ہے، محض آئینی راستوں پر چلتی رہی ہے اور اس میں ہم نے جلسے کرنے، جلوس نکالنے، جھنڈے بلند کرنے، نعرے لگانے اور ووٹ لینے دینے کے سوا اور کسی خوبی کی پرورش اپنے اندر نہیں کی ہے۔ عین اس حالت میں ایک ملک کا چارج قدرت نے ہمارے حوالے کر دیا ہے۔ اب جو غور کرتے ہیں تو ہر طرف رشوتوں، سفارشوں، بے قاعدگیوں، بدنظمیوں، خودغرضیوں، اعزہ پروریوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا دور دورہ

لہ لیکن تقسیم کے بعد کے چند سالوں کے تجربات نے اس کیریکٹر کو بھی بودا ثابت کر کے یہ حقیقت نمایاں کر دی ہے کہ محض سیاسی بلڑ سے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے "سیکولر" بھی ہو ٹھوس کیریکٹر نہیں بنتا۔

نظر آتا ہے ـــــ نیچے سے اوپر تک سب لوگ ان کے خلاف چیخ پکار بھی کر رہے ہیں، مگر یہ دردناک روگ نظام حکومت اور سوسائٹی دونوں کو خوب اچھی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔

پچھلی سیاسی تحریک کی جو فطرت تھی اس کے مطابق جو اخلاقی کمزوریاں پیدا ہونی چاہئیں تھیں وہ بدرجۂ اتم قوم کے اکابر اور عوام دونوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔ سب سے بڑا عیب تو ہمارے ہاں خود غرضی کا ہے، جس کا حال یہ ہے کہ اس نازک وقت میں ہمارے سربراہ کاروں کو جس چیز کی فکر لاحق ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح جلد از جلد لیگ کے قوم کے خزانہ سے اپنی مساعی پنج سالہ کا عوض وصول کریں، کس طرح بہتر سے بہتر عہدوں پر قابض ہوں، اور کیسے اپنے رقیبوں کو زک دیں چنانچہ مفاد کے اس بٹوارے میں نہ صرف انہوں نے مسلم لیگی اور غیر مسلم لیگی کی تفریق کو خوب نشوونما دے لی ہے، بلکہ خود مسلم لیگ کے اندر دو پارٹیاں بنا دی ہیں جن میں سے ہر ایک دوسری کی مستقل حریف ہے کسی کے سامنے اس وقت یہ سوال نہیں ہے کہ وہ قوم کی کیا خدمت انجام دے سکتا ہے، بلکہ صرف یہ سوال سب کے پیش نظر ہے کہ وہ سوسائٹی اور حکومت سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ وزراء اور امراء اسی فکر میں ہیں، لیڈر اور زعما اسی کوشش میں ہیں اور اخبار نویس اور مقرر اسی جدوجہد میں ہیں۔ جس کے پاس سیاسی خدمات ہیں وہ ان کے ذریعے خیانت کر رہا ہے، جس کے پاس عہدہ ہے وہ اس کے ذریعے لوٹ مار میں مشغول ہے، جس کے پاس زبان یا قلم ہے وہ اس کے وسیلے سے قوم کے خزانہ قوت میں سے حصہ وصول کرتا ہے۔ پہلے بڑے اس معرکہ کو شروع کرتے ہیں، پھر چھوٹے پہلے

حاکم یہ فتنہ پھیلاتے ہیں، پھر رعیت، پہلے لیڈر ووٹ مار میں مشغول ہوتے ہیں، پھر عوام ــــــ اور اس بیماری کی چھوت ہر متنفس کو لگ جاتی ہے۔

دوسری بلا جو ہمارے اخلاقیات پر حملہ آور ہو رہی ہے وہ نمائش یا ادراشتہار بازی کی بلا ہے کام چاہے ایک پیسے کا کیا جائے، لیکن اس کے ساتھ دھوم دھڑلہ روپے کا ہوگا! خدمات تولہ بھر ہوں گی لیکن اشتہار بازی من بھر کی ہوگی۔ قربانی بعد میں ہوگی، لیکن اس کا ڈھنڈورہ اخبارات میں پہلے پیٹنا شروع ہو جائے گا۔ یہ بیماری اس حد تک پرورش پا چکی ہے کہ اب مختلف میدان ہائے کار میں کام کچھ بھی نہیں ہوتا، بلکہ نمائش کا چھلکا ہی چھلکا نظر فریبی کے لئے سجا نظر آتا ہے۔ جہاں کوئی کام شہرت اور ناموری کی قیمت ادا کرتا ہو۔ وہاں قوم کو کوئی رضا کار فراہم ہی نہ ہوگا، بلکہ لوگ اس درجہ کے بنئے ہو گئے ہیں کہ ترازو کے ایک پلڑے پر کام کو اور دوسرے پلڑے پر اس سے حاصل ہونے والی ناموری کو رکھتے ہیں اور پھر اگر ناموری کا وزن رتی بھر بھی کم ہوتا ہے تو میدان کار کو سلام کہہ جاتے ہیں۔ ہمارے اسٹیج اور پریس نے برسوں سے ہمارے کارکنوں پر یہ ظلم کیا ہے۔ کہ ان کو نمائش کاری کی چاٹ لگا دی ہے، اور اس کے دردناک نتائج دیکھنے ہوں گے۔

پھر ہماری ایک اور بیماری ہنگامہ آرائی کی بیماری ہے اور اس بیماری نے ٹھوس اور خشک کام کی طاقت قوم کے اندر سے سلب کر لی ہے۔ الیکشن اور وزارت کے لئے ہنگامہ آرائی کرنے کو اور اپنے محبوب رہنماؤں کے لئے جلوس نکال کر نعرے لگانے کو اور مخالفین کو گالیاں دینے کو تو یہ قوم لاکھوں رضاکاروں کو میدان میں لا سکتی ہے، لیکن کسی ٹھوس، خشک، دیر طلب اور خاموش کام کے لئے اس کے پاس کارکنوں کا

جو خوفناک فحط ہے اس کا ثبوت آپ کو پناہ گزینوں کے کیمپ دے سکتے ہیں جس قوم کو آپ دس کروڑ گن کر فخر محسوس کرتے ہیں اس کی طرف سے جو عظیم الشان تعداد ان کیمپوں کا کام کر رہی ہے اسے کبھی جا کر گنئے ——— اور اس تعداد سے اندازہ کیجئے کہ یہ ۱۰ کروڑ حقیقت میں دس سو بھی نہیں۔ مصیبت کے وقت میں مشقت کا کام سنبھالنا اور اسے ڈٹ کر انجام دینا جس قوم کے فرزندوں کو نہ آتا ہو، وہ بندوقوں اور رائفلوں سے مسلح ہو کر بھی حریف کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

پھر ان سب کمزوریوں سے بڑی کمزوری غیر منظم طور پر کام کرنے کی عادت ہے کہ اگر چند افراد کسی خدمت کے لئے میدان میں آتے بھی ہیں تو ان کے سامنے کوئی نقشہ کار نہیں ہوتا، کوئی حدود عمل نہیں ہوتیں، کوئی تقسیم فرائض نہیں ہوتی، کوئی ڈسپلن اور انضباط نہیں ہوتا، اور غیر منظم طریق سے کام کرنا، کام چوری سے بھی زیادہ مضر ثابت ہوتا ہے۔ یہ کمزوری موجودہ سیاسی فسادات میں ان مقامات پر بھی خوب اچھی طرح فاش ہوئی جہاں کے مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور اب ان کیمپوں میں بھی فاش ہو رہی ہے جہاں ان کو لاکے ٹھہرایا جاتا ہے۔ نہ اکھڑنے والوں نے اکھڑتے میں کسی نظم کا ثبوت دیا، نہ اب ان کو جمانے والے ان کو جمانے میں کسی نظم کا ثبوت دے رہے ہیں جن لوگوں پر مصیبت آئی ان میں بھی ہڑبونگ پیدا ہوئی اور جو لوگ مصیبت زدوں کی امداد کرنے میدان میں آتے ہیں وہ بھی ہلڑ بازی کے ساتھ آتے ہیں۔ حالانکہ کوئی کیریکٹر والی قوم ہوتی تو ایک دم مشین کا سا نظم اس میں کارفرما ہو جاتا اور اس کا ایک ایک فرد دوسرے افراد سے ایک مشین کے پرزوں کی طرح وابستہ ہو جاتا۔

یہ ساری خرابیاں خود ہماری پنج سالہ سیاسی تحریک ہی کے دوران میں پل

چکی تھیں، مزید غضب ہندو مسلم فسادات نے ڈھایا کہ قوم کی قوم بد اخلاقی کے جواب میں برابر بد اخلاقی کے مظاہرہ پر اتر آئی اور جن جن متعفن حرکات اور بڑے ہوئے کارناموں کو حریفوں نے پیش کیا۔ ان میں خدا کے دین پر ایمان رکھنے والے بھی مہارت دکھلاتے گئے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جان و مال کا نقصان ہو رہی رہا تھا، اخلاق کی رہی سہی پونجی بھی لٹی۔ لوگوں نے قتل کا فن سیکھا، لوٹ مار کی مشق کی، آگ لگانے کے ہنر میں ترقی کی، اغوا میں مہارت حاصل کی، زنا کاری میں دستگاہ پیدا کی، عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے کی "شجاعت" سیکھی، ——— اور اس حال میں قانون کے محافظ بھی چونکہ ان کے شریک کار تھے، لہٰذا جو غلط سلط قانون موجود تھا اس کا خوف بھی ختم ہوا اور ضمیر اور قانون دونوں کے خلاف اقدام کرنے کی جسارتیں حد سے بڑھ گئیں۔

اخلاق میں یہ رخنے جو اس یک سالہ دور میں پیدا ہو گئے ہیں، یہ برسوں کی محنت سے نہ بھریں گے۔ اور قانون شکنی کی جو مشق عوام نے بہم پہنچائی ہے اس کا اثر قرنوں تک ختم نہ ہو سکے گا۔

اگر ہماری قوم کے پاس سنجیدہ و فہمیدہ لیڈر ہوتے، اگر اس کے پاس اخلاق کی قدر و قیمت کو جاننے والے اکابر ہوتے، اگر اس کے پاس کیریکٹر کے جوہر شناس افسر اور حاکم ہوتے تو وہ قوم کے اخلاق کو بربریت کی اس سطح پر کبھی نہ گرنے دیتے جس پر اس کی حریف قوم کا اخلاق جا پہنچا تھا۔ چاہے مسلمانوں کے جان و مال کی تباہی موجودہ تباہی سے کئی گنا زیادہ بھی ہوتی۔ اور چاہے دشمنوں کی بربریت موجودہ بربریت سے بھی زیادہ متعفن ہوتی۔ لیکن یہاں اخلاقی انحطاط کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ بلکہ سب انتقام کے جنون میں سرشار تھے ——— اور اس

طرح ایک اہم دور جو اخلاق بنانے کا دور ہو سکتا تھا، الٹا اخلاق کے انحطاط کو مکمل کرنے والا ہو کے رہا۔

اب اگر ہم لوگ اخلاقی ارتقا کی فکر کئے بغیر اس فکر میں لگ جائیں کہ ہمارے ہاں پیداواریں زیادہ ہونی چاہئیں، برقی طاقت کے ذخائر بڑھنے چاہئیں ٹیلیفون اور ریڈیو کثیر التعداد ہوں، موٹریں اور ہوائی جہاز تیار ہونے لگیں، تو آخر یہ ساز وسامان "انسانی قوت" کی اس کمی کو کیسے پورا کر دیں گے جو مسلسل زیادہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ــــ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے کارکن نمائش پسند، خود غرض، بے نظم، بددیانت، کام چور، وعدہ خلاف، آرام طلب، بے صبر، مقصد کے غیر وفادار، جاہ پرست اور غیر کے آلۂ ہائے کار اور قوم کو اپنے ادنیٰ کیریکٹر سے نقصان پہنچاتے رہیں تو کیا ریڈیو ان کا راستہ روکے گا؟ کیا ٹیلیفون ان کو باز رکھیں گے؟ کیا موٹریں ان کا ہاتھ پکڑیں گی؟ کیا ہوائی جہاز ان کے درمیان حائل ہوں گے؟ ــــ انسان میں بذاتہٖ کوئی کمی موجود ہو تو آلات مشینیں اور روپیہ اور پیداواریں اس کمی کو کیسے پورا کر سکتی ہیں؟

جس قوم کا کردار گر گیا ہو اس کی اصلاح نہ صرف یہ کہ مشین، روپیہ اور پیداواریں نہیں کر سکتیں بلکہ قانون بھی نہیں کر سکتا، عدالتیں اور جیل بھی نہیں کر سکتے، پولیس اور فوج بھی نہیں کر سکتی، ــــ کیونکہ قانون اور عدالت اور پولیس اور فوج صرف ان بداخلاقیوں اور مفاسد کو روک سکتے ہیں جن میں سوسائٹی کے عام حالات کے خلاف چند افراد مبتلا ہو جائیں، لیکن جہاں سوسائٹی میں کچھ پست اخلاقیاں عام ہوں، وہاں قانون کی مشین خود پست اخلاق لوگوں کے قبضے میں چلی جاتی ہے، عدالتیں ان کی اپنی ہوتی ہیں، پولیس اور فوج خود انہیں پر مشتمل ہوتی ہے، اخبارات اور

اسٹیج ان کے اپنے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ ـــــــ اس حال میں، اخلاق کی اپلیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اخلاق پر وعظ بھی کئے جاتے رہتے ہیں اخلاق کی بحالی کے لئے مقالات بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور اخلاق کی حفاظت کے لئے قانون بھی بنتے رہتے ہیں، لیکن ان مصنوعی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ اخلاق کے لئے اپلیں کرنے والے، اور مقالات لکھنے والے اور قانون بنانے والے خود ساری بداخلاقیاں کرتے رہتے ہیں۔ یہ ساری بیرونی کوششیں بے کار ہیں، تا آنکہ انسان کے کیریکٹر کو اندر سے نہ ابھارا جائے اور اس کی مناسب نشوونما کے لئے معقول داخلی ذرائع اختیار نہ کئے جائیں۔ ہمیں اب بیرونی اور نمائشی کوششوں اور مصنوعی طریقوں سے تعمیر اخلاق کا کام کرنے کی خود فریبانہ تدابیر سے باز آجانا چاہئے ـــــــ ورنہ پاکستان چند روز کا ایک کھیل ہے اور بس!

(۶)

اخلاقی قوت کی اولیت

قومی تعمیر و ترقی کے لئے سب سے پہلے قوموں کو جس ساز و سامان پر متوجہ ہونا چاہئے، وہ روپیہ، اسلحہ، آلات، گاڑیاں اور ہوائی جہاز نہیں، بلکہ قوم کا اخلاق ہے۔ اخلاق بلند ہو تو دشمن کے ساز و سامان تک بسا اوقات امداد کے لئے موجود ہو جاتے ہیں اور اخلاق پست ہو تو اپنے ہاں کے افراد اور اسباب دشمنوں کے آلۂ کار ہو جاتے ہیں اور دشمنوں کے مفاد کے لئے استعمال ہونے لگتے ہیں ـــــــ یا کم از کم بے کار ہو کے رہ جاتے ہیں۔

یا بالفاظ دیگر اخلاق طاقت کی ایک ایسی قسم ہے جو دوسری تمام اقسام سے اہم ہے مثلاً ہو سکتا ہے کہ ایک فوج اپنی تعداد کے اعتبار سے بھاری طاقت رکھتی ہو، لیکن اگر اس میں سمع وطاعت کا مادہ کم ہو تو وہ کسی نازک موقع پر مار کھا جائے گی۔ محض اس لئے اس کی اخلاقی طاقت میں کمی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک سپاہی کے ہاتھوں میں اعلیٰ درجہ کی رائفل ہو اور اس کے تھیلے میں بہترین کارتوس موجود ہوں۔ لیکن اگر اس کے دل میں جوہر شجاعت اور موت سے بے خوفی کی اسپرٹ موجود نہیں ہے تو وہ عین معرکہ کے دوران میں پیٹھ دکھا سکتا ہے۔ یہ مشکل نہیں کہ ایک آدمی کو روپیہ کی بہت بڑی مقدار ہاتھ لگ جائے، لیکن اس آدمی کو روپیہ کا وہ استعمال سکھانا مشکل ہے۔ جو سوسائٹی کے مجموعی مفاد کا ضامن ہو سکے۔ وقت کی پیمائش کے لئے قیمتی سے قیمتی گھڑیاں اور کلاک فراہم کر لینے سے کسی جگہ کے کارکنوں کو پابندیٔ اوقات کا درس نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ گھڑیاں اپنی ٹک ٹک کرتی ہیں اور تغافل شعار لوگ ایسے ایسے نازک لمحات کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ کہ ان کے نقصان کو پھر پورا نہیں کیا جا سکتا۔

اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے قلم آپ اپنے لکھنے والوں کو مہیا کر کے دے سکتے ہیں، لیکن اگر ارباب قلم کا اخلاق پست ہو تو یہ قلم جھوٹ، اور نفرت وحقارت اور بے حیائی کو پھیلانے کے لئے استعمال ہوں گے۔ اور ان کے بہائے ہوئے سیلاب غلاظت کو روکنا آسان نہیں ہوگا۔ آپ کے کارخانے کاغذ کی بہتر سے بہتر قسمیں تیار کر کے زیادہ سے زیادہ مقدار میں مارکیٹ کے حوالے کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر مصنفین اور پریس کے کارپرداز اخلاقی انحطاط کا شکار ہو چکے ہوں تو اس بات

کا انتظام کرنا کہ اس کاغذ پر قوم میں مفاسد پھیلانے والے مطالب پیش نہ کئے جا سکیں، آپ کے بس میں نہیں ہے۔ آپ شہر بشہر ریڈیو ٹرانسمٹر نصب کر سکتے ہیں، اور گھر گھر میں ریسیونگ سیٹ مہیا کر سکتے ہیں، لیکن اگر عوام الناس کا مذاق بگڑ چکا ہے تو آپ اس امر پر بآسانی قادر نہیں ہو سکتے کہ کسی ٹرانسمٹر سے کوئی ایسی چیز نشر نہ ہونے دیں جو عوام کے ذہن، وقت، اخلاق یا اموال کا نقصان کرنے والی ہو۔

آپ لاتعداد اسکول اور کالج کھول سکتے ہیں لیکن اگر ان کے کارپردازوں میں دیانتداری نہ ہو تو وہ طلباء کو قابلیت اور سیرت دونوں سے کورے رکھ کر انہیں سند فراغت دیتے رہیں گے۔ آپ پولیس کی بڑی سے بڑی طاقت مہیا کر سکتے ہیں، لیکن اگر ان میں احساس فرض مردہ ہو تو یہ شریفوں کے خلاف بدمعاشی اور بدمعاشوں کے لئے سرپرستی کرنے والی طاقت بن کے رہے گی۔ آپ قریہ قریہ عدالتیں کھول سکتے ہیں، لیکن اگر آپ کے ججوں اور وکلا کے ضمیر بیدار نہ ہوں تو ہر عدالت انصاف کی قتل گاہ بن کے رہ جائے گی۔

الغرض سوسائٹی کا اخلاق اگر بحال نہ ہو تو اس کے قصر حکومت وقانون میں طرح طرح سے نقب لگائی جا سکتی ہے۔ اخلاقی قوت کی کمی حکومت کے کارکنوں اور عوام دونوں کو ان مقاصد کو برباد کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے جو قوم نے اپنی بقا کے لئے طے کئے ہوں۔ کیریکٹر کی کمزوری قوم کی قوم کو بکوا سکتی ہے۔ سلطنت کو دشمن کے ہاتھ گروی کرا سکتی ہے، اسباب ووسائل کی کثرت کو حریف کے سپرد کرا سکتی ہے ——— اور یہ حادثے ایسے مواقع پر اچانک رونما ہو

جایا کرتے ہیں جبکہ ان کو بے اثر کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

بے اخلاق افراد کے بل پر جو نظام زندگی وجود میں آیا ہو اس کی حیثیت بالکل وہی ہوتی ہے جو کچی اینٹوں سے بنے ہوئے محل کی ہو سکتی ہے کہ جب سیلاب آئے یا طوفان باد و باراں اس پر حملہ آور ہو تو وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، بلکہ اس کی بنیادیں بیٹھنے لگتی ہیں اور دیواریں گرنے لگتی ہیں ـــــــ اس محل میں اگر اعلیٰ درجہ کے ساز و سامان جمع کئے گئے ہوں اور اس کی دیواروں کو اگر چین کی نقاشی سے سجایا گیا ہو تو یہ سب کیا کرایا بھی برباد جائے گا۔ یہ زوائد محل کی تعمیری کمزوری کا ازالہ نہیں کر سکتے۔ پھر ایسے کمزور محل میں ہر چور کے لئے نقب لگانے کی آسانیاں موجود ہیں اس محل کے اصل دشمن سیلاب، طوفان اور نقب زن نہیں ہیں، بلکہ اس کی اینٹیں اور اس کی اپنی دیواریں ہی اس کی اصل دشمن ہیں۔

بالکل اسی طرح کمزور کیریکٹر کے افراد سے جو حکومت اور سوسائٹی ترکیب پاتی ہے، اس کے اصل دشمن بیرونی حملہ آور اور خارجی مفسد نہیں ہیں بلکہ اس کے اپنے افراد ہی اس کے لئے تباہی کا پیغام ہیں۔ وہ خود بیرونی دشمنوں کو آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں، وہ خود خارجی مفسدوں کے لئے شرارت کے راستے پیدا کرتے ہیں۔ اور اس طرح کے اندرونی دشمنوں کی اصلاح کئے بغیر بیرونی دشمنوں سے بچاؤ کے پروگرام سوچنا اور اس بچاؤ کے لئے آلات و اسلحہ پر بھروسہ کرنا حسن تدبیر کی تعریف میں نہیں آتا۔

ہوش مند قومیں اور حکومتیں اس حقیقت کو سمجھتی ہیں کہ رشوت کا ہر وہ روپیہ جو ان کے نظم میں رخنہ پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس بم سے

زیادہ خطرناک ہے جو دشمن کے ہوائی جہاز سے گرایا گیا ہو۔ ہر وہ سفارش جو اجتماعی مقاصد میں افراد کے نقب لگانے کا ذریعہ بنتی ہے: اس گولی سے زیادہ تباہ کن ہے جو دشمن کے مورچے سے برسائی گئی ہو۔ ہر وہ کھایا ہوا لفظ جو اجتماعی مفاسد کو غذا فراہم کرے اس زہریلی گیس سے زیادہ ہلاکت خیز ہے جو دشمن کی طرف سے چھوڑی گئی ہو۔ اسی طرح یہ بات گرہ میں باندھ لینی چاہیئے کہ کسی جماعت یا ادارہ کے دشمن وہی نہیں ہیں جو اس کے باہر بیٹھے ریشہ دوانیاں کر رہے ہوں یا براہ راست اس پر حملہ آور ہوں۔ بلکہ ان سے خطرناک تر دشمن وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس کے اصل الاصول کے وفادار نہ ہوں، جو اس کے نظام سمع و طاعت سے انحراف کرتے ہوں، جو مطلوبہ یک جہتی کو ضرر پہنچاتے ہوں، جو روپے، عہدے، شہرت اور آرام کے بھوکے ہوں، جو نمائش اور ریاکاری کے عادی ہوں، جو پابندیٔ وقت سے کتراتے ہوں، جو ادائے فرض میں تغافل کیش ہوں، جنہیں قوم سے اعزہ پروری اور خویش نوازی قوم سے بددیانتی کرنے کا خوگر بنا دے، جو وعدوں کو ایفا نہ کر سکیں، جو جھوٹ بولنے میں دلیر ہوں اور جن کی نگاہوں میں قانون اور اخلاق اور مذہب بانسبت اغراض سے زیادہ وقعت نہ رکھتے ہوں۔

ہمیں افسوس سے اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہماری سوسائٹی اس قسم کے دشمنوں سے اٹی پڑی ہے۔ اور اس سوسائٹی کا نظام حکومت پوری طرح اس کے دشمنوں ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دشمنوں کو تنخواہیں دے دے کر، عہدوں سے سرفراز کر کے، اور خطابات سے نواز کر اگر ہم بیرونی دشمنوں کے مقابلے کی تیاریاں کرنے لگیں تو ان تیاریوں سے لایعنی فضل اور کیا ہوگا۔ ان سچے

لوگوں کو اگر اعلیٰ ساز و سامان فراہم کر دیئے جائیں اور وسیع سے وسیع اختیارات اور زیادہ سے زیادہ مادی قوت سے انہیں مسلح کر دیا جائے تو کیا معلوم کہ کس لمحہ میں یہ لوگ اچانک قوم کی امانت میں دی ہوئی قوتوں کو دشمن کا آلۂ کار بنا دیں اور کب کس موقع پر خود سوچے کے سوچے حریف کے پاس ذاتی مفاد کے لالچ میں بک جائیں ا ہر کمزور سیرت آدمی کی ایک قیمت ہوتی ہے ـــــ کوئی روپے کی کسی مقدار پر، کوئی شہرت کے بدلے میں، کوئی وزارت اور لیڈری کی قیمت پر، کوئی نسوانی حسن و جمال کے عوض میں بکتا ہے ـــــ اور پھر جب بکنے والا بکتا ہے تو اس کے پاس جو عہدہ و اختیار اور جو اسلحہ و آلات قوم کی امانت ہوتے ہیں وہ بھی از خود بک جاتے ہیں ـــــ جدھر کینیز جائے گی، اس کے زیور بھی ادھر ہی جائیں گے ـــــ پھر آخر کچے کیریکٹر کے لوگوں کو قوم کے حفظ و بقاء کا کام سونپنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

یہ وقت کا اہم ترین سوال ہے۔ جس پر قوم کے خواص اور عوام دونوں کو خوب اچھی طرح غور کرنا چاہئے!

(۷)

اجتماعی قوت کے دو فارمولے

یہ چیز تو دنیا بھر کی مانی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی قوم اور جماعت کے اپنے اندر جو کمزوری ہوتی ہے وہی اس کے لئے سب سے خطرناک دشمن ہوتی ہے۔ اور باہر کے دشمن اندرونی کمزوریوں ہی کی مدد سے دراز دستی کا موقع پاتے ہیں اور اندرونی کمزوریوں

ہی کے ذریعہ کامیابی حاصل کرتے ہیں، لیکن غلطی قوموں کو یہ لاحق ہو جاتی ہے کہ وہ مادی قوت اور مادی کمزوری پر زیادہ متوجہ ہوتی ہیں اور اخلاقی قوت اور اخلاقی کمزوری پر ان کی توجہ کم رہتی ہے۔ تاہم ہر زندہ قوم کو تعمیر اخلاق کا کوئی نہ کوئی پروگرام سامنے رکھنا پڑتا ہے اور الہامی فلسفہ کی طرح قیاسی فلسفہ بھی اتنی بات ماننے پر مجبور ہوتا ہے کہ اخلاق ایک قوت ہے اور اخلاقی فرومائیگی ایک کمزوری ہے۔ یقیناً یقین قوت ہے اور گمان کمزوری ہے، اجتماع قوت ہے اور انتشار کمزوری ہے، تنظیم قوت ہے اور بدنظمی کمزوری ہے، علم قوت ہے اور جہالت کمزوری ہے، عزم قوت ہے اور بے عزمی کمزوری ہے، صفائی قوت ہے اور غلاظت کمزوری ہے، حسن معاملت قوت ہے اور بدمعاملگی کمزوری ہے، راستبازی اور ایفائے عہد قوت ہے اور دروغگوئی اور عہد فراموشی کمزوری ہے، امانت و دیانت قوت ہے اور بددیانتی و خیانت کمزوری ہے۔ عدل و انصاف قوت ہے اور ظلم و بددیانتی کمزوری ہے، پابندی وقت قوت ہے اور تضیع اوقات کمزوری ہے، اور اسی طرح ہر اچھا خلق قوت ہے اور ہر بداخلاقی کمزوری ہے۔

اب ان دونوں بنیادی باتوں میں متفق ہونے کے بعد اخلاقی قوت کی اہمیت کے بارے میں ایک بڑا اختلاف واقع ہوتا ہے۔ مادہ پرستوں کا گروہ یہ نظریہ رکھتا ہے کہ اخلاقی قوت کو اولیت حاصل نہیں، بلکہ اولیت مادی قوتوں کو حاصل ہے اور قومی بقا کا اصل تقاضا یہ ہے کہ معاشی وسائل اچھے ہوں، صنعتی ترقی کی رفتار تیز ہو، فوجی قوت خوب پھلے پھولے، تجارتی تاخت کا دائرہ وسیع ہو اور ان شعبہ ہائے قوت سے کام لینے کے لئے اخلاق کی جتنی مقدار استعمال کرنا ناگزیر ہو، اسے

استعمال کیا جائے لیکن جہاں حسن اخلاق کی پابندی کرنا بالکل ایک طبعی ضرورت نہ ہو وہاں آزادی عمل سے کام لیا جائے اور ایسے مواقع پر جو طریق کار مناسب ہو اسی کا نام حسن اخلاق رکھ لیا جائے اس گروہ کے نزدیک اجتماعی قوت کا فارمولا یہ ہے۔

مادی قوت + اخلاقی قوت = کل اجتماعی قوت : دوسرا فلسفہ اخلاق جو اسلام نے پیش کیا ہے، اخلاقی قوت کو مادی قوت کے مقابلہ میں اولین اہمیت دیتا ہے، اور وہ اخلاق کو ایک فرض قرار دیتا ہے جس کو پورا کرنے کے لئے جن جن مادی وسائل کی ضرورت ہو ان سب کو اختیار کیا جائے، اس فلسفہ نے اجتماعی قوت کا ایک دوسرا فارمولا پیش کیا ہے:۔

"اخلاقی قوت × مادی قوت = کل اجتماعی قوت"

مثلاً ایک رائفل کی مادی قوت اگر ہم کسی پیمانے سے ماپ سکیں اور اس کو قوت کی ایک یونٹ شمار کریں اور اسی طرح سپاہی رائفل چلانے کی جو تربیت حاصل کرتا ہے اسے فنی قوت کی ۵ یونٹیں قرار دیں، اور پھر اس میں مقصد کے لئے جو فاداری، اور فوجی نظم کی جو اطاعت اور معرکہ میں کودنے کا جو جذبۂ شجاعت پنہاں ہے اسے اخلاقی قوت کی ۱۰ یونٹیں سمجھیں تو مادیین کی رائے میں اس سپاہی اور اس کی رائفل کی قوت سے جو کل اضافہ قوم یا جماعت کے اجتماعی خزانہ میں ہوگا، وہ مادی فارمولے کے تحت یوں محسوب ہوگا:۔

"۱ + ۵ + ۱۰ = ۱۶"

لیکن اسلامی فارمولے کے تحت اس کا حساب دوسرا بنے گا : یعنی :

(۱ + ۵) × ۱۰ = ۶۰

دونوں اخلاقی مدارس فکر کی نگاہ میں اخلاق کی قدر و قیمت کا یہ عظیم الشان فرق ان کے پورے فلسفہ ہائے اخلاق کو ایک دوسرے سے مختلف کر دیتا ہے، نیز ان کے تعمیر اخلاق کے طریقے ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہو جاتے ہیں، یہ بات بہرحال دونوں کے نزدیک قطعی ہے کہ اخلاق خود ایک قوت ہے۔ اس کی اولیت و اہمیت کو ہم آئندہ سطور میں واضح کریں گے اور مادہ پرست ذہنوں پر حقیقت کو واضح کرنے کے لئے اخلاقی قوت کی قدر و قیمت کو مادیت میں تحویل کر کے پیش کریں گے۔

(۸)

اخلاقی قوت کی مادّی قدر و قیمت

اخلاق کی قدریں بجائے خود مادّی نہیں ہیں اور نہ اخلاق کو مادّی پیمانے سے ماپا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک معاشرے کی مادّی قوت کے بنانے اور بگاڑنے میں اخلاقی قوت کا بڑا دخل ہے۔ ایک اچھا اخلاقی ماحول اور ایک برا اخلاقی ماحول اپنے بعض نتائج مادیت کے پہلو سے بھی ظاہر کرتا ہے۔ لہذا یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اخلاقی قوت ایک پہلو سے مادّی قدر و قیمت بھی رکھتی ہے۔

کسی قوم کی مادّی قوت جن عوامل سے بنتی ہے وہ تین ہیں: ۱- ذرائع ۲- سرمایہ ۳- محنت۔ ان تینوں عوامل کا ایک مجموعی نام ہم "ذ س م" تجویز کرتے ہیں۔ مادّی قوت تمام تر نتیجہ ہوتی ہے "ذ س م" سے استفادہ کرنے کا۔ "ذ س م" سے اگر ایک خاص زمانے اور ایک خاص طرح کے حالات میں استفادہ پوری امکانی حد تک ہو تو

یوں سمجھئے کہ ایک قوم کی مادی قوت کی مقدار ۱۰۰ اکائیاں ہوتی ہیں۔ اور اگر ایک خاص طرح کے حالات میں "ذس م" سے استفادہ پورے معیار پر نہ کیا جا رہا ہو تو قوم کی مادی قوت ۱۰۰ اکائیوں سے اتنی ہی کم رہے گی، جتنی کہ استفادہ میں کمی رہ گئی ہو۔

"ذس م" سے کامل استفادہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ افرادِ معاشرہ کی قوتوں کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو، جتنی دماغی یا جسمانی محنت مطلوب ہو اس میں سے کوئی جزء فرض ناشناسی کا شکار نہ ہو، ذرائع اور سرمایے میں خیانت رخنہ انداز نہ ہو، اور حاصلِ استفادہ جو کچھ ہو اس میں سے کوئی جزء خورد برد نہ ہونے پائے۔ اس لحاظ سے سو فیصدی معیار پر "ذس م" سے استفادہ کرنے والے معاشرے منطقی امکان کی حد تک تو ہو سکتے ہیں، لیکن عملاً اس کی مثالیں تاریخ میں مشکل ہی سے ملتی ہیں۔ اور آج جس دور میں سے ہم گذر رہے ہیں اس میں کامل استفادہ کی یہ شرائط بہتر سے بہتر ترقی یافتہ معاشروں میں ۵ فیصدی سے زیادہ پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ گویا موجودہ دنیا کی بہترین اقوام کی مادی قوت اپنے ممکن معیار سے بہت ہی نیچے گری ہوئی ہے۔

مادی قوت کا استعمال قومیں جن ضروریات کے لئے کرتی ہیں اُن میں سے تین بنیادی طور پر اہم ہیں، ایک اپنے افراد کے لئے معاش کا انتظام، دوسرے افراد کے درمیان عدل کا قیام، تیسرے بیرونی تاخت کے مقابلے میں دفاع کا انتظام۔ مادی قوت کے ان سگونہ مقاصد کو ہم "م ح د" کا نام دیتے ہیں۔ ایک قوم کی ساری کی ساری مادی قوت جب اپنا ظہور کرتی ہے تو "م ح د" کے لحاظ سے بھی اس کی حالت معیاری ہو گی۔ لیکن اگر وہ "ذس م" کے میدان میں معیار سے نیچے گر جائے تو اسی تناسب سے وہ "م ح د" کے لحاظ سے بھی پست ہو گی۔ پس جو قوم بھی "م ح د"

کے میدان میں ترقی چاہتی ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ "ذم س" سے استفادہ کرنے میں مطلوبہ معیار تک ترقی کرے۔

"ذم س" سے کسی خاص وقت اور کسی خاص حالت میں جو استفادہ کیا جا رہا ہوتا ہے اس کی مقدار اخلاقی قوت کی کمی بیشی کے مطابق کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ اگر اخلاقی قوت قوم میں کم ہوتی ہے کہ "ذم س" میں کمی کے مطابق زیان (Wastage) واقع ہوتا ہے۔ مثلاً اگر قوم مجموعی طور پر فرض شناسی کے معیار سے نیچے ہو تو اس کے کارکن طاقت میں جمود، تساہل، تغافل اور تضیع اوقات کے اوصاف پائے جائیں گے۔ اسی طرح اگر وہ دیانت کے معیار سے نیچے ہو گی تو اسے خیانت و رشوت جیسے امراض اپنی لپیٹ میں لئے رہیں گے۔ اس طرح کے حالات میں زیان Wastage بہت ہوگا اور "ذم س" سے استفادہ معیاری حد تک نہ ہو سکے گا۔

آئیے ہم اس اجمال کو تفصیل کی حد تک لے جانے کے لئے چند مثالیں اپنے سامنے رکھ لیں۔

فرض کیجئے کہ کسی قوم کے افراد میں احساس ذمہ داری کی کمی ہے۔ اس کے نتیجے میں پابندیٔ وقت کی صفت پیدا نہیں ہو پاتی۔ اس کے کارکنوں کی اکثریت ایسی ہے کہ اپنی ڈیوٹی پر ہمیشہ لیٹ پہنچتی ہے۔ یہ بھی فرض کر لیجئے کہ اوسطاً روزانہ ہر فرد ایک منٹ دیر کر کے اپنے کام پر پہنچتا ہے۔ اب اگر اس قوم کے تمام مرد بالغ افراد کی تعداد جو کسی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت میں آ چکے ہیں، ایک کروڑ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر روز ایک کروڑ منٹ کام کے اوقات میں سے ضائع ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سال میں اس قوم کی ۷ کروڑ ۸ لاکھ ۲۳ ہزار ۳ سو

تینتیس ساعاتِ کار WORKING HOURS اور مزید دو منٹ برباد ہو گئے۔ اگر موجودہ حالات میں اس نقصان کو مالیت میں تحویل کرنے کے لئے اوسطاً ایک ساعتِ کار کی قیمت ۶ آنے فرض کی جائے تو کل قومی نقصان ۲ کروڑ ۲۸ لاکھ ۱۲ ہزار ۴ سو ۹۹ روپے ۴ آنے ۱/۲ ۷ پائی ہوگا۔ یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ ایک قوم اس سے کئی تعمیری کام کر کے "ذم س" کا معیار اونچا کر سکتی ہے۔

لیکن جہاں احساس ذمہ داری کی کمی ہوگی وہاں فرض شناسی کی کمی بھی تو ہوگی۔ وہاں ایک کلرک کام چھوڑ چھوڑ کر گپیں ہانکے گا، وہاں ایک سنتری کھڑا کھڑا سو بھی لیا کرے گا، وہاں ایک انسپکٹر اپنے فرض کو درکنار رکھ کر چائے پینے پر بھی تو وقت صرف کرے گا، وہاں ایک پٹواری سرکاری کام چھوڑ کر اپنی گھوڑی کا معائنہ کرنے میں بھی تو لگ جائے گا۔ اسطرح کی تضیع اوقات کی عادت جس قوم کے کارکنوں میں موجود ہو فرض کیجئے کہ روزانہ اس عادت کا نقصہ ہر فرد کے صرف ۱۵ منٹ ہو جاتے ہیں تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ سال بھر میں اس کی مادی قوت میں ۴۳ کروڑ ۲۱ لاکھ ۸۷ ہزار ۲ سو ۸۹ روپے ۱۲ آنے کی کمی رہ جائے گی اس رقم سے اچھی خاصی جنگ لڑی جا سکتی ہے، اس سے کتنے ہی اسکول، ہسپتال اور لائبریریاں قائم ہو سکتی ہیں اور اس سے ٹیوب ویل لگائے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح اخلاقی پستی جہاں کارفرما ہوتی ہے اور دیانت کی حالت برقرار نہیں رہ سکتی وہاں رشوت جیسی تباہ کن وبا حملہ آور ہو جاتی ہے۔ رشوت ایک فریق کو کسی حق سے محروم کرتی ہے اور دوسرے فریق کو حق سے کچھ زائد دلواتی ہے اور اس ادلا بدلی کے بیچ میں سے ایک خائن اپنی مٹھی گرم کر لے جاتا ہے۔

یعنی اس کی نذر ہو جاتی ہے۔ چھوٹے درجے کی ذمہ داریاں رکھنے والے کارکن چھوٹی مقدار میں رشوت ستانی کرتے ہیں اور بڑے درجے کی ذمہ داریاں رکھنے والے لوگ بڑی تعداد میں ہاتھ رنگتے ہیں۔ دفتروں کے چپراسی، چونگی خانوں کے محرر، پٹواری اور محکمۂ مال کے کارکن، ٹیکس انسپکٹر، کسٹم آفیسر، ریلوے کے گڈس کلرک، جنگلات کے داروغے، جیلوں کے سپرنٹنڈنٹ، علاقوں کے ناظر، سرکاری انجنیئر، ڈاکٹر، حکومت کے سیکرٹری اور وزراء ایک بگڑے ہوئے معاشرے میں "ذس م" سے استفادے کا معیار اپنی خیانت کاریوں کی وجہ سے حد درجہ نیچے گرا دیتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کسی قوم میں ۱۰ لاکھ کارکن اس پوزیشن میں ہیں کہ رشوت ستانی کر سکیں اور ان میں سے ۵ لاکھ عملاً ایسا کرتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی فرض کیجئے کہ اوسطاً کل دست غیب کی آمدنی فی کس ۲۵۰ روپے سالانہ بیٹھتی ہے۔ ریاضی بتاتی ہے کہ خائنوں کا یہ گروہ قوم کے عوام سے ۱۲ کروڑ، ۵۰ لاکھ روپیہ اینٹھ لے جائے گا۔ لیکن یہ گروہ ساڑھے بارہ کروڑ کی یہ رقم جن لوگوں سے وصول کرتے ہیں، بہرحال ان کو ناجائز فائدے اس سے زیادہ بڑی مقدار میں بہم پہنچاتے ہیں اور گھر سے نہیں پہنچاتے، خود قوم کے مشترک خزانے "ذس م" ہی سے پہنچاتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ان ناجائز فوائد کی مقدار اس "مختانے" سے صرف تین گنی ہے۔ تو مجموعی زیاں (Wastage) ۵۰ کروڑ روپے ہوگا۔ اندازہ کیجئے کہ ۵۰ کروڑ روپے سے کتنے صنعتی کارخانے کھولے جا سکتے ہیں اور غیر ممالک سے کتنی بڑی مشینری خریدی جا سکتی ہے۔

پھر جہاں رشوت پھیل جاتی ہے وہاں حکومت کو اپنے کارکنوں کی غیر معمولی نگرانی کرنے کے لئے طبق بر طبق عملہ مقرر کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے گراں بہا مصارف کا بار

بھی قوم کی مادّی قوت کے خزانے ہی پر پڑتا ہے۔

علاوہ بریں رشوت اور خیانت سے حاصل کیا ہوا روپیہ جب ایک خائن کے پاس پہنچتا ہے تو اس کی قدر و قیمت وہ نہیں ہوتی جو حلال طریق سے محنت کر کے کمائے ہوئے روپے کی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اب روپیہ حقیقی ضروریات پر صرف ہونے کے بجائے بالعموم اسراف، عیاشیوں اور تفریحات میں ... اڑایا جاتا ہے۔ یہ سب زیاں آخر کار "ذس م" کے قومی مجموعے ہی پر جا کر پڑتا ہے۔

یہی خیانت کارکنوں میں یہ بیماری بھی پیدا کرتی ہے کہ وہ جس حکومت، فرم یا ادارے کی ملازمت کرتے ہیں اس کے املاک کی حفاظت میں کوتاہی کرتے ہیں۔ حفاظت ہی میں کوتاہی نہیں کرتے ان کو بے دردی سے استعمال کرتے ہیں، بلکہ ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے، نجی اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں، ہاتھ لگے تو کچھ نہ کچھ مال اڑا ہی لے جاتے ہیں، سفر خرچ اور مختلف بلوں کی رقوم اصل صرف سے زیادہ وصول کرتے ہیں۔ اگر اس طرح کے زیاں (Wastage) کو کسی قوم کے ایک کروڑ افراد پر اوسطاً ایک روپیہ ماہانہ کے لحاظ سے پھیلا دیا جائے تو مجموعی رقم ۱۲ کروڑ روپے بنے گی۔ ۱۲۰ کروڑ روپے سے ایک قوم کئی نئی سڑکیں اور پل اور نہریں بنا سکتی ہے۔

جس قوم میں اخلاق کا معیار پست ہوتا ہے اور قانون کے سوا کوئی مؤثر عامل باہمی معاملات میں کام کرنے والا نہیں ہوتا اس میں ہمیشہ مقدمہ بازی زیادہ ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی حق ماری عام ہوتی ہے اور پھر حق رسی کے لئے بھی اور قانون کے ذریعے مزید حق ماری کرنے کے لئے بھی عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار رہتی

ہے - ایک ملک کی عدالتوں کے سامنے اگر اخلاقی پستی کی وجہ سے حدِ اعتدال سے ایک لاکھ مقدمات زیادہ آئیں اور ہم یہ سمجھیں کہ اوسطاً ۵ افراد ہر مقدمے کی لپیٹ میں آئے اور اوسطاً ہر فرد کے ۴ ایام کار ضائع صرف ہوئے تو ۲۰ لاکھ ایام کار ضائع ہوں گے جن کی قدر و قیمت موجودہ دور میں ۶۰ لاکھ روپے ہوگی۔ اور پھر ہر مقدمے پر اگر اوسطاً ۵۰۰ روپیہ صرف بیٹھے - تو نقصان کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس اگر کسی قوم کی معاشرت بگڑ جائے اور اس میں صنفی آوارگی اور اختلاطِ صنفین کی وبا پھیل جائے تو نتیجۃً فکری و ذہنی انتشار عام ہو چکا ہے۔ یہ فکری و ذہنی انتشار ایک طرف آرام کے اوقات میں طبائع کے سکون کو غارت کر کے نفسیاتی اور جسمانی صحت کو تباہ کرتا ہے اور دوسری طرف قوم کے کارکنوں کو اپنے فرائض پر پوری توجہ منعطف رکھنے نہیں دیتا۔ نہ جانے کارکنوں کے کتنے لمحے نظر بازی میں صرف ہو جاتے ہیں، دماغوں کی کتنی قوتیں رومانس کے نقشے سوچنے میں کھپ جاتی ہیں اور کتنے نازک موقعوں پر حاضر دماغی کی حالت غائب ہو جاتی ہے۔

کیا اس سے فرائض مفوضہ مجروح نہیں ہوتے؟ یقیناً ہوتے ہیں ——— پھر اگر یوں فرض کیا جائے کہ کسی قوم کے ایک کروڑ کارکنوں کا جو وقت رومانوی تصورات کی سرمستی اور حاضر دماغی سے محروم رہنے کی حالت میں کھپ جاتا ہے وہ اوسطاً یومیہ ۱۰ منٹ بھی ہوتا ہے تو سال بھر کے زیاں وقت کی مالیت ۶ آنے فی ساعت کار کے حساب سے ۲۲ کروڑ ۸۱ لاکھ ۲۴ ہزار ۹ سو ۹۹ روپے ۲ آنے ہوگی۔ قومی کاجو اضمحلال خود افراد کے اپنے حصے میں آئے گا وہ مزید برآں۔ اور صنفی آوارگی کی فضا میں گھروں کا سکون لٹنے سے ۰ ہجر و وصال اور رقابتوں کے جھمیلوں کی وجہ سے

اور ناچاقیوں اور طلاقوں کی بھرمار ہو جانے سے افراد کی نفسیاتی صحت جو اختلال پذیر ہو گی اور اس کے نتیجے میں جو جسمانی صحت اور صلاحیتِ کارکردگی برباد ہو گی اس کا حساب لگانے کے لئے کوئی طریقہ نہیں ہے۔

پھر اخلاقی معیار کی پستی کے دوسرے معنی ایک معاشرے کے لئے یہ ہیں کہ اس کے اندر ظلم و استحصال پایا جائے۔ ظلم و استحصال کا فطری اثر یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی ظالم و مظلوم طبقات میں بٹتی ہے اور مظلوم طبقے کا اضطراب انقلابات کا محرک بنتا ہے۔ انقلابات کا عمل لازماً تخریبی ہوتا ہے، چنانچہ ایک انقلاب کا واقع ہونا بسا اوقات "ذبن م" پر اتنا تباہ کن اثر ڈالتا ہے کہ یہ کمی پھر کئی سال میں پوری نہیں ہوتی۔ اگر انقلاباتِ عالم کی مادی تباہ کاریوں کا کوئی حساب لگانا ممکن ہوتا تو آپ یہ معلوم کر کے حیران رہ جاتے کہ انسان نے اپنے ہاتھوں زندگی کی جو متاع برباد کی ہے وہ اتنی زیادہ ہے کہ پورے کرۂ ارضی کی آبادی اگر بغیر محنت کئے اس مجموعی برباد شدہ دولت پر گذر کرنا چاہتی تو اس کے کئی سال آرام سے گذر جاتے۔

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اخلاقی قوت کے کم یا بیش ہونے سے ایک قوم کی مادی قوت پر کیا اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اخلاقی قوت کی کمی کتنے بڑے پیمانے پر زیان (Wastage) کا موجب ہو سکتی ہے۔ ایک قوم اپنے "ذبن م" کی ایک مقرر حالت سے اخلاقی قوت کے درجۂ کمال پر ہونے کی صورت میں جو استفادہ کر سکتی ہے، اخلاقی قوت کی کمی اسے بے حد کم کر کے رکھ دیتی ہے۔ اخلاقی قوت کی کمی لازماً مادی قوت کو کم کر دیتی ہے اور مادی قوت کی کمی کی وجہ سے "دفاع، معاش اور عدل" کا معیار بھی لازماً گر جائے گا۔

اگر کسی خاص حالت میں کسی قوم کے "ذ س م" کو ہم ۱۰۰ فرض کریں، اور اس کی اخلاقی قوت (ا ق) کو بھی ۱۰۰ شمار کریں تو ان دونوں عناصر کے باہمی تعامل سے جو مادی قوت حاصل ہو گی وہ آخری امکانی معیار کمال پر ہو گی۔ دوسرے لفظوں میں "م ع د" بھی انتہائی معیار کمال پر جا پہنچے گا۔ فرض کیجئے کہ اپنے کمال کی حالت میں "م ع د" کی قدر بھی ۱۰۰ قرار پاتی ہے۔

یعنی :- (۱۰۰ "ذ س م") × (۱۰۰ ا ق) = ۱۰۰ م ع د

پس :- (۱۰۰ " ") × (" " ۱۰) = ۱۰ م ع د

اور :- (۱۰۰ " ") × (" " ۵) = ۵ م ع د

اگر "ذ س م" "ا ق" اور "م ع د" کے متعلق ہمارا یہ فارمولا صحیح ہے تو پھر یہ حقیقت خود بخود نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ایک قوم ایک خاص حالت میں "ذ م س" کی جو مقدار رکھتی ہے اس میں وہ اس حالت میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی۔ وہ تو بس جو کچھ ہے، ہے! لیکن "ا ق" کا میدان ایسا میدان ہے کہ جس میں دوسری قوموں کے مقابلے میں مسابقت کا کھلا میدان پڑا ہے۔ اس کے لئے آگے بڑھنے کا موقع بہت وسیع ہے۔

مادہ پرست قوموں کی جتنی توجہ "ذ س م" پر رہتی ہے اس کے مقابلے میں دسواں حصہ بھی "ا ق" پر منعطف نہیں ہوتی۔ حالانکہ اگر دونوں طرف توجہ برابر برابر دی جائے تو حیرت انگیز نتائج خود مادی قوت کی ترقی کے لحاظ سے نمودار ہو سکتے ہیں۔

یہ مبالغہ نہ ہو گا اگر "ا ق" کو خود ایک عامل پیدا آوری اور عامل ترقی مانا جائے۔ آخر آج بھی تنظیم Management کو عوامل پیدائش میں شمار کیا جاتا ہے، مگر

سوچنے کی بات یہ ہے کہ تنظیم صرف ایک ٹیکنیکل عمل کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی میں نظم کی بنیاد خود اخلاقی حاسّے پر ہے۔ خالی ٹیکنیکل تنظیم تو نظم کا ایک نامکمل معیار پیش کرتی ہے۔ تنظیم کی کامل صورت اگر پیدا کی جا سکتی ہے تو "ق" کے ذریعے پیدا کی جا سکتی ہے۔

نظم تعاون کا تقاضا کرتا ہے، نظم اتحاد چاہتا ہے، نظم ایثار کا متقاضی ہے، نظم تقسیم حقوق و فرائض کو لازم ٹھہراتا ہے، نظم تقسیم کار چاہتا ہے، نظم احساس ذمہ داری کی اساس پر چلتا ہے ——— اور یہ ساری ہی چیزیں اخلاق کے زیرِ عنوان آتی ہیں۔ پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ کام کی رفتار اور کام کا معیار بنانے میں انسانیت کے اچھے اور پاکیزہ جذبات نے ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے۔ کسی اصول پر عقیدہ و ایمان اور کسی مقصد کی والہانہ محبت نے ہمیشہ انسانی محنت (Labour) کا معیار اونچا کیا ہے۔ ان وجوہ سے ہم حق بجانب ہیں کہ اپنے نظریۂ معیشت اور اپنے نظریۂ ترقی میں اخلاق کو ایک موثر عامل کی حیثیت سے جگہ دیں۔

پاکستان جیسے ملک کو سامنے رکھ کر جب ہم تعمیر قوت کے مسئلے پر غور کرتے ہیں تو اسے ماننے بغیر چارہ نہیں کہ جہاں تک "ذ س م" کا تعلق ہے، ہم جس معیار پر آج ہیں اس میں فطری ارتقا تو ہوگا، لیکن اس سے جست لگا کر معاً ایک نئی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ اور مجرد "ذ س م" کا فطری ارتقا اپنی جو زیادہ سے زیادہ رفتار پیدا کر سکتا ہے اس میں ہم ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے میں کبھی بھی آگے نہیں بڑھ سکتے کیونکہ اس لحاظ سے وہ جتنی پیش پیش اب ہیں اپنی فطری رفتار سے وہ آگے بڑھتی ہوئی اتنی ہی پیش پیش رہیں گی۔ ان قوموں سے

مسابقت کرنے کے لئے اگر ہم کوئی کامیاب تدبیر اختیار کر سکتے ہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ "ذ س م" سے استفادہ کے معیار کو جو دوسری قوموں سے بھی پست واقع ہوا ہے تیزی سے اونچا اٹھائیں۔ اس کے لئے واحد راستہ یہ ہے کہ ہم "ا ر ق" کے میدان میں زیادہ سے زیادہ آگے قدم رکھنے کی کوشش کریں۔ دوسری قوموں کا "ذ س م" کا معیار ضرور اونچا ہے مگر ان کا "ا ر ق" کا معیار ایک خاص پست مقام پر رکا ہوا ہے۔ ہمارا "ذ س م" کا معیار پست ہے اور "ا ر ق" ان کے مقابلے میں اگر کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں، لیکن ہم اس کو اونچا اٹھا کر بازی جیت سکتے ہیں۔ آپ کسی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ قوم کے حالات کو اپنے فارمولے کی روشنی میں دیکھیں اور اور پھر موجودہ حالت اور آئندہ کے امکانات کا اندازہ کریں تو آپ کا زریں مستقبل آپ کے سامنے پوری طرح چمکنے لگے گا۔

مثلاً امریکہ کے "ذ س م" کو آپ اگر ۱۰۰ فرض کریں اور اپنے "ذ س م" کو ۵، اور اسی طرح اس کے ہاں کے "ا ر ق" کے معیار کو ۱ فرض کریں اور اپنے ہاں کے "ا ر ق" کے معیار کو ۸ تو موجودہ صورت میں مادی قوت کا تقابل یوں ہوگا۔

امریکہ:- ۱۰۰ "ذ س م" × ۱ "ا ر ق" = ۱۰ "م ر ح د"

پاکستان:- ۱۰ " " " × ۸ " " = ۸۰ " " " "

اب فرض کیجئے کہ امریکہ "ا ر ق" کے موجودہ معیار کو برقرار رکھتا ہے (کیونکہ یہ پہلو مادہ پرست اقوام کی نگاہوں میں غیر اہم ہے) اور آئندہ دس سال میں وہ "ذ س م" کو سوا گنا کر لے جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر پاکستان بھی "ذ س م" کے میدان میں مادہ پرستانہ خطوط پر اتنی ہی ترقی کر جائے تو تفاوت پہلے سے بڑھ جاتا ہے۔

یعنی یوں ہوگا کہ:-

امریکہ:- ۱۲۵ "ذ س م" × ۱۰ "ل ر ق" = ۱۲۰۵ "م ر ع د"

پاکستان:- ۱۲۶۵ 〃 〃 × ۸ 〃 = ۱ 〃 〃

لیکن بخلاف اس کے اگر پاکستان "ذ س م" میں ارتقاء کرنے کے ساتھ ساتھ "ل ر ق" میں تیزی سے بڑھے (جبکہ اس کے لئے وہ سرو سامان رکھتا ہے) اور وہ "ل ر ق" کا معیار کم سے کم ۵۰ تک لے جائے تو اندازہ کیجئے کہ نتیجہ کیا ہوگا:-

امریکہ:- ۱۲۵ "ذ س م" × ۱۰ "ل ر ق" = ۱۲۶۵ "م ر ع د"

پاکستان:- ۱۲۶۵ 〃 〃 × ۵۰ 〃 = ۶۶۲۵ 〃 〃

لیکن واقعات کی رفتار گواہی دے رہی ہے کہ مغربی اقوام کا "ل ر ق" کا معیار روز بروز گر رہا ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مزید دس سال میں امریکہ "ل ر ق" کے لحاظ سے ۱۰ سے گر کر ۷ پر آ رہے گا۔ یعنی "م ر ع د" کا معیار ۸۷۵ کی سطح پر آ رہے گا۔ اور اگر پیش آئند جنگِ عظیم فرض کیجئے کہ امریکہ کے "ذ س م" کو ایک سخت دھچکا لگا دے اور وہ ۱۰۰ سے بڑھ کر ۱۲۵ تک پہنچنے کے بجائے الٹا ۸۰ تک آ گرے تو "م ر ع د" کے لحاظ سے اس کی پوزیشن کُل ۵۶۰ رہ جائے گی۔ درآنحالیکہ پاکستان ۶،۲۲۵ کے معیار پر جا پہنچے گا۔

اسی طرح آپ انڈیا کو ایک ایسی طاقت سمجھتے ہیں جس سے آپ کی مادّی مسابقت اوّلیں اہمیت رکھتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ "ذ س م" کے لحاظ سے وہ آپ کے مقابلے میں ۵ گنا آگے ہے۔ اور مجرد اس میدان میں جس رفتار سے آپ آگے بڑھیں گے اس سے زیادہ تیز رفتار سے انڈیا ارتقا کرے گا۔ آیئے تجزیہ فارمولے

کی روشنی میں موجودہ حالت کا جائزہ لیجئے۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ اس وقت پاکستان "ذ س م" کے لحاظ سے ۱۰۰ درجے پر ہے - اور انڈیا اسی تناسب سے ۵۰۰ درجے پر اور "ا ر ق" کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں - اب پوزیشن یہ ہوگی:-

پاکستان :- (۱۰۰ "ذ س م") × (۸ "ا ر ق") = ۸ "م ح د"

انڈیا :- (۵۰۰ " " ") × (" ۸) = ۴۰ "م ح د"

اب اگر دونوں کے دونوں ایک مادہ پرست قوم کی حیثیت سے آئندہ پانچ سال میں ساری توجہ "ذ س م" کے اضافے پر صرف کرکے ۵۰ فیصدی ترقی کر جائیں اور "ا ر ق" کا معیار بحال رہے تو پوزیشن یہ ہو جائے گی :-

پاکستان :- (۱۵۰ "ذ س م") × (۸ "ا ر ق") = ۱۲ "م ح د"

انڈیا :- (۷۵۰ " " ") × (" " ") = ۶۰ " " "

کیا اس دوڑ میں کبھی بھی پاکستان انڈیا سے آگے نکل سکتا ہے ؟ ——

لیکن دوسری طرف اگر وہ "ذ س م" میں انڈیا کے ساتھ مساویانہ مسابقت کرتے ہوئے "ا ر ق" کے معیار کو بلند کرنے پر پوری توجہ صرف کر دے اور اس پہلو میں جو وسیع گنجائش موجود ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پوزیشن کو ۵ گنا تک مضبوط کر جائے تو دونوں کی تقابلی حیثیت یہ ہو گی :-

پاکستان :- (۱۵۰ "ذ س م") × (۴۰ "ا ر ق") = ۶۰ "م ح د"

انڈیا :- (۷۵۰ " " ") × (" " ۸) = ۴۰ " " "

صاف ظاہر ہے کہ آپ کے لئے اس مسابقت کی بازی کو جیتنے کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ آپ "ا ر ق" میں تیزی سے آگے بڑھیں !

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان "ارتق" میں اتنی ترقی کر سکتا ہے تو انڈیا یا امریکہ بھی تو اسی رفتار سے کر سکتا ہے۔ پھر یہ آگے نکل جانے کا خواب کیسے پورا ہوگا؟ منطقی امکان کے لحاظ سے یہ سوال بڑا وزن دار ہے۔ مگر عملی امکانات کے لحاظ سے بے بنیاد ہے۔ مادہ پرست نظام زندگی میں "ارتق" کبھی بھی ۵، ۷، ۱۰ فیصدی سے زیادہ اونچا نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ بخلاف اس کے پاکستان میں ایک خداپرستانہ نظام تہذیب کے فروغ کے لئے سروسامان موجود ہے اور خداپرستانہ تہذیب انتہائی تیزی سے "ارتق" کا معیار بلند کر سکتی ہے۔

دراصل یہی وہ فارمولا تھا جس نے اہل بدر کی قلتِ تعداد و وسائل کو مشرکین مکہ کی کثرتِ تعداد و وسائل پر غالب کر دیا۔ آج بھی ہمارے لئے اس فارمولے کو قبول کرنے کے سوا کوئی بھی طریقہ اقوام عالم سے مسابقت کرنے کا نہیں ہے۔

(۹)

اخلاقی قوت پیدا کرنے والے بنیادی عوامل

ہم اپنے اندر اخلاقی قوت کیسے بلند کر سکتے ہیں، اس کی تدبیر کیا ہے؟

اخلاقی قوت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے کہیں سے درآمد کیا جا سکے، جیسے کسی بازار سے خریدا جا سکے، جیسے کسی کھیت میں اگایا جا سکے، جیسے کسی کارخانے میں تیار کیا جا سکے۔ یہ تو محض ایک شعور کا حاصل اور ایک ذہنی بیداری کا نتیجہ ہے۔ اخلاقی قوت کے سوتے احساس ذمہ داری کے اندر پھوٹتے ہیں۔ احساس ذمہ داری ایک

معاشرے کے افراد میں جتنے وسیع پیمانے پر پھیلے گا، وہ جتنا زیادہ گہرا اور جتنا زیادہ ہمہ گیر ہوگا اخلاقی قوت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ احساس ذمہ داری ہی وہ چیز ہے جو جذبات کو متحرک کرتا ہے اور جذبات ایک حرکتی قوت Mogive Porce بن کر انسانی قویٰ کو پوری طرح بر سر عمل لاتے ہیں۔ احساس ذمہ داری ہی وہ طاقت ہے جو آدمی کو اپنی خواہشات پر قابو رکھنا اور فرض کا احترام کرنا اور اپنے متعینہ حقوق کو پہچاننا اور اپنی حدود کا لحاظ کرنا سکھاتی ہے۔ احساس ذمہ داری ہی وہ نگراں ہے جو خلوت و جلوت میں افراد انسانی کو خیانت سے بچا سکتا ہے۔ احساس ذمہ داری ہی ضمیر کے چراغ کا روغن ہے کہ جب تک یہ جلتا رہتا ہے، زندگی اندھی نگری نہیں بنتی!

انسان میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلا عامل وہ نظریۂ زندگی ہے جس کو وہ اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ نظریہ ہائے حیات میں سے جس واحد نظریے نے انسانیت کو احساس ذمہ داری کی سب سے زیادہ مقدار سے آراستہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ساری دنیا ایک خدا کی بنائی ہوئی ہے، انسان اس کا بندہ و خلیفہ ہے، اس کی یہ زندگی ایک امتحانی زندگی ہے اور اسے ایک دن اپنے خدا کے سامنے اپنے کارنامۂ زندگی کا حساب پیش کرنا ہے۔ دوسرے نظریات زندگی میں سے بعض ایسے ہیں جو بالکل محدود سا احساس ذمہ داری پیدا کرتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ سرے سے اس کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

احساس ذمہ داری پیدا کرنے والا دوسرا بڑا عامل مقصد زندگی ہے۔ مقصد زندگی جتنا بلند اور وسیع ہوگا، آدمی میں احساس ذمہ داری اتنا ہی زوردار ہوگا۔ مثلاً ایک شخص جس کا مقصد زندگی اپنی خواہشات پوری کرنا ہے اس کے اندر احساس ذمہ داری کم ہے

کم معیار پر رہے گا۔ اس کے مقابلے میں جس شخص کے سامنے اپنے خاندان اور قبیلے کے مفاد کی خدمت کا مقصد ہے وہ نسبتہً زیادہ ذمہ دار ہوگا۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر جو شخص قوم اور وطن اور نسل کی برتری کو اپنا نصب العین بنا کر زندگی بسر کرتا ہے وہ احساس ذمہ داری کے لحاظ سے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص پوری انسانیت کی فلاح کے لئے اپنی زندگی کی بازی لگاتا ہے تو اس کا احساس ذمہ داری پورے معیار پر پہنچ جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو اگر ہم یوں سوچیں کہ ایک شخص اپنے نفس کی رضا کے لئے کام کرتا ہے، دوسرا قوم کی رضا کے لئے کام کرتا ہے اور تیسرا اپنے خالق کی رضا کے لئے کام کرتا ہے تو علی الترتیب ان کا احساس ذمہ داری ایک دوسرے سے بڑھا ہوا ہوگا۔

احساس ذمہ داری پیدا کرنے والا تیسرا بڑا عامل محاسبہ کا احساس ہے۔ یعنی اگر ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ اپنے کسی عمل کے لئے کسی کے سامنے حساب دینے پر مجبور نہیں ہے تو اس میں احساس ذمہ داری بقدر صفر ہوگا۔ اور اگر ایک شخص اپنے آپ کو فقط قانون اور حکمراں کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے تو وہ اول الذکر سے زیادہ چوکنا رہے گا۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر جو شخص قانون کے ساتھ ساتھ رائے عام اور جمہور قوم کے روبرو اپنے آپ کو جوابدہ محسوس کرتا ہے اس کا احساس ذمہ داری ثانی الذکر سے بھی زیادہ ہوگا۔ لیکن ان تینوں کے مقابلے میں اگر ایک چوتھا شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ قانون اور معاشرے ہی کے سامنے جوابدہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جوابدہ ہے تو اس کا احساس ذمہ داری اپنے سو فیصدی معیار پر جا پہنچے گا۔ قانون اور حکمراں اور معاشرہ تو افراد کے بہت سے بے شمار اعمال سے بے خبر بھی رہتے ہیں اور ان کو دھوکا بھی دیا جا سکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اعمال تو اعمال سینوں کے رازوں تک کا بھی جاننے

والا ہے ، اور جلوت تو جلوت، خلوت کے کارہائے دیگر سے بھی باخبر ہے، پھر اس میں گرفت کرنے کی پوری قوت بھی ہے۔ لہٰذا اس کے سامنے جوابدہی کا احساس آدمی کو آخری حد تک ذمہ دار بنا دینے والا ہے۔

احساس ذمہ داری پیدا کرنے والا چوتھا بڑا عامل کسی اخلاقی ضابطے کا شعور ہے۔ انسان میں اگر خیر و شر کی تمیز کی جبلی حس موجود نہ ہوتی اور وہ بھلائی اور برائی کی تقسیم نہ کر سکتا، تو اس کے اندر احساس ذمہ داری کا نمودار ہونا ممکن نہ تھا۔ خیر و شر کی تمیز کی جبلت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی اخلاقی ضابطہ انسان کے سامنے رہے۔ اور اخلاقی ضابطہ کا موجود ہونا خود احساس ذمہ داری کو تقویت دیتا ہے۔ مگر اخلاقی ضابطوں کی مختلف نوعیتیں ہیں اور ہر نوعیت کا اثر احساس ذمہ داری پر مختلف مراتب کے ساتھ پڑتا ہے۔ اخلاقی ضابطے کی نوعیت ایک تو اس لحاظ سے متعین ہوتی ہے کہ اس کے پیچھے اتھارٹی کیا ہے؟ اگر یہ اتھارٹی ایک شخص واحد ہے جو بالجبر حکمران بن گیا ہے تو اس کے لئے کم سے کم درجے کا احترام پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر یہ اتھارٹی جمہور یا نمائندگان جمہور ہیں تو اس کے لئے احترام کسی قدر زیادہ ہو جائے گا۔ اگر یہ اتھارٹی خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ تو اس کے لئے احترام کامل نمودار ہوگا۔ پھر ضابطہ اگر ایسا ہے کہ اس میں آئے دن تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور اس کی کوئی قدر مستقل نہیں ہے تو اس صورت میں اس کا وہ وقار نہیں ہوگا جو مستقل قدریں رکھنے والے اخلاقی ضابطے کا ہو سکتا ہے۔ جس ضابطے کے بارے میں انسانی شعور یہ ہو کہ یہ ہمارا اپنا بنایا ہوا ہے اور ہم ہر وقت اس میں رد و بدل کر سکتے ہیں وہ کبھی بھی ایک ناقابل شکست احساس ذمہ داری پیدا نہیں کر سکتا۔ پھر ایک تیسرا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ احساس ذمہ داری کو درجۂ کمال تک پہنچانے

والا اخلاقی ضابطہ ہو سکتا ہے جس کے اتباع کو ایک "مقدس فرض" کی حیثیت سے انسان اختیار کرے، لیکن اگر معاملہ صرف "افادیت" کی حد تک رہ جائے تو اس کے بارے میں احساس ذمہ داری بالکل بودا سا ہوگا۔ افادیت جب ایک ضابطے کی قدر و قیمت بنانے والی ہوتی ہے تو بسا اوقات جب ایک فرد اس آزمائش میں گھر جاتا ہے کہ قریبی فائدے اور دور کے فائدے میں سے یا ذاتی فائدے اور اجتماعی فائدے میں سے اسے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کا احساس ذمہ داری شکست کھا جاتا ہے۔

اخلاقی قوت کو بنانے والے یہ چاروں عوامل اپنی کامل شکل میں ہمیں اسلام فراہم کرتا ہے۔ کرنے کا کام جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ان عوامل کو میدان عمل میں لایا جائے اور ان کو معاشرے پر پوری طرح اثر انداز ہونے کے لئے وسیع مواقع مہیا کر کے دیئے جائیں۔ ان عوامل کو نظام تعلیم کے اعضائے رئیسہ بنا دیا جائے، ان عوامل کو سیاسی اور معاشرتی تنظیموں میں فعال عنصر بنایا جائے اور ان عوامل کو مجلسی سرگرمیوں میں کام کرنے کے لئے متحرک کر دیا جائے۔

یہی ایک راستہ ہے حقیقی ترقی کا، ورنہ اس پہلو سے ترقی کئے بغیر اگر محض مادی قوت کے بنانے کو قومی تعمیر کے لئے کافی سمجھا گیا تو آج جو قومیں ہم سے آگے ہیں ان کے مقابلے میں ہمارے لئے آئندہ سو سال میں بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ان سے آگے بڑھنا تو کجا، ان کے ہم پلہ ہی بن سکیں۔ اس کا ایک ثبوت ترکیہ کی تاریخ ہے۔ جدید ترکیہ ایک تہائی صدی سے مادہ پرستانہ طرز پر اپنے آپ کو بنانے میں لگا ہوا ہے مگر اتنی لمبی جدوجہد کے بعد بھی وہ دنیا کی پہلے اور دوسرے درجے کی قوموں کے ہم دوش نہ ہو سکا۔ اگر آئندہ بھی نظریۂ زندگی، مقصد زندگی اور اخلاقی ضابطے کے پہلو سے وہ سبقت

سے جانے کا اہتمام نہیں کرے گا تو مزید دو سو سال کی محنت بھی اسے بڑی بڑی مادہ پرست اقوام کے ہم پہلو نہیں بنا سکتی۔

قوموں میں زندگی کی حرارت اگر پیدا ہوتی ہے، ان کے اندر سے ایجاد کے سوتے اگر پھوٹتے ہیں، ان کی رگوں میں تازہ خون اگر دوڑتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ وہ کسی نظریۂ حیات، کسی بلند نصب العین اور کسی برتر اخلاقی ضابطے کو لے کے اٹھتی ہیں۔ یہ نہیں تو پھر نہ صنعت ترقی کرتی ہے، نہ دماغ اور نہ داخلی امن و انصاف!

پاکستان جو زندگی کی تعمیر نو کا آغاز کرنے والا ہے، اگر اسی لمحے اس حقیقت کو پلے تو اس پر ترقی کے وہ دروازے کھل سکتے ہیں جو آج تک کسی پر نہیں کھلے۔ ورنہ وہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک ترکیہ بن کے رہ جائے گا۔

(۱۰)

جماعتِ اسلامی کا تعمیری پروگرام

جماعت اسلامی روزِ اول سے یہی مقصد لے کر اٹھی ہے کہ اسلام کے نظریۂ زندگی، اسلام کے دیئے ہوئے مقصدِ حیات اور اسلام کے پیش کردہ ضابطۂ اخلاق کی بنیادوں پر پہلے اپنی قوم اور پھر پوری انسانیت کی فلاح کا فریضہ سرانجام دے۔ اسی مقصد کے تقاضے سے وہ سیاسی ہنگاموں سے الگ رہ کر کئی سال اپنی داخلی تعمیر میں مصروف رہی یہی مقصد تھا جس کے پیش نظر اس نے جماعتی تنظیم کے مروجہ نقشوں اور سیاسی تحریکوں کے سطحی نمائشی اور جذباتی مظاہروں کو ترک کر کے ٹھیک اسلامی تنظیم اور اسلامی اندازِ تحریک کو اختیار کیا۔ یہی مقصد تھا جس کے لئے اس نے توسیع کے مقابلے میں ہمیشہ استحکام کو ترجیح دی۔

پھر بھی وہ مقصد تھا جس کو سامنے رکھ کر وہ ہر مرحلے میں قوم کے سامنے اسلامی اخلاقیات کی پابندی کے ساتھ اپنا وقتی فرض ادا کرتے ہوئے شہادت حق دیتی رہی۔ اور قوم کے سامنے عملاً یہ واضح کرتی رہی کہ ایک مسلمان کا طرز عمل کسی معاملے میں کیا ہونا چاہئے۔ پھر جماعت کا یہی وہ مقصد تھا جس نے ہر مرحلے میں جہاں ایک طرف قوم کے واقعی اسلام پسند اور صالح اور با اخلاق عناصر کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے وہاں اسلام سے بے نیاز اور اخلاقی حس سے محروم عناصر کو دور دھکیل دیا ہے۔

یہ ایک مختصر سا گروہ ہے جس کے سامنے قوم کی اخلاقی حالت کا یہ افسوسناک نقشہ ہے کہ ہزار آدمیوں میں سے بمشکل ایک آدمی ایسا ملتا ہے جو کیرکٹر کا پختہ ہو، بقیہ اکثریت وہ ہے جسے آزمائش کا ہر لمحہ ایک بے رحم کسوٹی بن کر کھوٹا کر کے پرے پھینک دیتا ہے۔
اخلاقی تعمیر و اصلاح کا لمبا اور ادق کام کرنے کے لئے یہ طاقت میدان عمل میں موجود ہے لیکن یہ صورت حال بڑی ہولناک ہے کہ اصلاح کرنے والے اس قلیل گروہ کے مقابلے میں جان بوجھ کر قوم میں اخلاقی بگاڑ پیدا کرنے اور بگاڑ پیدا کر کے وقتی طور پر ناجائز فائدے اٹھانے والوں کی بہتات ہے۔ ہم اگر بھلائی کے فروغ کے لئے دس کی تعداد میں نکلتے ہیں تو برائی کے خادم سیکڑوں کی تعداد میں پھیل جاتے ہیں، ہم اگر معروف کی دعوت دینے کے لئے ایک روپیہ صرف کرتے ہیں تو منکر کے سرپرست اس دعوت کو بے اثر بنانے والے ہنگاموں میں ہزاروں کے وارے نیارے کر دیتے ہیں، ہم اگر تعمیر اخلاق کے لئے کچھ سامان فراہم کرتے ہیں تو قومی اخلاق کی تخریب کرنے والے اس سے بیس گنا زیادہ ذرائع و وسائل کے ساتھ آموجود ہوتے ہیں۔

یہ حالات بہت آزما ضرور ہیں، مایوس کن نہیں ہیں۔ ہمیشہ ہر اصلاح پسند طاقت

کو یہی حالات پیش آئے ہیں۔ اور اصلاح کی صبح جب بھی نمودار ہوتی ہے اسی قسم کی طبق بر طبق تاریکیوں کا سینہ چیر کر نمودار ہوتی ہے۔ ان کو ہم یہاں اس لئے واشگاف طور پر سامنے رکھ رہے ہیں کہ قوم کے جو افراد اجتماعی زندگی کی فلاح سے واقعی ہمدردی رکھتے ہوں اور جن کے دلوں میں درحقیقت عوام کے لئے کوئی خیر خواہی موجود ہو وہ اپنی ذمہ داریوں کا کچھ احساس کریں۔

ضرورت دو چیزوں کی ہے:

ایک یہ کہ جن لوگوں کی نگاہ میں قوم کی اخلاقی صحت کو بچانے کی کچھ بھی اہمیت ہو وہ آگے بڑھیں اور اس واحد منظم تحریک کا ساتھ دیں جو تعمیر اخلاق کا پروگرام اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ خصوصیت سے حساس نوجوانوں کو اس ذمہ داری کے لئے اپنے کندھے پیش کرنے چاہئیں۔ قوم کے اندر بڑے پیمانے پر اگر ایک منظم طاقت اس پر تُل جائے کہ وہ بداخلاقی کے سرچشموں کا سدِ باب کر کے دم لے گی اور اجتماعی زندگی کو ہر اخلاقی روگ سے پاک کر کے چھوڑے گی تو مفاسد کا فروغ رُک سکتا ہے۔ جماعت اسلامی کو ہر مرحلۂ کار سے گزرنے پر نئے کارکن برابر ملے ہیں اور تازہ انتخابی مہم سے گزرتے ہوئے بھی اس کی قوت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے، لیکن حالات اس سے بھی زیادہ قوت کے متقاضی ہیں۔

دوسرے یہ کہ قوم میں ایسی رائے عام اور خیر و شر کا اتنا شعور پیدا ہو جانا چاہیئے کہ وہ خود یہ پہچاننے لگے کہ اس کی واقعی بھلائی چاہنے والے کون لوگ ہیں اور اس کو اخلاقی روگ لگا کر ناجائز فائدے اٹھانے والے عناصر کونسے ہیں۔ وہ اپنی اخلاقی صحت کا تحفظ کرنے کے لئے جرائم کے اڈوں کا سدِ باب کرنے پر تُل جائے۔ وہ ان سیاست بازوں کے مقابلے کے لئے کیل کانٹے سے لیس رہے جو اس کے شہریوں کو صحیح تربیت

دیتے، ان کے فکر کی تعمیر کرتے اور ان کو شعور دلانے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں اور ان کو بہکاکر، پھسلاکر اور اکساکر ان سے وقتی طور پر فائدہ اٹھاکے اپنی راہ لیتے ہیں۔

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟ ہمارے سامنے پتہ ماری کا لمبا کام ہے جسے کرنے پر کوئی دوسرا یہاں تیار نہیں۔ اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے کے لئے صرف وہی لوگ آگے بڑھیں جو برسوں ایک دہقان کے سے صبر کے ساتھ محنت کر سکتے ہوں اور آناً فاناً اپنی محنت کے نتائج وصول کرنے کے لئے جھولی نہ پھیلادیں۔ یہ ایک ایسی مہم ہے جس کی کامیابی کا راستہ سینکڑوں ناکامیوں میں سے ہو کر گزرا ہے، لہٰذا یہ مہم اگر سر ہو گی تو ان عالی ہمت اور فراخ حوصلہ مردوں کے ذریعے ہو گی جنہیں ہر شکست اور زیادہ سرگرم عمل کر دے اور جو راستے کی ہر ٹھوکر کو ایک تازیانہ سمجھتے ہوئے اقدام کر سکیں۔

جب تک ہماری اجتماعی زندگی کی اخلاقی صحت مضبوط نہ ہو گی، اسلامی نظام کے قیام و نفاذ اور اس کے نشوونما اور ارتقاء کا تو کیا سوال، خالص مادی حیثیت سے بھی ہم دنیا میں ایک کمزور قوم بن کے پڑے رہیں گے اور اوپر کی بیٹر سے اندرونی مفاسد کا بھی ازالہ نہ ہو گا!

اس مہم میں ہمارا ساتھ دینے کے لئے کون آگے بڑھتا ہے؟

ہماری صحافت کے مفسدات

اور تدابیر اصلاح

اخبار نویس وہ معلم ہے جس کا مدرسہ پبلک ہوتا ہے اور جس کے تلامذہ میں ایک دہقان اور مزدور سے لے کر وزیر اور گورنر جنرل تک تمام اکابر و اصاغر شامل ہوتے ہیں۔ اخبار نویس وہ مبلغ ہے جس کی دعوت ہر روز گھر گھر۔ دکان دکان اور دفتر دفتر گونجتی ہے اخبار نویس وہ خطیب ہے جو اپنے کاغذی منبر پر کھڑے ہو کر صریر خامہ کی زبان سے جو وعظ روزانہ کہتا ہے اسے لاکھوں افراد سننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اخبار نویس دنیائے سیاست کا صراف ہوتا ہے جس کی کسوٹی اصولوں کو پرکھتی اور جس کی ترازو حوادث کو تولتی رہتی ہے۔ اخبار نویس سیاسی اختلافات سے بھری ہوئی دنیا میں عدالت کی کرسی جما کر بیٹھتا ہے اور فریضۂ قضا سرانجام دیتا ہے۔

یہ ہے صحافت کی اہمیت! اور اس اہمیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر صحافت حق۔ عدل۔

خیر اور فلاح کے لئے کام کرے تو انسانیت کے لئے اس سے مفید طاقت کوئی نہیں۔ لیکن اگر صحافت میں بگاڑ آجائے اور وہ کذب، باطل، شر اور فساد کے لئے برسرِ عمل ہو جائے تو نوعِ انسانی کے لئے اس سے زیادہ مہلک کوئی دوسری قوت نہیں!

آپ ذرا غور فرمایئے کہ کسی شہر کا ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ خود گندگی اور اسباب مرض کو پھیلانے کی مہم شروع کر دے۔ اگر پولیس اور کارکنانِ عدلیہ خود جرائم کے سرپرست بن جائیں۔ اگر مدارس خود جہالت کے سرچشمے بن جائیں۔ اگر صراف خود کھرے میں کھوٹا ملانے کا کاروبار شروع کر دیں تو نتائج کیا نکلیں گے؟ جو کچھ نتائج ان صورتوں میں نکلیں گے۔ عین وہی نتائج صحافت کے اختلال پذیر ہونے سے نمودار ہوتے ہیں۔ صحافت اگر آلۂ خیر ہو۔ تو نعمت عظمیٰ ہے اور اگر آلۂ شر بن جائے تو لعنت کبریٰ بن جاتی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے جو قوت جتنی بڑی ہوتی ہے۔ اتنی ہی اس کے بارے میں ذمہ داری شدید ہوتی ہے۔ ایک اخبار نویس اللہ کے سامنے اپنے ایک ایک لفظ کا حساب دینے کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔ اور اس کی تحریروں سے جتنے زیادہ انسانوں پر اچھے برے اثرات فکری پہلو سے مرتب ہوئے ہوں گے۔ اتنی ہی بڑی جزا و سزا اس کے حصے میں آئے گی۔ ایک صحافی کا ایک کلمۂ خیر نہ معلوم نتائج کا کتنا بڑا چمن آخرت میں اس کے سامنے لا رکھے گا۔ اور اس کا ایک کلمۂ شر کون جانے کہ کتنا بڑا آتشکدہ آراستہ کر کے اس کی تواضع کے لئے پیش کر دے گا! لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو سنوارنا یا بگاڑنا کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے یہ بہت ہی نازک ذمہ داری ہے!

ایک سچا اخبار نویس خالص سیاسی نقطۂ نگاہ سے حکام اور پبلک کے درمیان ایک

ذریعہ ربط بنتا ہے۔ وہ ایک طرف عوام کو تعلیم دیتا ہے کہ ان پر شہریت کے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف حکام کو درس دیتا ہے کہ حکمران کی ذمہ داریاں کیا ہیں اسے بیک وقت دونوں طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا ہوتا ہے۔ عوام میں بگاڑ آجائے تو وہ ان کی اصلاح بھی کرتا ہے۔ اور حکمران کی طرف سے مفسدات ظہور کریں تو ان کی روک تھام بھی کرتا ہے۔ پھر جب کبھی رائے عام اور "سلطان" کے درمیان کشمکش پیدا ہو جائے تو وہ دونوں کے درمیان ثالث بن کر ایک فیصلہ دیتا ہے اور دونوں کو اس پر مجمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر صلح نہ ہو تو وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ پورا وزن حق کے پلڑے میں ڈال دے ——— چاہے حق سلطان کی طرف ہو یا رائے عام کی طرف۔ اپنے اس موقف کے لحاظ سے درحقیقت اخبار نویس رائے عام کا "دماغ" ہوتا ہے۔ وہ اس کی جگہ سوچتا سمجھتا اور حکم لگاتا ہے۔

یہ دماغ ہی اگر مختل ہو جائے تو چارۂ کار کیا ہے؟ ——— فی الواقع پھر کوئی راہ نجات نہیں۔

یہ بات لکھتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ ہماری صحافت، احساس ذمہ داری سے بڑی حد تک بے نیاز اور ادائے فرض میں انتہائی کوتاہ ہے۔ اگر اخبار نویس برادری اس سچائی کے اظہار پر رنجیدہ نہ ہو تو صفائی سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا یہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ خود گندگی پھیلانے پر اتر آیا ہے کوچہ صحافت سے آج کوئی سلیم الطبع آدمی ناک پر رومال رکھے بغیر نہیں گذر سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاروں طرف گوبر کے ڈھیر لگے ہیں۔ کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا ہے پیپ اور کچ لہو سے لتھڑے ہوئے پھاہے پھیلے ہیں۔ مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ مچھر اڑ رہے ہیں۔

کیچوے رینگ رہے ہیں۔ اور بس ایک عجیب سماں ہے۔ یہاں سے گذر یئے تو نہ کپڑوں کی صفائی کی خیر ہے۔ نہ پگڑی کی سلامتی کی ضمانت ہے۔ نہ حواس کے بجا رہنے کا بھروسہ ہے اور نہ ذوق کی عافیت کا یقین ہے۔

ہماری صحافت چمن زاروں کا مجموعہ نہیں کہ جس میں رنگا رنگ گیاریاں حسن سلیقہ اور کمال ہنر کا ثبوت دے رہی ہوں۔ بلکہ اندھا دھند جھاڑ جھنکاڑوں کا ایک جنگل کا جنگل اُگ رہا ہے۔ اگر کہیں بدبختی کے طفیل کوئی گلاب اُگ آیا ہے۔ تو اس کے چاروں طرف جھٹ کیٹوں نے ہجوم کر رکھا ہے۔ اگر شومئے قسمت نے کسی گوشے میں یاسمین کو جگہ دلا دی ہے۔ تو اس کا منہ چڑانے کو اس کے اوپر سے آکاس بیل چھائی ہوئی ہے غرض بہ خطہ صحافت افریقہ کا ایک جنگل ہے۔ نہ کہ باغ جناح۔۔۔

ہمارے عوام کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ ان کی تربیت و اصلاح کی ذمہ داری کا بوجھ سب سے زیادہ جس گردن پر ڈالا گیا ہے۔ وہ حکومت و قیادت کی گردن ہے۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ ہمارے حکمرانوں اور ہمارے لیڈروں کا حال کیا ہے۔ حکومت و قیادت کے بگڑ جانے پر یہ ذمہ داری علما، سیاسی ورکرز اور صحافیوں کے سر عائد ہوتی ہے۔ کہ وہ ایک طرف عوام کی تربیت کا کام ہاتھ میں لیں اور دوسری طرف حکمرانوں کی اصلاح اور قیادت کی تبدیلی کے لئے اپنا پورا دباؤ استعمال کریں۔ لیکن علما تو قل اور چالیسویں کے مسائل میں محو ہیں۔ اور سیاسی ورکر اپنی اغراض پسندانہ دھڑے بندیوں کے مورچوں پر مصروف جہاد ہیں۔ اب رہ جاتی ہے صحافت کی قوت ——— اور ساری ذمہ داریاں اسی کے سر آ پڑتی ہیں کہ وہ علما کو سیاسی ورکرز کو بھی حکمرانوں کو بھی اور عوام کو بھی ان کی ذمہ داریوں سے

آگاہ کرے اور ہر ایک کو اپنے اپنے حصے کے فرض کی ادائی پر آمادہ کرے۔ لیکن صحافت خود بھی انہی دباؤں کی شکار ہے۔ جنہوں نے ذہنی رہنمائی کرنے والے دوسرے عناصر پر اپنا پرتو ڈال رکھا ہے:۔

یہ صورت حالات انتہائی تشویشناک ہے۔ اور اس کی اصلاح کے لئے جلد از جلد فکر کی جانی چاہیئے۔ اور فوری طور پر کوئی مؤثر اقدام کرنا چاہیئے۔ کہ ہماری قوت صحافت فلاح عوام کے لئے استعمال ہو۔

یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے لئے پہلے ان مفاسد کا جائزہ لیا جائے جن کا ٹڈی دل عالم صحافت میں پرواز کر رہا ہے۔

ہماری صحافت کے مفاسد یا وجود اختلال میں سے ایک یہ ہے۔ کہ اخبار اور اخبار نویس کے درمیان بڑے بڑے فاصلے پائے جاتے ہیں۔ ایک شخص کا قلم جو کچھ لکھتا ہے۔ اس کی ذہنی وعملی زندگی اس سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ہمارے اخبار نویسوں میں سے کون ہے جو اچھی باتیں نہ لکھتا ہو، لیکن وہ اچھی باتیں بے کار اس وجہ سے ہو جاتی ہیں کہ اس کی اپنی عملی زندگی ان باتوں کے اچھے ہونے سے انکار کرتی ہے:۔

وہ عوام کو شہریت کے جس نمونے کی تعلیم دیتا ہے۔ بسا اوقات خود اس نمونے کا شہری نہیں ہوتا۔ وہ لوگوں کو جس قربانی کی دعوت دیتا ہے۔ خود اس کا نمونہ نہیں رکھتا۔ وہ اسلامیات پر قلم اٹھاتا ہے۔ تو جن چیزوں کی حمایت کرتا ہے۔ ان پر خود عامل نہیں ہوتا۔ اور جن چیزوں سے روکتا ہے ان سے خود باز نہیں رہتا۔ اسی طرح وہ حکمرانوں کو جس طرز فکر اور جس طرز عمل کے اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اُسے خود اختیار نہیں کرتا۔ وہ اپنے اخبار میں تاریخ عالم اور

تاریخ اسلام سے اچھے اچھے جذبہ انگیز واقعات چھانٹ چھانٹ کر شائع کرتا ہے لیکن محض اخبار کے صفحات کی رونق بڑھانے کے لئے ـــــــ وہ خود ان واقعات کے سانچے میں کبھی نہیں ڈھل پاتا۔ وہ خلافت راشدہ کی زرّیں روایات سے اپنے کالموں کو آراستہ کرتا ہے۔ لیکن اس کے دفتر اور اس کے گھر میں خود ان روایات کا خون کیا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کو جن باتوں پر ٹوکتا ہے خود ان کو دانتوں سے پکڑے رہتا ہے۔

صحافت کی ایک بلا بے اصولا پن ہے۔ ہمارے اکثر اخبارات وہ ہیں جو بے اصولے پن کی کوکھ سے پیدا ہوئے۔ بے اصولے پن کی چھاتیوں سے دودھ پی کر پلے۔ اور بے اصولے پن کی انّا نے انہیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ مراد یہ کہ ایک نیا اخبار جب نکلتا ہے تو شاذ ہی ایسا ہوتا کہ وہ کسی اصول یا مقصد کے چلانے کے لئے باقاعدہ اسکیم بنا کر نکالا گیا ہو۔ بلکہ بالعموم اخبار کاروباری نقطۂ نظر سے جاری کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے لئے اگر کوئی اصول و مقصد اختیار کیا جاتا ہے۔ تو صرف یہ سوچ کر کہ اس اصول و مقصد کے ذریعے اخبار چل جائے گا۔ یہ کاروباری نقطۂ نظر جو اخبار کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہوتا ہے۔ زندگی بھر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ ہمارے بیشتر اخبارات وہ ہیں جن کی پالیسی برابر متغیر رہتی ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف ادوار کو سامنے رکھئے تو ان کے مجموعے سے ایک مسلسل تاریخ وجود میں نہیں آتی۔ بلکہ ہر دور دوسرے کا نقیض ہوتا ہے۔ ایسے اخبارات کی ہسٹری بتائے گی کہ جس شخص کو انہوں نے خود اچھالا اسے پھر خود ہی گرا دیا۔ جس پارٹی کی انہوں نے حمایت کی اس کی خود ہی مخالفت بھی کی۔ جس اصول کی انہوں نے کبھی دعوت دی تھی اس کی خود ہی انہوں نے تردید بھی کی جس مطالبے کے وہ ایک دور میں حامی تھے۔ دوسرے میں اس کے مخالف

ہو گئے۔ اور جس رائے کے وہ ایک زمانے میں علمبردار تھے۔ دوسرے زمانے میں اس کے خلاف مناظرہ کرتے پائے گئے۔

کاروباری اخبارات کی بنیادی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ منڈی کا مال ہوتے ہیں۔ اور ہر وقت ہر ہاتھ میں بکنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہ بات بڑے افسوس سے کہنی پڑتی ہے کہ ہمارے اخبارات میں سے بہت قلیل تعداد کو مستثنیٰ کر کے بقیہ کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کی کوئی نہ کوئی قیمت ہے جو بھی اس خاص قیمت کو ادا کر سکتا ہو۔ وہ ان کو خرید سکتا ہے۔

اصول وہ تاگا ہے۔ جو ایک اخبار کی تمام تحریروں کو پرو کر ایک ہار بناتا چلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ پیشینگوئی کی جا سکتی ہے۔ کہ فلاں اخبار فلاں معاملے میں فلاں رویہ اختیار کرے گا۔ لیکن بے اصول اخبارات کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس مرحلے پر کونسا موڑ مڑیں گے۔

صحافت کے بے اصولے پن کا بہت ہی بُرا اثر ہے جو دانے عام پر پڑتا ہے۔ یہ بد بلا عوام کو ایک ایسے ذہنی انتشار میں مبتلا کرنے والی ہے جسے یکسوئی سے بدلنا انتہائی مشکل کام ہے۔

بے اصولے پن کی بیماری کے نتیجے کے طور پر ارباب صحافت کا یہ مسلک وجود میں آیا ہے۔ کہ وہ اشخاص کے لئے دھڑے بندیاں بنانے کے عادی ہیں۔ چنانچہ اخبارات کی تعریف یوں کی جاتی ہے۔ کہ فلاں اخبار ممدوٹ کا ہے۔ فلاں دولتانہ کا ہے۔ فلاں صحافی کھوڑو کا حمائتی ہے۔ اور فلاں جی۔ ایم سید کا حامی۔

بے اصولے پن کی لعنت کا اس سے مکروہ تر مظاہرہ اور کیا ہو گا۔ کہ اخبار نویس

ہر اخبار کے ادارے میں ملازمت قبول کر سکتا ہے۔ بلکہ بہ یک وقت کئی کئی مختلف الخیال اخبارات کے اداروں میں حصہ دار بن سکتا ہے۔ پھر یہ بھی بلے اصولے پن کا مظاہرہ ہے۔ کہ اخبار نویس جن مفاسد کے خلاف اپنے قلم سے خود ہی نوٹ لکھتا ہے۔ عین انہیں کے اشتہارات کو اپنے اخبار میں جگہ دیتا ہے۔

اس طرح عوام کو برابر بے اصولے پن کی تعلیم اخبارات کے ذریعے مل رہی ہے۔

کاروباری زاویۂ نگاہ کا ایک خطرناک اثر یہ ہے کہ بہت سے اخبارات میں پبلک کی پستیٔ ذوق سے ناجائز فائدے اٹھانے کی خصلت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں ہر اخبار بین کے سامنے ہیں۔

مثلاً جب حیدر آباد میں اتحاد المسلمین کی گرما گرمی تھی تو میر عثمان علی خاں کا نام ایسے ایسے القاب کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ کہ سلیم الطبع لوگوں کو کراہت ہوتی تھی۔ اتحاد المسلمین کے لیڈروں کی تقاریر کو شاعرانہ سرخیوں کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ کہ "لال قلعے پر جھنڈا گڑ کے رہے گا" ——— وغیرہ۔ لیکن جب حالات نے پلٹا کھایا تو اسی میر عثمان علی خاں کے شجرۂ نسب کی تحقیق شروع ہوئی۔ اور اس کے لئے لغت کے اس حصے کو کریدا گیا جسے سنڈاس کہنا چاہیے۔ اتحاد المسلمین کی قوت کے متعلق عوام کو مبالغہ آمیز اور شاعرانہ تعلیوں کے ساتھ محض اس لئے مبتلائے خود فریبی کیا جاتا رہا۔ کہ ان کا ذوق اسی سے تسکین پا سکتا تھا حالانکہ دیانت اور صحافت کا یہ فرض تھا۔ کہ وہ اپنے عوام کو بروقت آگاہ کر دیتی کہ حیدر آباد میں مسلمانوں کی اصل قوت کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو عوام سقوطِ حیدر آباد پر افسردگی (Demoralization) کا شکار نہ ہوتے۔

لیکن اخبار نویسوں نے اپنے عوام کی نشہ پسندی کا جائزہ لے کر انہیں خوب خوب افیون اور بھنگ پلائی۔ صرف اس لئے کہ ان کی جیب سے ایک پیسہ اور ان کی زبان سے مرحبا کے نعرے وصول کر سکیں۔

ایسے ہی عوام میں چند سال پہلے ہندوستانی لیڈروں کے خلاف جو جذبات تھے۔ ان کو بالکل بچگانہ انداز میں تسکین دینے کے لئے ان لیڈروں کے نام بگاڑ بگاڑ کر لکھے جاتے تھے۔ ان کے لئے "صاحب" یا "جی" کا لفظ لکھنا تو گویا خلاف اخلاق تھا۔ کشمیر کے راجہ کو "میاں ہری سنگھ" لکھ کر بعض اخبارات اپنے قارئین کی تسکین جذبات کا سامان کرتے تھے۔ ایک اخبار نے ایک مرتبہ ہندوستان کے کسی گاؤں کے نمبردار کی موت کی سرخی یہ لگائی۔ "پٹیل مارا گیا" (الفاظ یاد نہیں) اور پھر یا کر گلی گلی اس سرخی کا اعلان کر رہے تھے۔ بے شمار لوگوں نے مغلوب جذبات ہو کر اخبار خریدا، لیکن ان کو اصل خبر پڑھ کر سخت مایوسی ہوئی۔

بطور اجمال مدعائے بیان یہ ہے کہ اخبار نویس بجائے اس کے کہ ایک حکیم معلم کی طرح یہ سوچ کر اخبار مرتب کرے کہ عوام کو کیا معلومات دینی چاہئیں۔ اور کس چیز کا درس دینا مفید ہو گا۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ عوام کے ذوق اور رجحان کے تقاضے کیا ہیں۔ ڈاکٹر اس کا لحاظ نہیں کرتا۔ کہ کونسی دوا مریض کے لئے مفید ہو گی۔ بلکہ وہ ساری توجہ اس پر دیتا ہے کہ کس دوا کا رنگ اور ذائقہ زیادہ پسند ہے اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ عوام کی ذہنی سطح کا بلند ہونا تو کجا، الٹا ان کی فکری صحت برباد ہو رہی ہے۔ ان کی بیماریوں کو صحت سے بدلنے کے بجائے ان میں بیماریاں پیدا کی جاتی ہیں تاکہ "مطب" چلتا رہے۔ کئی کئی اخبار باہم اس معاملے میں مقابلہ و تنافس کرتے ہیں۔ کہ کون عوام کو زیادہ خوبی سے ایکسپلائٹ کرتا ہے۔

اس طرح کے اخبار نویس خلاف عوام کی خاطر یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ کچھ عرصے کے لئے اگر اُن کے اخبار کی اشاعت کی تعداد گرتی ہے۔ تو گر جائے۔ لیکن وہ کہیں گے۔ صرف وہی کچھ جو کہ کہنا چاہئے۔

اخبار نویس اپنے اور پر امور معاملات میں تو شاید کوئی حدود و عاید کر بھی لیتا ہو۔ لیکن جب اپنے مخالفین (یعنی جن سے اسے اختلاف ہے کا معاملہ اس کے سامنے آتا ہے۔ تو وہ حدود و قیود سے بے نیاز ہو کر قلم چلاتا ہے۔ اختلاف کا جذبہ اسے بالکل انتقام کے مقام پر لے آتا ہے۔ جہاں اصول و اخلاق کا کوئی سوال اس کے سامنے نہیں رہتا۔ عام طور پر ہماری صحافت کا جو طرزِ عمل اختلاف کی صورت میں ہوتا ہے اس کے چند پہلو یہ ہیں:-

۱۔ عام طور پر ایک اخبار نویس جس سے اختلاف کرتا ہے سو فیصدی کرتا ہے۔ پھر دوسرے کی سو باتوں میں سے کوئی ایک بات اور سو افعال میں سے کوئی ایک فعل بھی ایسا نہیں رہتا۔ جس پر وہ کوئی کلمہ تحسین کہہ سکے۔ یا جس سے اظہارِ اتفاق کر سکے۔ اسے اختلاف پیدا ہو جانے کے بعد پھر بھلائی کبھی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ مخالف کے خیر کے اعتراف میں انتہائی بخل سے کام لیتا ہے۔ اور اس کی غلطیوں کو واضح کرنے میں پکا مسرف۔ قابلِ تحسین پہلوؤں کو وہ چھوٹے سے چھوٹا کر کے دکھاتا ہے۔ اور قابلِ نفرین پہلوؤں کو انتہائی حد تک (Enlarge) کرتا ہے۔

۲۔ مخالف کے بیانات کو شائع کرنے سے بالعموم ہمارا اخبار نویس کتراتا ہے۔ اور اگر شائع کرتا ہے۔ تو ایسی قینچ قطع و برید کے ساتھ کہ بیانات کے روشن پہلو کبھی سامنے نہ آسکیں۔

۳۔ پھر وہ مخالف کی تصریحات پوری طرح شائع کئے بغیر ان کی تردید میں شائع کرتا ہے

اس طرح وہ پبلک کے سامنے ہمیشہ ایک ہی رُخ لاتا ہے۔

۴۔ مخالفت کی مہم میں زور پیدا کرنے کے لئے وہ مخالف کی کہی ہوئی بات کو مسخ کرتا ہے۔ بلکہ خود اپنی طرف سے کچھ باتیں اس کے منہ میں ڈالتا ہے۔ پھر ان کی تردید کرتا چلا جاتا ہے۔

۵۔ مخالف کے خیالات کی تردید کرنے کے لئے استدلال سے کم از کم کام لیتا ہے۔ اور جذباتیت کا مظاہرہ زیادہ سے زیادہ کرتا ہے۔

۶۔ جانتے بوجھتے ایسے مراسلات، ایسی اطلاعات، ایسے مضامین کو شائع کرتا ہے۔ جن میں اس کے مخالف پر کھلے کھلے جھوٹے الزامات لگائے گئے ہوں۔

۷۔ غلط فہمی پھیلانے والی چیزیں شائع کرنے کے بعد اپنے مخالف کی طرف سے تردیدوں کی اشاعت میں ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیتا ہے۔

۸۔ مخالف کے کام کو واقعے سے کم، اس کی تحریک کی وسعت کو اصل سے محدود، اس کے جلسوں کی حاضری کو واقعی حاضری سے پست کر کے دکھاتا ہے۔

اور سب سے زیادہ خطرناک حقیقت یہ ہے۔ کہ اختلاف کی رو میں اخبار نویس تمام حدودِ اخلاق کو پھاند جاتا ہے وہ سیدھی صاف بات کرنے کے بجائے گالیوں پر اُتر آتا ہے۔ پگڑی اچھالنے لگتا ہے۔ کیچڑ کے چھینٹے ڈالتا ہے۔ پھکڑ، استہزا کرتا ہے۔ نام بگاڑتا ہے۔ نئے نئے القاب وضع کر کے تنابز بالالقاب کرتا ہے ——— اور مخالف کو فکاہات کے کالم میں کھڑا کر کے اُس کا منہ نوچتا ہے۔ یعنی بدتمیزی کی کوئی قسم ایسی نہیں جو اختلاف کی سزا دینے کے لئے دنیائے صحافت میں استعمال نہ کر ڈالی جاتی ہو۔

اس خرابی نے فضا کو اتنا گندہ کر دیا ہے۔ کہ سنجیدہ سے سنجیدہ صحافی کے لئے اپنے آپ کو وقار و حلم کے موقف پر جمائے رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ بسا اوقات اخبارات جو گھر میں آتے ہیں۔ ان کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ ان اخبارات کو اگر عورتیں اور بچے پڑھیں گے۔ تو نہ معلوم ان کی ذہنیت و سیرت میں کتنا فسادِ خون پیدا ہو گا۔ اور چند برس بعد ان کے کردار پر کیسے کیسے پھوڑے پھنسیاں نمودار ہو چکیں گے۔ ایسے الفاظ جن کے بارے میں ہم اپنے بچوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں۔ کہ یہ شریف آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے چاہئیں ان کے گلدستے سجا کر اخبار نویس ہمارے گھروں میں پہنچاتا ہے کہ ہمارے بچے بھی ان گلدستوں کو طاقِ ذہن کی زینت بنالیں جن سخافت آمیز حرکات پر ہم بچوں کو ٹوکتے ہیں۔ ان میں سے کوئی حرکت نہیں جس کی تبلیغ اخبارات میں نہ ہوتی ہو۔ اس قسم کے اخبارات بالیقین ہمارے بچوں کے لئے ذہنی غنڈہ ازم کی تربیت کا ذریعہ ہیں۔ اور ان سے ان کی زبان، ان کے جذبات، ان کی قوت برداشت، ان کے ذوق اور رجحان کا ستیاناس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بارہا ایسا ہوتا ہے۔ کہ کسی اخبار کے چند کالم پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ جیسے معدے میں مکھی نگل لی ہے اور وہ کلبلا رہی ہے۔ اور امتلاء ہو رہا ہے۔

اخبارات کی اس قسم کی تحریروں میں کبھی کبھار کسی شریف آدمی کی تحریر کا کوئی اقتباس بطور حوالہ اگر درج کر دیا جاتا ہے تو دونوں عبارتوں کا فرق بہت نمایاں ہو جاتا ہے جیسے بھُس کے ایک ڈھیر پر شاخِ گلاب رکھ دی گئی ہو۔

بہرحال یہ صحافت کا مستقل فسادِ خون ہے۔ اور اس کی اصلاح کی فکر اگر نہ کی گئی تو یہ فسادِ خون ہماری آئندہ نسلوں کو ورثے میں ملے گا۔ اور قوم کی قوم اخلاقی صحت کو ہمیشہ کے لئے برباد کر لے گی:۔

بخلاف اس کے ہمارے ارباب صحافت کا معاملہ اپنے ممدوحین کے لئے اس سے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اوپر کی ساری باتوں کو الٹ دیجئے۔ تو جو صورت ذہن میں آتی ہے وہ اہلِ صحافت ممدوحین کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ممدوحین کی مدافعت میں ایک اخبار نویس سنتری کی طرح سرگرم عمل رہتا ہے۔

ان کے خیالات کو پھیلانا اُن کی شرح کرنا۔ ان کی خوبیوں کا پروپیگنڈہ کرنا۔ ان کی برائیوں کو ڈھانپنا، ان کی طرف سے وکالت کرنا۔ ان کی خدمات کو پھیلا کر دکھانا، اُن کی کمزوریوں کے لئے عذرات پیش کرنا۔ ان کی سرگرمیوں کو وسیع الاثر ثابت کرنا، ان کی تقاریر کو تفصیل سے شائع کرنا۔ ان کے جلسوں کی حاضری بڑھا چڑھا کر بیان کرنا۔ وغیرہ ذمہ داریاں ہیں جو ایک اخبار نویس اپنے ممدوحین کے بارے میں اپنے سر لیتا ہے۔

اخبار نویسوں میں کاروباری زاویہ نگاہ رکھنے والوں کی جو بڑی تعداد موجود ہے۔ وہ حکمران طاقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے فرض سے دست بردار ہو کر اس کے درباری خوشامدیوں میں بار بار شامل ہوتی رہتی ہے۔ ان حالات میں صورت حالات ایسی ہی ہے۔ جیسے دورِ تغلق میں "ظل اللہ" اپنے گرد سرکاری منقبتوں اور بھانڈوں اور شاعروں کی ایک تعداد جمع کر کے دربار لگاتے تھے۔ بھانڈوں اور شاعروں کا فرض یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ظل اللہ کا دل خوش کرنے کے لئے اس کے سامنے "نحن نسبح بحمدک و نقدس لک" کا منصب سنبھال لیں اور وقتاً فوقتاً قصیدہ گوئی اور خوشامد گری سے یہ ثابت کرتے رہیں کہ حضور منزہ عن الخطاء ہیں، بے عیب ہیں۔ کوئی غلطی نہیں کرتے۔ اور شک و شبہ اور تنقید سے بالاتر ہیں۔ منقبتوں کی ذمہ داری یہ ہوتی تھی۔ کہ حضور والا کی نگاہ سے جو کوئی بھی گر

جائے اس پر کفر و موت کا فتویٰ لگائیں۔ اور حکمران اُن پر کوئی زیادتی کرنا چاہے۔ تو اس کو سزا اور عتاب اور زیادتی کو برحق ثابت کرنے کے لئے دلائل و براہین کے سیلاب بہا دیں۔ یہ مقامِ افسوس ہے۔ کہ موجودہ جمہوری دور میں یہ مناصب جلیلہ اربابِ صحافت کے حصے میں آگئے ہیں۔

حکام کی قصیدہ گوئی ان کی فاسقانہ حرکات کی بصد فخر نشر و اشاعت، ان کی اسلام کش تقریبات کی تصاویر سے اوراق کی آراستگی ان کے نام کے خاص نمبروں کی اشاعت اُن کے استبدادی ہتھکنڈوں کے لئے وجوہِ جواز کی فراہمی، ان کے ناقدین کے خلاف محاذ کا قیام اور اس قسم کی دوسری گھٹیا حرکات ہمارے متعدد اخبارات کا امتیازی وصف بن چکی ہیں۔

ہماری صحافت کا ایک سخت مضر عیب یہ ہے کہ راست فکری (Straight Thinking) کے جوہر کا قحط بُری طرح نمایاں ہے۔

راست فکری کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ اپنے موضوع کو متعین کرکے ایک سیدھی راہ استدلال بنا کر مقصدِ کلام کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ اصلاح پسند صحافت کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

لیکن ہمارے صحافیوں میں سے اکثریت ایسوں کی ہے بلکہ مجموعی طور پر صحافت کا مزاج اس طرح کا ہے۔ کہ وہ راست فکری کے وصف سے عاری ہے۔ موضوع کچھ اور ہوتا ہے۔ باتیں کچھ اور کہہ دی جاتی ہیں۔ ایک خاص مسئلے پر قلم اٹھایا۔ لیکن بیچ میں یاد آگیا۔ کہ فلاں فلاں نے لکھی ہے۔ اور ان سے چھیڑ چھاڑ جاری رہنی چاہیے۔ تو اس مسئلے سے ہٹ کر ان کے

خلاف فقرہ بازی شروع کر دی جاتی ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے کچھ عرصہ پہلے ایک مضمون لوگوں کو لائن لگانے کی عادت کی ترغیب دلانے کے لئے لکھا تھا۔ لیکن اسی کے تحت مجلس احرار، جماعت اسلامی، جماعت احمدیہ، نواب ممدوٹ، میاں ممتاز دولتانہ کو چٹکیاں بھی لے ڈالیں۔ آخر جو لوگ اپنے افکار کو لائن لگانا نہ سکھا سکیں۔ وہ عوام کو لائن لگانا کیسے سکھائیں گے۔ مضمون جمہوریت کے موضوع پر لکھا جائے گا۔ لیکن بحث اس میں یہ آجائے گی کہ مولانا مودودی جاگیرداروں کے حامی ہیں۔ پھر یہ بھی ایک عام خرابی ہے۔ کہ متعین سوال پر گفتگو کر کے اسے صاف کرنے کے بجائے اخبار نویسوں کا قلم جان بوجھ کر ایسے غیر متعلق مسائل کی طرف چلا جائے گا۔ جو عوام کی توجہ کو اس سوال سے ہٹا کر کسی دوسرے سوال پر جائیں۔ اس طرح کے ہتھکنڈوں کو عام طور پر بڑی فنی مہارت سمجھا جاتا ہے۔

اسی راست فکری کے قحط کا یہ اثر ہے۔ کہ ہمارے بعض چوٹی کے نوجوان صحافی تحریر کا ایک ایسا اسلوب پیدا کرنے میں منہمک ہیں جس سے زیادہ لایعنی اسلوب کوئی اور نہ ہوگا۔ میری مراد اس اسلوب سے ہے۔ جس میں ایک استدلال کے نتیجے میں جو حق بات کہنی واجب ہو جاتی ہے۔ اخبار نویس اس سے معاً کترا کر ایک موڑ ایسا مڑتا ہے۔ کہ دو قارئین کا قافلہ ساتھ لئے بالکل اس کے برعکس نتیجے پر پہنچانے بغیر قافلے کو پریشان چھوڑ کر الوداعی سلام کہہ دیتا ہے۔ اس اسلوب میں کئی متضاد اصولوں، مسلکوں اور جماعتوں کے بارے میں اس طرح رائے دی جاتی ہے۔ بات نہ پوری طرح ادھر ہوتی ہے۔ نہ ادھر۔ پڑھنے والا زمین و آسمان کے درمیان معلق رہ جاتا ہے۔ اخبار نویس اپنی جادوگری پر فخر محسوس کرتا ہے کہ دورنگی باتیں کہہ کر کیسا غچہ دیا۔ عوام کو حالانکہ وہ خدا کی مخلوق پر سب سے بڑا ظلم توڑ رہا ہوتا ہے۔ وہ ہزاروں بندگان خدا کو ذہنی انتشار کے روگ میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ کئی دماغوں کو

منافقت کا درس دیتا ہے۔

بدقسمتی سے یہ اسلوب بہت مقبول ہو رہا ہے۔ لاہور اور کراچی کے اکثر اخبارات میں اس اسلوب کے نمونے نہایت آب و تاب سے شائع ہوتے ہیں۔ اور اس اسلوب کے علمبردار صحافیوں کی قیمت منڈی میں خاصی گراں ہے۔

سیدھا چلنے کی بجائے "اگر" "مگر" "لیکن" اور "اگرچہ" وغیرہ کے استعمال سے اخبار نویس بالکل گھومتا ہوا اور پہلو بدلتا ہوا حرکت کرتا ہے۔ وہ صاف گوئی کی شجاعت اور ایک صداقت کا سامنا کرنے کی جرأت سے محروم ہونے کی وجہ سے سنجیدہ طرز بیان کو ترک کر کے ادبی چٹکلوں، چھپے نشتروں، لطیفہ آمیز کہانیوں، مبہم اشاروں وغیرہ کے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ اس طرح نہ خود کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچتا ہے نہ عوام کو پہنچنے دیتا ہے۔ وہ دراصل لوگوں کو سکھاتا ہے کہ مسائل پر غور و فکر تفریح کے لئے ہونا چاہئے۔ نہ کہ کسی نتیجے پر پہنچ کر کسی خاص عملی مسلک کے اختیار کرنے کے لئے۔

میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا۔ لیکن ایک مقبول اخبار نویس نے حال ہی میں موجودہ قیادت کے بارے میں ایک صحافیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں دو باتیں ثابت کی ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ قیادت مقبولیت کی سطح سے بہت نیچے گر رہی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اسی قیادت پر نگاہِ احترام جمائے رکھنا ضروری ہے۔ یہ دو متضاد باتیں ہیں لیکن دورنگی کے جدید صحافیانہ اسلوب کے تحت ان کو ایک خاص طریق سے نباہا گیا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس لاہور کے ایک نوجوان صحافی جو اپنے حلقے میں بہت ہی نمایاں ہیں۔ اس اسلوب کے خاص ماہر ہیں اور ان کی تحریریں مزے لے لے کر پڑھی جاتی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے ہر تحریر اسی "نشتر گریگی" کی مظہر ہے۔

اگر گستاخی نہ ہو تو میں اس اسلوب کو "صحافتی مداری پن" یا صحافتی شعبدہ بازی کا نام دوں۔ یہ محض الفاظ کی ایک تماشا گری ہے۔ جو شعبدہ بازی کے کمالات سے عوام کو مرعوب کر سکتی ہے اور ان کو ورطۂ حیرت میں ڈال سکتی ہے۔ لیکن ان کو مسائل کی گرہ کشائی کا درس نہیں دے سکتی۔

راست فکری کا یہ قحط صحافت کے واسطے سے سیاسی اسٹیج اور مذہبی منبر تک میں سرایت کر چکا ہے۔ شاذ ہی کوئی تقریر ایسی سننے میں آتی ہے جس میں راست فکری کا جوہر موجود ہو۔ اور کبھی ہی نصیب اتفاق اور ہوتا ہے۔ کہ کسی اخبار کے کالم میں کوئی ٹکڑا ایسا ملنے آجائے۔ کہ جس سے فکر کی صحت و توازن کے آثار نمایاں ہوں۔ بسا اوقات ایک اخبار میں ہفتوں کوئی صالح تحریر یا سنجیدہ مقالہ دیکھنے میں نہیں آتا۔

اس مہلک وبا کا پرتو عوام پر بری طرح پڑ رہا ہے۔ ہمارے عوام راست فکری کی تربیت حاصل کرنے کے بجائے اخبارات کے مطالعہ سے برابر ژولیدہ خیالی۔ پریشان دماغی اور انتشار ذہنی کا درس لے رہے ہیں۔ آپ دس بیس آدمیوں سے بات کر کے دیکھئے۔ تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ سیدھے راستے پر گفتگو کو لے چلنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہاں تک کہ اچھے اچھے اونچے تعلیم یافتہ لوگوں میں کثرت سے وہ لوگ پائے جاتے ہیں کہ جن میں یہ سلیقہ نہیں کہ وہ کسی گفتگو یا بحث کے لئے سیدھا راستہ اختیار کر کے دو قدم بھی چل سکیں۔

ایک مصیبت جو صحافت کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے وہ بہت سے اخبار نویسوں کی دماغی ناپختگی ہے۔ اخبار نویسی جتنا ذمہ داری کا منصب ہے۔ اتنی ہی زیادہ وہ علمی

قابلیت چاہتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں بہت سے اخبار نویس ایسے ہیں۔ جو دماغی پختگی کے بغیر میدان صحافت میں داخل ہوتے ہیں۔ اور ساری عمر اسی حال میں گذار دیتے ہیں۔ وہ اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ کہ ان کی تعلیم کس درجہ کی ہے۔ یا کم سے کم مطالعہ کافی ہے یا نہیں بلکہ وہ "قلم چلانے" کی مشق کو صحافت کی کرسی پر بیٹھ کر قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔

بعد میں جب ایسے لوگ صحافت کا کاروبار چلاتے ہیں۔ تو ان کی عادت ہمیشہ قلم برداشتہ لکھنے کی ہوتی ہے۔ ہر موضوع پر لکھیں گے بے تحاشا لکھیں گے۔ بے سوچے لکھیں گے اور بے مطالعہ کئے لکھیں گے۔ ان کی معلومات کے سارے خزانے صرف اخبارات سے ماخوذ ہوتے ہیں جو ان کو تبادلۂ معاصرانہ کے اصول کے تحت بہم پہنچتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ کسی ٹھوس مطالعہ کی توفیق ان کو نہیں ہوتی۔ یہ اپنے کو دنیا کے پیچیدہ ترین مسائل میں اتار دیں گے۔ لیکن یہ جانے بغیر کہ ان مسائل کے دور رس تقاضے کیا ہیں۔

دوسرے معاملات کو تو درکنار رکھئے۔ غریب اسلام پر جو ستم دنیائے صحافت میں ڈھائے جاتے ہیں۔ ان سے خدا کی پناہ۔ ایک شخص نے اسلام کے اصل ماخذ کو عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی ترجمہ تک کے ساتھ نہیں پڑھا ہوتا۔ لیکن وہ برابر اجتہاد کئے چلا جاتا ہے۔ وہ اسلامی سیاسیات پر رائے دے گا۔ لیکن اسے یہ تک معلوم نہ ہوگا۔ کہ اس موضوع میں کونسا لٹریچر دیکھنا چاہئے وہ اسلامی معاشی مسائل پر قلم اٹھائے گا۔ لیکن ان کتابوں کے نام تک نہ جانتا ہوگا۔ جن میں ان مسائل پر علمی بحثیں موجود ہیں۔ وہ اسلامی فلسفہ بیان کرے گا۔ وہ فتوے دے گا۔ اور وہ اجتہاد کرے گا لیکن کچھ پڑھے بغیر۔ کوئی ٹوکے تو کہہ دے گا کہ اسلام میں ہر شخص کو سوچنے اور رائے دینے کا حق ہے۔ یہاں کوئی طلائی طبقہ (Priest Class

قابل تسلیم نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔

مطالعہ کی بے نیازی کی اس عادت نے اخبار نویسوں کو یہ سکھا دیا ہے۔ کہ وہ جس شخص کی مخالفت کریں۔ اس کے خیالات کو پوری طرح سمجھے بغیر کریں۔ جس جماعت کے خلاف قلم اٹھائیں اس کے لٹریچر کو ملاحظہ فرمانے بغیر اٹھائیں۔

اس طرح عوام کا ذہنی معیار تباہی کا شکار ہو رہا ہے۔

سب سے بڑی آفت صحافت کی حدودِ اخلاق سے بے نیازی ہے۔ یعنی پوری دنیائے صحافت کے لئے مجموعی طور پر بھی، اور ایک ایک اخبار کے لئے انفرادی طور پر بھی۔ کوئی ایسے حدود اخلاق عوام کے علم میں نہیں ہیں۔ کہ یہ اخبار چاہے ختم ہو جائے لیکن فلاں فلاں حرکات یہ کبھی نہ کر سکے گا۔ اخبارات کے سامنے کوئی ایسی حدود نہیں کہ جن کے متعلق معلوم ہو کہ وہ کسی کی حمایت میں فلاں حدود سے آگے قطعاً نہیں جائیں گے۔ یا کسی کی مخالفت میں فلاں خط کو وہ کبھی نہیں پھاندیں گے۔

یہ بے ضمیری کی حالت سخت مفسدہ انگیز ہے ——— اور اس کی وجہ سے اخبار نویس میں ایک استکبار پایا جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے قبضے میں ایک بے پناہ قوت ہے جس کے ذریعے جس پر چاہے بڑی سے بڑی عنایت کر دے۔ اور جس پر چاہے بڑے سے بڑا ستم توڑ دے۔ اس میں وہ قوت باقی نہیں رہی جو اسے غلطی پر ٹوک سکے۔ اور غلط سمت میں اقدام کرنے سے روک سکے۔ چنانچہ آپ کو اپنے اکثر اخبارات کے سالہا سال کے فائلوں میں اس کی مثالیں بہت ہی شاذ ملیں گی۔ کہ اخبار نویسوں نے دوسروں کی غلطیوں کو چھلنیوں میں چھانتے ہوئے کبھی اپنی غلطی کا اعتراف بھی

کیا ہو غلطی کا احساس تو جبھی ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی حدود اخلاق آدمی اپنے لئے قائم کرے۔ جب یہ نہیں ہیں۔ تو اعتراف خطا کا کیا سوال!

ان کے مقاصد کو سامنے رکھ کر اگر ہم اپنے اخبارات کو دیکھیں تو راست گوئی معاف۔ ذوق سلیم یہ کہتا ہے کہ ان سے اس طرح بچنا چاہئے جیسے چیونٹیوں بھرے کباب۔ مکھی ملے دودھ۔ اور زہریلے شہد سے بچا جاتا ہے۔ ان سے اپنے آپ کو اور پبلک کو اس طرح بچانا چاہئے جیسے ہیضے اور ملیریا اور دق وسل کی وباؤں سے بچتے بچاتے ہیں۔

لیکن بائیکاٹ کوئی طریق اصلاح نہیں! —— اخبار کے بغیر ہم اپنی سیاسی زندگی کو نشوونما نہیں دے سکتے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان احوال کا علاج کیا ہے؟

دراصل حالات کی کسی بھی اصلاح کے لئے خود انسان کا بدلنا واحد وسیلہ ہے۔ باہر سے اخبار نویس پر ہم کوئی مکمل اصلاح مسلط نہیں کر سکتے۔ بلکہ اصلاح صرف وہی ہے جو اس کے اپنے ضمیر کے اندر سے اگے۔

ہمارا اخبار نویس اس بات کا محتاج ہے کہ اس میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کو اکسایا جائے۔ اس کے اندر یہ شعور تازہ کیا جائے کہ صحافت کا منصب اور قلم کی قوت اس کے پاس خدا تعالیٰ کی امانت ہے۔ جس کا صحیح استعمال وہ ہے جو اصل مالک کی رضا اور اس کے مقررہ ضوابط کے مطابق ہو۔ پھر اس میں تقویٰ کی یہ اسپرٹ پیدا کی جائے کہ وہ ہر لفظ لکھے تو یہ

سوچ کر لکھے کہ خدا کی کسوٹی پر کھرا نکلتا ہے یا کھوٹا۔ پھر اس میں ذمہ داری کا یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ اپنی تحریروں کے بارے میں آخرت کی جوابدہی کو پیش نظر رکھے۔

بجز اس تبدیلی کے کوئی اور صورت ایسی نہیں ہے جو ہماری صحافت کو مغربی فن صحافت کے مفسدات سے پاک کر سکے۔

دوسری صورتیں محدود اثرات ڈالنے والی ہو سکتی ہیں۔ اور ہم یہاں ان کا تذکرہ بھی کئے دیتے ہیں:۔

۱۔ اخبار اور رسالے کا ڈیکلیریشن دیتے ہوئے خاص طور پر جن امور کا اطمینان حاصل کر لینا چاہئے وہ یہ ہیں کہ ایک شخص ذہن و سیرت کی پاکیزگی کے لحاظ سے کس معیار کا ہے، اس کے سامنے کوئی اصول و مقصد ہے یا نہیں، وہ سابق زندگی کو بلیک میلنگ یا ضمیر فروشی سے داغدار تو نہیں کر چکا۔

۲۔ صحافت کے میدان میں آنے کے لئے ہر شخص کو ایک ایسے لازمی تربیتی کورس سے گزرنا چاہئے جو نہ صرف ٹکنیکل پہلو سے ضروری صلاحیتوں سے اسے آراستہ کرے بلکہ اس کے ذہن میں احساس ذمہ داری اور اس کی سیرت با اصول پن ہوا کرے، نیز اس میں دین اور انسانیت کی خدمت کا سچا جذبہ ابھار دے۔

۳۔ جو لوگ صحافت کو نئے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ پبلک کو موجودہ صحافت کے مفاسد سے برابر آگاہ کرتے رہیں۔ وہ صحافت کے کرشموں کا بار بار تجزیہ کر کے یہ دکھائیں کہ ان کرشموں کی اصل حقیقت و ماہیت کیا ہے۔ یہاں تک کہ اسلام اور انسانیت سے گری ہوئی صحافت کی قدر اور مانگ ذہنی منڈی میں گر جائے اور اخبار نویس میں احساس پیدا ہو کہ اسے

بدلنا چاہئے۔

۴۔ دوسری طرف صالح صحافت کے ایسے نمونے پبلک کے سامنے لائے جائیں جنہیں فاسد صحافت کے مقابلے میں بار بار پڑھنے کے بعد عوام پر خود یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کی فلاح صالح صحافت میں ہے نہ کہ فاسد صحافت میں۔ اس طرح ایک مسلسل جد و جہد کے بعد صالح صحافت کی قدر اور مانگ پیدا ہو سکتی ہے جو بالآخر صحافتی دنیا میں انقلاب لائے گی۔

۵۔ اسلام پسند صحافیوں کی ایک ایسی مجلس تشکیل پذیر ہو جس کا مقصد صرف اپنے حقوق کی حفاظت نہ ہو۔ بلکہ اپنے فرائض کی فکر کرنا بھی ہو۔ یہ انجمن صالح صحافت کے نئے اصول اور اخلاقی حدود متعین کرے۔ ان پر لٹریچر فراہم کرے۔ اور نئے صحافتی اسالیب کے نمونے صحافیوں اور پبلک کے سامنے لائے۔

ان تدابیر سے ایک گونہ فائدہ ہو سکتا ہے۔

پاکستان کیلئے ابتدائی تعلیم کا خاکہ

(وحدانی کلیت پسندانہ اور عملی نقطہ نظر سے)

گذشتہ ماہ میں چند ایسے احباب سے ملاقات ہوئی جن کے ذریعہ صوبہ مغربی پنجاب میں نافذ ہونے والے نصابِ دینیات سے مجملاً تعارف ہوا۔ اگر حکومت کی طرف سے خاکہ نصاب مطبوعہ شکل میں مل سکتا تو ہم بالتفصیل اس پر اظہارِ خیال کر سکتے۔ لیکن اس وقت جو چند اشارات سامنے ہیں ان پر مجملاً گفتگو کرنا ہی ممکن ہے۔

زیر غور نصاب دینیات کے متعلق قیاس یہ ہے کہ وہ حسب ذیل صفات کے ساتھ سامنے آئے گا:۔

۱۔ تعلیم و تربیت کا اصل جوہر نماز مترجم، قرآن ناظرہ اور ادعیہ و اذکار کی قسم کی چیزیں ہونگی۔
۲۔ دین کو ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ انفرادی مذہب

کے طور پر اس کا تعارف کرایا جائے گا۔

۳۔ جہاد وغیرہ کا موضوع نصاب سے بالکل خارج رکھا جائے گا۔

۴۔ اخلاقیاتِ اسلام کو بحیثیت ایک سسٹم کے نہیں، بلکہ ان کے بعض اجزاء کو منتشر طور پر سامنے لایا جائے گا۔

۵۔ اس امر کا شاید کوئی اہتمام نہ ہوگا کہ دین کی اہم اصطلاحات کا مفہوم آٹھ سال کی تعلیم میں طلبا کو معلوم ہو سکے۔ یہاں تک کہ اسلام، کفر، نفاق، شرک، فسق وغیرہ کا فرق بھی شاید ہی اس نصاب میں واضح ہو۔

۶۔ یہ التزام بھی خارج از بحث ہوگا کہ دینیات کی تعلیم سے دوسرے تعلیمی مضامین کے جو اجزاء متصادم ہوتے ہوں ان کو دینیات کے ڈھب پر بدل دیا جائے۔

دراصل یہ اشارات کوئی خاص انکشاف نہیں ہیں۔ جس طرز پر دین کے موضوع پر ہمارے ارباب تعلیمات غور کرنے کے عادی ہیں اسی کے پیشِ نظر ہر بالغ آدمی آنے والے نصاب دینیات کے متعلق کامیاب پیشنگوئی کر سکتا ہے۔ اگر واقعتہً کوئی نصاب دینیات مذکورہ بالا امور کی روشنی میں مرتب کیا گیا تو اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ وہ مقصد کے لحاظ سے بالکل ناکارہ ہوگا۔ اس طرح کا کوئی خاکہ اگر زیر غور ہے تو وہ یقیناً تعلیم دینیات کی ان مروجہ کتب سے بھی ہمیں پیچھے لے جاتا ہے جو اپنے اندر بہت سی کوتاہیاں رکھتی ہیں۔ ایسے کسی خاکے پر بنے ہوئے نصاب کے تحت تعلیم حاصل کرنے والا طالب علم آٹھ سال کے بعد اپنے دماغ میں اسلام کے متعلق نہایت گھٹیا تصورات لے کر زندگی کی جنگاہ میں آئے گا۔ اس جنگاہ میں وہ جمہوریت اور اشتراکیت کو تو بحیثیت نظام زندگی کے مرتب شکل میں دیکھے گا۔ لیکن ان کے مقابلہ میں اس کے پاس جو اسلام ہوگا وہ پوجا کے چند

رسوم اور عادتوں اور جاپلوں کے چند منتشر قواعد اور اخلاقیات کے چند بے ربط اصولوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ پس بہ حیثیت مسلم کے اس کا شکست کھا جانا یقینی ہے بلکہ دینیات کی ایسی گھٹیا تعلیم کے ساتھ جب اس کو سائنس اور فلسفہ، نفسیات اور طبیعات، سیاست اور معیشت کو غیر دینی مضامین کی حیثیت سے پورے دلائل کے ساتھ پڑھایا جائے گا تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں ہوگا کہ وہ اسکول اور کالج سے کھلا ملحد یا کم از کم اسلام کے متعلق متشکک ہو کر نکلے۔ پھر یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ اگر پاکستان کو اسلامی نظام کا قیام عمل میں لانا ہے اور اسے اسکولوں اور کالجوں میں اس نظام کے لئے کارکنوں کی تربیت کرنی ہے تو اس مقصد کے لئے اس طرح کا نصاب بالکل بے کار بلکہ بہت نقصان دہ ہے ایسی تعلیم دینیات تو اس حکومت کے اختیار کرنے کی چیز ہے جو بظاہر دین کی سرپرست بن کر دین کو ختم کرنا چاہتی ہو۔ مذکورہ بالا خاکے کے مطابق تعلیم دینیات دینے کا نتیجہ یہی ہوگا کہ ہمارے نوجوان طلبا اس کے خلاف بغاوت کریں گے اور شاید چند سال بعد اس شئے زائد کو ختم کرانے کے لئے وہ خود ایجی ٹیشن کرتے نظر آئیں۔

پاکستان میں اسلامیات کی تعلیم کے متعلق حسب ذیل اشارات قابل لحاظ ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے علماء دین اور ماہرین تعلیم ان پر غور فرمائیں۔ اور تعلیم دینیات کا وہ ڈھنگ اختیار کریں جو مفید نتائج دے سکے۔

اشارہ اول:۔

تعلیم کے پورے سسٹم میں کسی پہلو سے بھی کوئی تغیر پیدا کرنے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا قومی اور ریاستی نصب العین OBJECTIVE کیا ہے؟ ہمیں کیسا نظام برپا کرنا چلانا ہے، اور اس کے لئے کیسا ماحول اور کیسے کارکن مطلوب ہیں؟ نصب العین کی منزل

جب متعین ہو جائے گی تو قافلۂ تعلیمات کے لئے صحیح سمت سفر متعین کرنا ممکن ہو جائے گا۔ یہ ایک عجیب حرکت ہے کہ دستوری نصب العین کا تصفیہ معرض التوا میں پڑا ہوا ہے اور نظام تعلیم میں تغیرات پہلے سے رونما کئے جا رہے ہیں۔

اگر پاکستان کا دستوری نصب العین نظام اسلامی کا احیاء و فروغ قرار دیا جائے تو پھر تعلیم کی ذمہ داریاں متعین ہو جاتی ہیں کہ اسے بہترین قسم کے مسلمان پیدا کرکے دینے ہیں جو نکری حیثیت سے بھی مسلم ہوں اور عملی حیثیت سے بھی مسلم ہوں۔ اسے اسلامی نظام کے لئے صدر اور مجلس شوریٰ اور گورنر اور دوسرے کارکن اور شہری مہیا کرنے ہیں۔ اس نصب العین کا مطالبہ یہ ہوگا کہ اسلام فکر و عمل کے جتنے تقاضے رکھتا ہے وہ سارے کے سارے پاکستان کے طلباء کے سامنے آنے چاہئیں۔ ان سے جو چیز بھی متصادم ہوتی ہو اسے پاکستان کے نظام تعلیمات سے کلیتہً خارج ہو جانا چاہئے۔

اس نصب العین کا ایک واضح تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلام کے اصولوں، عقائد اور قواعد و ضوابط، روایات و شعار اور اخلاق و قانون کی صحت اور افادیت اور فوقیت و برتری کا کامل یقین ساتھ لے کر طلبا مدارس اور کالجوں سے نکلیں اور اپنے دین اور نظام اسلامی کے حق میں ان کے ساتھ اتنے قابل اعتماد اسلحہ استدلال ہوں کہ کسی غیر اسلامی نظام کو مرعوبیت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ نیز ان میں ایسا جان دار جذبہ موجود ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اصول و نظام کو دنیا کے گوشے گوشے میں قائم کر دکھانے کے لئے اجتماعی سرگرمیوں میں پورا پورا حصہ ادا کر سکیں۔

بہ خلاف اس کے اگر خدا نخواستہ پاکستان میں غیر اسلامی نظام کے قیام کا فیصلہ ہو جائے تو پھر ہمارے نظام تعلیم کے لئے صحیح روش یہ ہے کہ وہ تعلیم دینیات کی کوئی گنجائش اپنے

اندر نکالنے سے قطعی انکار کر دے تاکہ لادینیت خوب اچھی طرح پروان چڑھے۔ اور کفر و دین کی کشمکش سے طلباء کے ذہن آزاد ہو کر یکسو ہو جائیں اور غیر اسلامی نظام کے لئے بہترین رضاکار ثابت ہو سکیں۔ لیکن اگر لادینی حکومت دینیات کی سرپرستی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہی ہو تو پھر مذکورہ بالا خطوط پر بنا ہوا تعلیم دینیات کا خاکہ یقیناً ایسا ہے کہ دین سے آئندہ نسل کی دلچسپیوں کو ختم کر سکے۔ یہ خاکہ دین کے وقار اور اس کے رہے سہے احترام کو ختم کرنے کے لئے بہت کارگر ہو سکتا ہے۔

اشارہ دوم:۔

نظام تعلیم کے کنان برداروں کو یہ بات بھی اوّل قدم پر طے کر لینی چاہئے کہ اسلام میں مذہب انفرادی معاملہ ہے یا اجتماعی؟ اور اسلام پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے یا اس کا ایک جزو بن کر رہتا ہے؟ پھر اگر اسلام کو خود اس کی اپنی منشاء کے مطابق پوری زندگی کا دین تعلیم کیا جائے تو نظام تعلیم ایسا اختیار کرنا پڑے گا کہ جس میں سے دین و دنیا کی تفریق کا ذرا سا تصور بھی طلباء اخذ نہ کر سکیں۔ اور نہ انہیں یہ شبہ لاحق ہو سکے کہ اسلام کسی دوسرے نظام کا جزو بن کر ——— یا غیر اسلام سے اشتراک کر کے بھی رہ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جمہوری ممالک میں نصاب جمہوریت عام نصاب سے الگ نہیں ہے کہ اس کا ٹیچر اور پیریڈ جداگانہ ہو۔ اور اسی طرح روس میں اشتراکیت کے نصاب کو دوسرے مضامین سے جداگانہ نہیں قرار دیا گیا کہ بقیہ نظام تعلیم کے ساتھ اشتراکیت کی تعلیم کا ایک ٹکڑا الگ ہے۔ کیونکہ کسی اصولی نظام زندگی کی تعلیم کا یہ طریقہ ہے ہی نہیں۔

ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ ہم تمام مضامین میں تعلیم دینیات کو سمو کر پورے نظام تعلیم کو دینی بنا دیں۔ ہمارے یہاں فلسفہ پڑھایا جائے تو وہ اسلامی فلسفہ ہونا چاہئے۔ ریاضی سکھائی

جائے تو اس میں دینی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام ہونا چاہئے۔ طبیعات کی تعلیم دی جائے تو طبیعات سے دین نے جو جو استدلال کئے ہیں اور کائنات کے طبعی نظام کے متعلق جو اہم قوانین بیان کئے ہیں وہ اس میں واضح ہونے چاہئیں، تاریخ بیان کی جائے تو اس فلسفہ رزم خیر و شر اور حکمت فنا و بقائے اقوام اور تاریخ میں ان اسلامی اصولوں کی کارفرمائی کے اثبات کے لئے بیان کی جائے جنہیں اسلام نے پیش کیا ہے۔ سیاست پیش کی جائے تو وہ اسلامی سیاست ہو اور معاشیات بیان کی جائیں تو وہ اسلامی معاشیات ہوں۔ اور یہ امر نصاب تعلیم کے ہر گوشے میں ملحوظ رہے کہ طلباء میں ہمیں غیر اسلامی اصول و نظم پر تنقید کرنے اور خالص عقلی طریق پر اسلام کی فوقیت کو محسوس کرنے کی قوتیں ابھارنی ہیں۔

دین و دنیا کی تفریق کے خطرناک تصور کا سدباب کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ہم تعلیم دینیات کا کوئی جداگانہ پیریڈ، جداگانہ ٹیچر اور جداگانہ نصاب مقرر کرنے سے پوری طرح اجتناب کریں۔ پوری تعلیم کو تعلیم دینیات ہونا چاہئے یعنی دنیویات کے متعلق دین کے مطالبات ہر شعبے میں واضح طور پر سامنے لانے چاہئیں۔ ہمارے ہر پروفیسر اور ٹیچر کو معلم اسلامیات ہونا چاہئے اور ہمارے ہر پیریڈ کو دینیات کا پیریڈ ہونا چاہئے۔

اسلام نظام تعلیم کے لئے وہ سانچہ ہو جس میں ہمارے جملہ علوم و فنون کے نصاب ڈھل جائیں۔ جہاں تک اسلام کے بنیادی حقائق اور اساسی عبادات اور دوسرے مرکزی مسائل کا تعلق ہے وہ زبان دانی کے نصاب میں جذب کر دیئے جانے چاہئیں۔

اشارہ سوم:۔

اسلام ایک عملی تحریک اور ایک اخلاقی نظام ہے۔ لہٰذا اس کی تعلیم کے لئے یہ کافی نہیں کہ چند کتابیں سات آٹھ سال میں طلباء کو پڑھا دی جائیں، بلکہ کتابی تعلیم سے زیادہ

یہاں فیضانِ نظر کی ضرورت ہے اور دماغ میں معلومات کا انگاتھانہ سجانے کے مقابلہ میں یہاں عملی زندگی کی تعمیر و تربیت کی ترجیح حاصل ہے۔ خود مدینہ کے مدرسۂ نبوی میں قرآن کی کتابی تعلیم کو ساتھ کے ساتھ عملی پیرایہ میں ڈھالا جاتا تھا اور اصحاب صفہ قرآن پڑھ کر نہیں بلکہ قرآن کے سانچے میں ڈھل کر اس مدرسہ سے نکلتے تھے۔ تبھی وہ اسلامی نظام کو چلانے کے لئے صحیح کارکن اور ساری نوعِ انسانی کو اس کی تعلیم دینے کے لئے کامیاب معلم بن سکے تھے۔ پس آج بھی اگر ہمیں اسلامی نظام کو چلانے اور دنیا کو تعلیم اسلام دینے کے لئے مسلمان کارکن درکار ہیں تو کتابی تعلیم سے کچھ زائد انتظامات کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ انتظامات حسب ذیل ہیں:

۱- ہمارے مدرسوں اور کالجوں کے ماحول کو ہر پہلو سے اسلامی ہونا چاہئے اور ان کی فضا کو غیر اسلامی اثرات سے پوری طرح پاک کر دینا چاہئے، تاکہ جو طلباء اس ماحول میں چند سال گزاریں۔ ان کی ذہنیتیں اور سیرتیں خود بہ خود اسلام کے ڈھب پر بدل جائیں۔ ہمارے تعلیمی ماحول کی ساری دلچسپیوں اور سرگرمیوں اور مصروفیتوں کی روح اسلام کو ہونا چاہئے۔ یہاں کی گفتگوئیں، یہاں کی مجالس، یہاں کے کھیل، یہاں کے مباحثے، یہاں کی نشست و برخاست، یہاں کے باہمی روابط، یہاں کے آداب و رسوم یہاں کی تقسیم اوقات سبھی کی روح اسلام ہو، اور سبھی اسلام کے تقاضوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہی تعلیمی ماحول ایک ایسے فطری سانچے کی حیثیت اختیار کرے جس میں قرآن کے نقشے اور اسوۂ نبوی کے نمونے کا مطلوبہ انسان ہی ڈھل سکے۔

۲- ہمارے نئے اسلامی نظامِ تعلیم میں تعلیمی ماحول اور نصاب کے علاوہ اول درجہ کی اہمیت ٹیچر کی شخصیت کو حاصل ہے۔ ہماری کتاب اگر مسلم ہو، لیکن ٹیچر مسلم ہونے کا عملی نمونہ نہ ہو تو تنہا کتاب ضرورت کے مسلم پیدا کر کے نہیں دے سکتی۔ نئے نظام تعلیم کے اساتذہ

کو اپنے اندر اسلامی مقاصد کے مطابق ایک ایسی شخصیت پرورش کر کے مدرسے اور کالج میں داخل ہونا چاہیئے جو طلبا کے ذہنوں اور سیرتوں پر اپنا پرتو ڈال کر ان کی تعمیر جدید کر سکے۔ کتاب سے طلبا معلومات حاصل کریں اور ٹیچر سے "معمولات" ایک طرف ان کا فکر غذا حاصل کرے اور دوسری طرف سے ان کا عمل تقویت پائے۔ ان دو ضروریات کو پورا کئے بغیر اگر محض کتابوں میں اسلام کو داخل کر دیا جائے تو اسلام کا "قول" تو طلبا میں پیدا ہو سکتا ہے اسلام کا "عمل" پیدا نہیں ہو سکتا۔ نری کتابی تعلیم شاعری سکھا سکتی ہے، انقلابی کارکن پیدا نہیں کر سکتی۔ اور ہمیں انقلابی جذبات رکھنے والے عملی کارکنوں کی ضرورت ہے۔

آخر میں ہم مختلف مضامین کے (حصہ مڈل) کے وہ اصولیات (PRINCIPLES) عرض کرتے ہیں جن پر ان کو مرتب کرنے سے ہر مضمون دنیوی رہتے ہوئے دینیات کا مضمون بن سکتا ہے اور اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ دینیات کے لئے الگ سے کوئی کتاب، پیریڈ اور ٹیچر مقرر کیا جائے۔

(۱) شہریت (CIVICS)

ہماری تعلیم میں اس مضمون کی اہمیت بہت زیادہ مرکزی ہو گی اور اس کا مقصد یہ ہو گا کہ وہ اسلامی اصولوں پر سوسائٹی کے اندر افراد کے مختلف روابط اور ان کی گوناگوں حیثیوں کے مطابق ان کی ذمہ داریاں متعین کرے۔ ایک مسلم معاشرہ کا جزو بن کر ایک فرد مسلم کو زندگی گزارنے کے لئے اسلام کے اعتقادی، اخلاقی اور قانونی تقاضے پوری طرح معلوم ہونے چاہئیں اور اس قرآن کے پیش کردہ شہری کے معیاری نمونہ کا تفصیلی علم ہونا چاہیئے جس کے مطابق اسے اپنی سیرت تعمیر کرنی ہے۔ خصوصیت سے حسب

ذیل انسانی روابط کی ذمہ داریاں اسلامی اصولوں پر واضح ہو جانی چاہئیں۔

ا:۔ خاندانی نظام کے داخلی تعلقات کا فرق مراتب نیز ذوی القربیٰ کے حقوق۔

ب:۔ محلے، شہر، ملک اور انسانیت کے مقابل میں ایک فرد مسلم کا مقام اور حقوق جار کی تفصیل۔

ج:۔ ایک مسلم اور دوسرے مسلم کے عمومی تعلقات کی اسلامی بنیادیں۔

د:۔ اسلامی حکومت کے کارکن کی حیثیت میں عائد ہونے والے فرائض۔

ر:۔ اسلامی حکومت کے مناصب اعلیٰ کی ذمہ داریوں کی نزاکت۔

س:۔ اسلامی حکومت سے لازمی تعاون کی مختلف نوعیتیں۔

ص:۔ کارخانہ دار اور مزدور، زمیندار اور مزارع اور آقا اور ملازم کے باہمی حقوق و فرائض۔

ط:۔ مرد و عورت کے تعلقات کی فطری حدود۔

ع:۔ ثروت و غربت کا مقام۔

ف:۔ اسلامی سوسائٹی اور جمہوری و اشتراکی سوسائٹی میں وجہ اختلاف۔

علاوہ بریں اسی شہریت (civic's) کے مضمون میں اسلامی نظام حکومت و سیاست کے مختلف پہلوؤں کو طلباء پر واضح کر دینا چاہئے کہ حکومت کا مقصد کیا ہے؟ اس میں پولیس اور عدالت کا مقام کیا ہے؟ اس کی فوج کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس کا نظام تعلیم و اشاعت کن طریقوں پر چلتا ہے اس کے مالیات کن اصولوں پر کام کرتے ہیں؛ وغیرہ

پھر طلباء کو شہریت کے ذریعے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے روزمرہ کے معاملات کا تعلق حکومت کے کن کن شعبوں سے کس کس افسر یا رکن کے ذریعے کن کن طریقوں سے

قائم ہے اور ان کو معمولی اور غیر معمولی ضروریات کے لئے کدھر رجوع کرنا چاہئے؟

اس سارے کورس میں خوب اچھی طرح نمایاں کیا جائے کہ اسلامی عقائد اور اسلامی عبادات اور اسلامی قواعدِ اخلاق مسلم سوسائٹی کے روابط پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور جملہ مباحث میں قرآن وحدیث اور دورِ خلافتِ راشدہ کی نظیروں کو رہنمائی کے لئے علمی ترتیب سے سامنے لایا جائے۔

ان اشارات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری دینیاتی تعلیم کے لئے سب سے زیادہ اہم مضمون یہی ہوگا۔

(۲) مطالعہ نظامِ فطرت (NATURE STUDY)

اس ایک جامع عنوان کے تحت علم کیمیا مع طبعی جغرافیہ حفظانِ صحت (جسم انسانی کے نظم، افعال الاعضاء اور صحت و مرض کے احوال کا مطالعہ)، علم حیوانات کے مبادیات اور علم نباتات کا ابتدائی مطالعہ (خصوصیت سے زراعت و باغبانی کے پہلو بھی) شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ عام معلومات کی چیزیں زبان دانی کے نصاب میں جائیں گی۔ لیکن علم کیمیا، طبعی جغرافیہ اور حفظانِ صحت مستقل اختیاری مضامین کی حیثیت سے جیسے آج رائج ہیں آئندہ بھی رہیں گے۔ ان جملہ مضامین کے نصاب اور طریقِ تعلیم میں جن اصولیات کو مدنظر رکھنا ہے وہ یہ ہیں:-

الف:- یہ دکھانا ہے کہ کائنات ایک صاحبِ شعور اور صاحبِ ارادہ ہستی کی مخلوق ہے۔ ڈیزائننگ، پلاننگ، کلرنگ اور بیکنگ کے جو حیرت انگیز آرٹ اس میں کام کر رہے ہیں۔ وہ ایک آرٹسٹ کا کرشمہ ہیں۔

ب:- یہ دکھانا ہے کہ پوری کائنات بہ حیثیت مجموعی بھی اور جزءً جزءً بھی اپنے خالق

کے سامنے "مسلم" (مطیع فرمان) کی حیثیت رکھتی ہے حتیٰ کہ جسم انسانی بھی بلحاظ جسم اس کا مسلم ہے۔ لہذا انسان کے لئے اس کائنات میں اپنے خالق کے سامنے مسلم ہو کے رہنے کا رویہ بہترین رویہ ہے۔

ج:- یہ واضح کرنا ہے کہ کائنات کے ہر شعبے میں "سنت الہٰی" (خدا کا قانون) نافذ العمل ہے اور ہر چیز اس کی حکومت میں جکڑی ہوئی ہے پس یہاں انسان کے لئے بھی خدا کا قانون معلوم کر کے اس کی پیروی کرنا واحد ذریعہ ارتقا ہے۔

د:- اس حقیقت کو نمایاں کرنا ہے کہ نظام فطرت میں حکمت اور مقصدیت کارفرما ہے۔

ہ:- قرآن کے سارے استدلال کو ان مضامین کے مباحث میں سمو دینا جو اس نے اسلام کے عقلی اثبات کے لئے نظام فطرت کے مظاہر کی بنیاد پر کیا ہے۔

شہریت کے بعد اس مضمون کی اہمیت بھی اول درجہ کی ہو گی۔

(۳) تاریخ

تاریخ کا مضمون ہمیں موجودہ صورت سے زیادہ وسیع کرنا ہے اس کے شعبے حسب ذیل ہوں گے۔

ا:- تاریخ اسلام - از آدم تا نبی صلعم (مجمل)

ب:- تاریخ اسلام - (۱) دور نبوت (۲) دور خلافت راشدہ (۳) دور شاہی (۴) مسلمان ہندوستان میں۔

ج:- ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ (۱) ہندوستان مسلمانوں سے پہلے (۲) مسلمانوں کی آمد براہ بحیرۂ عرب (۳) مسلمانوں کی آمد براہ درۂ خیبر (۴) مسلمان انگریزی استبداد کے پنجے

ہیں (۵) آزادی کی جدوجہد (۶) ظہور پاکستان۔

د:- تاریخ عالم (مجمل) (۱) قرونِ مظلمہ (۲) قرونِ وسطیٰ (۳) قرونِ جدیدہ (۴) پاپائیت کا ردِعمل الحاد کی شکل میں (۵) جمہوریت کا ظہور اور ارتقا (۶) سرمایہ داری اور امپیریلزم (۷) اشتراکیت کا ظہور (۸) دنیا کا ہمہ گیر اختلال (۹) جمعیت اقوام متحدہ کی ناکامی (۱۰) دنیا میں اسلامی نظام کی ضرورت۔

تاریخ کی نصابی کتب میں حسب ذیل امور قابل لحاظ ہوں گے:۔

ا:- یہ واضح کرنا کہ تاریخ، اسلام وجاہلیت کی دو قوتوں کی کشمکش کی جولان گاہ ہے۔

ب:- یہ واضح کرنا کہ اقوام کے فنا و بقا کا راز ہر ملک اور ہر زمانہ میں اخلاقی ارتقاء و انحطاط میں مضمر ہے۔

ج:- یہ واضح کرنا کہ طبعی پہلو (وسائل تمدن) کے لحاظ سے ارتقاء مسلسل ہے، لیکن اخلاقی پہلو سے کبھی ارتقاء ہوتا ہے، کبھی انحطاط!

د:- یہ واضح کرنا کہ خدا کا قانونِ رحمت و عذاب کس طرح کام کرتا ہے؟

ر:- یہ واضح کرنا کہ جنگیں اور انقلاب اخلاقی وجوہ سے رونما ہوتے ہیں۔

س:- یہ واضح کرنا کہ اخلاق کی اچھی اقدار ہمیشہ سے اچھی ہیں اور بری اقدار ہمیشہ سے بری چلی آرہی ہیں۔

ص:- یہ واضح کرنا کہ تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین میں کیا فرق ہے۔

ان ساری وضاحتوں کی بنیاد قرآن وحدیث کے صحیح استدلال پر قائم ہونی چاہیے اور اقوام عالم کی تاریخ پر جس طرح قرآن نے بحث کی ہے اسی کو تاریخ بیانی کا معیار بنانا چاہئے۔

(۴) ریاضیات

ریاضیات (حساب، جیومیٹری، الجبرا) کو ہمیں عملی زندگی کی روزمرہ کی ضروریات کے پیش نظر مڈل کے نصاب میں لینا ہے۔ حتی الوسع ابتدائی تعلیم میں سے نظری ریاضی کو خارج کر دینا چاہئے تاکہ طالب علم پر نا روا بار نہ پڑے۔ لیکن ایک حد تک اس کا لحاظ رکھنا ہے کہ ریاضی کی تعلیم بچے کے دماغی اعصاب کو چست کرے۔ اور اسے راست فکری (STRAIGHT THINKING) کا ہنر سکھا دے۔ بہرحال خانگی حسابات، کاروباری حسابات اور دفتری حسابات ابتدائی حد تک طالب علم کے علم میں آجانے چاہئیں۔ ریاضی کے نصاب میں حسب ذیل تبدیلیاں ناگزیر طور پر کی جانی چاہئیں۔

(ا):۔ سود اور کاروبار کے ان پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے حصے خارج از نصاب کر دینے جائیں جن کو اسلام نے ہر مسلم کے لئے حرام ٹھہرایا ہے۔ لیکن جب تک ہمارے معاشرہ میں سے سود بالکلیہ ختم نہیں ہو جاتا اور اس سلسلے کے حسابات کی تعلیم دینا ضروری ہے تو سوالات کو اس طرح مرتب کرنا ہوگا کہ سود کی حرمت واضح ہو اور طلبا میں اس کے لئے ایک نفرت ابھر آئے۔

(ب):۔ سوالات کی عبارت میں اس کا خاص طور پر اہتمام ہو کہ طالب علم کو دینی حقائق و احساسات کے قریب لانا ہے۔ خصوصاً کاروباری مسائل سے تعلق رکھنے والے سوالات میں اسلام نے کاروبار کے جو اخلاقی احکام دیئے ہیں ان کا تعارف ہو جانا چاہئے۔

(ج):۔ زکوٰۃ، عشر اور تقسیم وراثت کو پوری ریاضی (دینی اصطلاحات کے ساتھ مرتب کر کے) مڈل کے اندر اندر سکھا دینا لازم ہے۔

(د):۔ ہر شعبۂ حسابات کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھ کر اس سے تعلق رکھنے والے احکام فقہ کو بیان کر دیا جائے۔ تاکہ طالب علم عملی زندگی میں ان احکام کے اتباع کے قابل ہو جائے۔

(۵) جغرافیہ

جغرافیہ طالب علم کو دنیائے انسانیت سے تعلق دلانے کے لئے پڑھایا جائے گا۔ اس کا ایک مدعا یہ ہے کہ سفر اور تجارت میں سہولتیں پیدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ دنیا کے سیاسی و معاشی احوال کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جغرافیہ میں جن دینی امور کا لحاظ رکھنا ہے وہ یہ ہیں:-

ا:- جغرافیہ طالب علم میں انسانیت گیر وسعت نظر پیدا کرے اور انہیں دریاؤں اور پہاڑوں کی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر وحدت نوع کا تصور دلائے کہ پوری انسانیت ایک کنبہ ہے اور ایک خالق کی مخلوق ہے۔

ب:- جغرافیہ یہ واضح کرے کہ طبعی اثرات کے تحت رنگ و نسل کے امتیازات و اختلافات اقوام عالم میں پیدا ہو گئے ہیں ان سے وحدت انسانیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور ہر جغرافیائی ماحول میں انسان کے خیر و شر کے محرکات اور اس کے اعمال کے نتائج اور اس کی ضروریات مادی و اخلاقی ایک ہی رہتی ہیں اور ہر حال میں اس کی فلاح ایک ہی قسم کے اصولوں میں مضمر ہے۔

ج:- جغرافیہ اقوام ماضیہ، اقوام مغرب اور ملت مسلمہ کی پوری تاریخ کے واقعات کا مظاہرہ کرنے والے جغرافی پردۂ نمائش (Screen) کو طلباء کے سامنے لائے اور تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے ان کا جغرافی ماحول پیش کرے۔

د:- جغرافیہ دنیا کے ہر گوشے سے مختلف ذرائع سفر کے لحاظ سفر حج کی تفصیلات طلبا کے سامنے لائے۔

س:- جغرافیہ موجودہ دنیا کے مسلم ممالک کی جغرافی پوزیشن پاکستانی طلباء پر واضح کرنے کے بعد ان میں وحدت عالم اسلامی کے امکانات کا احساس پیدا کرے۔

(۶) زبان دانی و ادب

زبان دانی کے کورس میں سے ہر وہ چیز ہمیں خارج کر دینی ہے جو اسلامی معتقدات اور

ـس میں ان دینی حقائق کو جذب کر دینا ہے جو بنیادی
ے مضامین میں جگہ نہیں پیدا کی جا سکتی ۔

کہ اردو ادب میں اسلامی اقدار اور غیر اسلامی اقدار
ب علم پر واضح کر دیا جائے ۔ اس مقصد کے لئے تاریخ
چاہئے ۔ اور شعراء اور ادیبوں کی بھی تین صنفیں ہر دور
م کش رجحانات کے علمبردار تھے دوسرے وہ جو
تھے، تیسرے وہ جو بین بین تھے ۔ طالب علم کو یہ
ئے کہ ادب کے جملہ اسالیب فکری جنگ کے اسلحہ
ہ نی قابل قدر شے نہیں ہے بلکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے
یں ادیبوں نے جنگ لڑی ۔ اسی سلسلہ میں طالب
حیثیت مسلم کے وہ تمام ذمہ داریاں واضح ہو جانی
عائد ہوتی ہیں ۔

غیر کتابی مضمون کی حیثیت سے شامل تعلیم ہوگا، اور
سری عبادات اور آداب و شعائر اسلامی کی تربیت
ی جائے ۔ اس علمی مضمون میں طالب علم کے پاس
بست ہونا لازمی ہوگا ۔

محض زبانی بول چال کی مدد سے، عربی زبان دانی کی

تعلیم دینے کا آغاز کر دیا جائے اور اس کی کتابی تعلیم چوتھے سال سے باقاعدہ شروع ہو جائے۔ یہاں تک کہ پانچویں اور چھٹے سال میں وہ ابتدائی بول چال اور نوشت و خواند، ترجمے اور گریمر کی استعداد بہم پہنچا لے۔ عربی کی تعلیم اس وجہ سے لازمی قرار دی جائے کہ دین کے سرچشمے سے استفادہ کرنے کے لئے یہ ہر مسلمان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ مڈل سے فارغ ہونے کے بعد طالب علم میں یہ استعداد ہو کہ وہ عربی کتب، رسائل اور اخبارات سے لغت کی مدد کے ساتھ معمولی استفادہ کر سکے۔

(۹) قرآن

عربی کی تعلیم کو لازمی مضمون کی حیثیت سے لینے کا مدعا یہ ہے کہ قرآن ناظرہ کی تعلیم سے قرآن فہمی کے ذوق میں جو جمود واقع ہو جاتا ہے اس سے طالب علم کو بچایا جائے۔ وہ اول روز سے ہی قرآن کو سمجھ کر پڑھے اور عمل کرنے کے لئے پڑھے۔ چوتھے، پانچویں اور چھٹے درجہ کی عربی نصاب میں قرآن کی نمازوں میں پڑھی جانے والی سورتیں اور معروف آیات سمیٹ لی جانی چاہئیں۔ ساتویں اور آٹھویں درجے میں پورا قرآن شرح ترجمہ کے ساتھ پڑھا دیا جائے۔ خصوصیت سے سورۂ بقر، انفال، توبہ، بنی اسرائیل اور سورۂ حجرات نسبتاً زیادہ تفصیل سے ذہن نشین کرائی جائے۔ کیونکہ ان سورتوں میں دین کے اہم ترین بنیادی امور مختلف پہلوؤں سے واضح کئے گئے ہیں۔ قرآن کی تعلیم میں امور ذیل ملحوظ رہیں:

ا:۔ طالب علم کو محسوس ہو کہ وہ خود مخاطب ہے اور وہ اندازہ کر سکے کہ قرآن اس سے کیا چاہتا ہے۔

ب:۔ اس میں ایمان پیدا ہو کہ فلاح صرف اتباع قرآن میں ہے اور ترک قرآن میں تباہی ہے۔

۔ قرآن کس نقشے کے انسان بنانا چاہتا ہے۔
ن کی جو قدر و قیمت تیرہ سو سال پہلے تھی وہی آج بھی ہے۔
ے معیار فکر و عمل تسلیم کرے۔
ز ادبیت کے ساتھ ساتھ اس کے حسن نظم کا اندازہ ہو جانا چاہئے۔
ے نبوی)

ے پہلے صرف عربی کورس میں سادہ اخلاقی احادیث کو لیا جائے
یا ایک مجموعہ مطالعہ کرایا جائے جن سے اسلامی عقائد، عبادات
معلومات اور احکام اخذ ہوتے ہوں۔ اس مجموعہ میں صرف
ت علماء متقدمین کے سارے معیاروں کے لحاظ سے یقین
نبوی کو قرآن اور احادیث کی روشنی میں اس طرح مرتب
ل اللہ کا مقام تاریخ انسانیت اور تاریخ اسلام میں سمجھ
رت کی تعمیر کے سانچے کے طور پر قبول کر لے۔ سیرت نبوی
لم کو اس کا یہ مقصد ذہن نشین کرا دینا چاہئے کہ یہ وہ
فلاح اور نجات کا راستہ ہمیں حاصل ہوتا ہے اور اس
پہ تعمیر ہی نہیں کر سکتے۔

ے ان احکام کی زبانی تعلیم دی جانی چاہئے جن سے بالعموم
ے ایسی کتب نصاب اختیار کی جائیں جن میں عبادات
ے ہیں فقہی احکام مرتب کر کے بیان کئے گئے ہوں نیز

فقہ کی وہ عام اصطلاحات واضح کی گئی ہوں جن سے ایک عامی مسلمان کو سابقہ پڑ سکتا ہے۔

(۱۴) استعمال قویٰ (عملی)

یہ کوئی مستقل مضمون نہیں، بلکہ ہر مضمون کے اندر بھی اس کا مقام ہے اور نصابی مضامین کی حدود سے باہر بھی اس کے لئے پہنائی موجود ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ ذہن اور جسم کے اعضا کو استعمال کرنے میں ہر طالب علم کو اتنی مہارت مختلف پہلوؤں سے ہونی چاہیئے کہ وہ زندگی کے میدان میں داخل ہو کر ابتدائی ضروریات حاصل کر سکے۔

تعلیم دینیات کا یہ سرسری خاکہ جو عرض کیا گیا ہے یہ وحدانی UNI TATY کلیت پسند TOTALITARIAN اور عملی نظریہ تعلیم کے تحت مرتب کیا گیا ہے اور اس نظریہ سے ہٹ کر اگر کوئی خاکہ تعلیم دینیات کے لئے اختیار کیا جائے تو اس سے ہمیں وہ مطلوبہ نتائج کبھی حاصل نہیں ہو سکتے جو اسلامی نظام کو چلانے کے لئے ہمارے پیش نظر ہیں۔

یہاں بحث صرف ابتدائی تعلیم (حصہ مڈل تک) کے متعلق کی گئی ہے اور بالائی منازل کی تعلیم علیحدہ بحث کی محتاج ہے۔

محمد رفیق کاتب لاہور

تخریب و تعمیر

نعیم صدیقی